جنوری 2026
خواتین ڈائجسٹ
سالِ نو نمبر
digest library.com
KHAWATEEN DIGEST Regd. No. MC-51 JANUARY 2026
150/-

خواتین ڈائجسٹ

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

واٹس ایپ 03172266944

کہی ان کہی، سائلہ 6
کرن کرن روشنی، ادارہ 7
ہمارے نام، نادرہ خاتون 28

آپ سے کیا پردہ

انشاء سے انشا کی باتیں، مختار زمن 12

خاتون کی ڈائری

میری ڈائری سے، امت الصبور 200

انٹرویو

حمیرا شفیع سے ملاقات، شاہین رشید 20

مجھ سے ملیے

باتیں سحر خان سے، شاہین رشید 16

بانی ——— محمود ریاض
مدیرہ ——— نادرہ خاتون
نائب مدیرہ ——— رضیہ جمیل
مدیر خصوصی ——— امت الصبور
بلقیس بھٹی
نفسیات ——— ادارہ
قانونی مشیر ——— نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس ہائیکورٹ

ناول

ابتہال، حنیٰ حسین 34
کر چلے جاں نثار ہم، سنبل جنید 142

مکمل ناول

ہمت دشوار پسند، آسیہ رئیس خان 74

ناولٹ

پکلم، منشا محسن علی 116
سرخ گلاب اور سال نو، حمیرا شفیع 172

افسانے

باسی سالن، حمارہ صفدر 67

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے
حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی ...

digestlibrary.com

جنوری 2026
جلد 53 شمارہ 09
قیمت 150 روپے

تجدید محبت ، ساجد رمضان 70
تالا عائشہ شبیر 187
راحت ہی راحت ، عروج عالم 193
محبت کا سبق ، [illegible] 134

نظمیں غزلیں

غزل ، امجد اسلام امجد 196
غزل ، زاہد مخری 196

پکوان

موسم کے پکوان ، واصفہ سہیل 207

رنگا رنگ پھول

رنگا رنگ سلسلہ ، شگفتہ جاہ 197

میری بیاض سے

آپ کی بیاض سے ، روحیدہ خان 199

[illegible]

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں ، ادارہ 208

بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے ، امت الصبور 210

خط و کتابت کا پتہ
خواتین ڈائجسٹ
37- اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

ایڈیٹر پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام : بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617 Fax: 92-21-32766872 0317 2266944
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

digestlibrary.com

کہی ان کہی

خواتین ڈائجسٹ جنوری 2026ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے ماہ و سال کی گردشوں میں ایک اور سال کا سفر اختتام کو پہنچا۔ نئے امکانات، خوشیوں اور خواہشات کے ساتھ 2026ء کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔

قارئین کو نیا سال مبارک

دعا ہے کہ یہ سال آپ کے لیے، ہم سب کے لیے خوشیوں، محبتوں اور امن و امان کی نوید لے کر آئے۔ ہمارے پیارے ملک میں استحکام اور خوش حالی ہو، یہ ترقی کی راہوں پر گامزن ہو۔ آمین

پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو سال گزشتہ بھی دھرتی کے لیے امن کی نوید نہ لا سکا۔ ارض فلسطین لہولہان رہی۔ غزہ میں بم برستے رہے۔ عورتوں اور معصوم بچوں کا قتل عام ہوتا رہا لیکن کہیں سے اس ظلم کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھی۔ دنیا کی اس خاموشی اور بے حسی نے ثابت کر دیا کہ تمام تر ترقی کے باوجود دنیا پہ آج بھی طاقت کی حکمرانی ہے۔ کمزوروں کو جرم ضعیفی کی سزا بھگتنا ہی پڑتی ہے۔

پاکستان کے لیے یہ سال کئی حوالوں سے یادگار رہا۔ 10 مئی کو ہونے والی جنگ جیت کر ہماری بہادر افواج نے وہ کارنامہ انجام دیا جس نے دنیا بھر میں پاکستان کا سر بلند کر دیا۔ بھارت کا غرور چکنا چور ہو گیا۔ معاشی حوالے سے بھی اگرچہ مہنگائی زیادہ کم نہ ہوئی لیکن قیمتوں میں استحکام ضرور رہا۔ مزید بہتری کی توقع ہے۔

انشاجی

ہمارے انشاجی، ہم سب کے پیارے انشاجی کو دنیا سے رخصت ہوئے نصف صدی سے زائد عرصہ بیت گیا۔ چاند کے شیدائی انشاجی دھرتی سے ناتا توڑ بیٹھے لیکن دلوں سے ان کا ناتا آج بھی قائم ہے۔ ان کے سفرنامے، ان کے منفرد کالم، ان کی دل گداز شاعری آج بھی دلوں میں بستی ہے۔ انشاجی نے ایک عظیم خزانہ اردو ادب کو عطا کیا۔ انشاجی جیسا کون لکھ سکتا ہے۔ ان کے جیسا کون ہو سکتا ہے۔ ان کی شاعری پڑھیں تو ایک الگ انشاجی نظر آتے ہیں۔ جوگ بجوگ کی کہانیاں کہتے جوگی انشاجی۔ مزاح نگاری دیکھیں تو ان کا یکسر مختلف انداز ہے ہنستے، مسکراتے، چٹکیاں لیتے انشاجی۔

11 جنوری کو انشاجی کی برسی ہے۔ دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

حسنیٰ حسین کا ناول ابتہال

قارئین کے لیے حسنیٰ حسین کا نام نیا نہیں ہے۔ قارئین ان کا ناول عمر بیسر اشاعت میں پڑھ چکی ہیں۔ یہ ناول بے حد پسند کیا گیا۔ قارئین کی فرمائش پر اس ماہ سے خواتین ڈائجسٹ میں ان کا ناول "ابتہال" شروع کیا جا رہا ہے۔

حسنیٰ کی تحریروں میں سادگی بھی ہے گہرائی بھی۔ وہ انسانی نفسیات کو مدنظر رکھ کر کرداروں کو تشکیل دیتی ہیں۔ ان کی سب سے خاص بات اثر انگیزی ہے۔ ان کی تحریریں بہت پُراثر ہوتی ہیں۔ اخلاقی اقدار کی پاس داری، دردمندی اور سادگی ان کی تحریر کی نمایاں خصوصیت ہے۔

حسنیٰ کے ناول کی پہلی قسط پڑھیے اور ہمیں بتائیے کہ آپ کو یہ ناول کیسا لگ رہا ہے۔ آپ کی رائے کے منتظر ہیں

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

تین گرہیں

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''شیطان تم میں سے ہر ایک کی گدی پر، جب وہ سوتا ہے، تین گرہیں لگا دیتا ہے۔ ہر گرہ پر وہ منتر پڑھتا (افسوں پھونکتا) ہے: تیرے لیے رات بہت لمبی ہے، پس خوب سو۔ اگر وہ بیدار ہو کر اللہ کا ذکر کرتا ہے تو ایک گرہ کھل جاتی ہے۔ پھر اگر وہ وضو بھی کرے تو ایک گرہ اور کھل جاتی ہے۔ پھر اگر اس نے نماز بھی پڑھی تو تمام گرہیں کھل جاتی ہیں اور وہ صبح اس حال میں کرتا ہے کہ وہ ہشاش بشاش اور پاکیزہ نفس ہوتا ہے ورنہ اس کی صبح اس حال میں ہوتی ہے کہ وہ خبیث النفس اور سست ہوتا ہے۔'' (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ یہ گرہ لگانا بھی حقیقتاً ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے جادوگر اپنا عمل سحر کرتا ہے۔ شیطان اپنے اس عمل سے رات کو اللہ کی عبادت کے لیے اٹھنے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔

2۔ بہرحال شیطان انسان کو اللہ کی عبادت سے روکنے کے لیے اپنا جتن کرتا ہے، جو شخص رات کو اٹھ کر اللہ کی عبادت کرتا ہے تو وہ شیطان کی چال کو ناکام دیتا ہے، بصورت دیگر شیطان انسان کو اپنے دام میں پھنسا لیتا ہے۔

سلامتی کے ساتھ

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''اے لوگو! اسلام کو پھیلاؤ، کھانا کھلاؤ اور رات کو نماز پڑھو جب کہ لوگ سوئے ہوئے ہوں (اس طرح) تم جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔'' (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

digest.library.com

فوائد ومسائل:

1۔ اس میں ان لوگوں کے لیے بشارت ہے جو ذوق وشوق سے مذکورہ کام کرتے ہیں۔

2۔ جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہونے کا مطلب ہے کہ جہنم کی سزا بھگتے بغیر ہی ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے جنت میں داخل فرما دے گا۔ واللہ اعلم۔

فضیلت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے فرمایا۔

"رمضان کے بعد سب سے زیادہ فضیلت والے روزے، اللہ کے مہینے محرم کے روزے ہیں۔ اور فرض نماز کے بعد سب سے زیادہ فضیلت والی نماز، رات کی نماز ہے۔" (مسلم)

فوائد ومسائل:

1۔ محرم کے مہینے کی اضافت اللہ کی طرف کی گئی ہے جس سے اس ماہ محرم کا شرف وامتیاز واضح ہے۔ اس میں نفلی روزوں میں سب سے افضل روزوں اور نفلی نمازوں میں سب سے افضل نماز کا بیان ہے۔

رات کی نماز

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"رات کی نماز دو دو رکعت ہے، چنانچہ جب تجھے صبح صادق کا اندیشہ ہو تو ایک رکعت کے ساتھ وتر (طاق) بنا لے (ایک رکعت وتر پڑھ لے۔)" (بخاری ومسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کو دو دو رکعت ادا فرماتے اور ایک رکعت وتر پڑھتے۔ (بخاری ومسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی مہینے میں تو اس طرح روزہ رکھنا چھوڑ دیتے کہ ہم گمان کرتے کہ اس مہینے میں آپ روزہ رکھیں گے ہی نہیں، اور کبھی ایسے روزہ رکھتے کہ ہم گمان کرتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس مہینے میں کوئی روزہ چھوڑیں گے ہی نہیں۔ اور (اسی طرح آپ کا حال یہ تھا کہ) اگر تم چاہتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کے وقت نماز پڑھتے ہوئے دیکھیں تو تم (پڑھتے ہوئے) دیکھ لیتے۔ اور اگر تم چاہتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سویا ہوا دیکھیں تو (سویا ہوا) دیکھ لیتے۔" (بخاری)

فائدہ:

1۔ مطلب یہ ہے کہ نفلی روزے ہوں یا رات کی نفلی نماز (قیام الیل) ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایک مستقل معمول نہیں تھا۔ کسی مہینے ایسا ہوتا کہ آپ روزہ نہ رکھتے حتیٰ کہ مہینہ ختم ہونے کے قریب ہو جاتا، تو آخر میں آپ روزے رکھنا شروع کر دیتے۔ اور کبھی مسلسل روزہ رکھتے، حتیٰ کہ گمان ہوتا کہ پورا مہینہ ہی آپ روزے رکھیں گے مگر آپ روزہ ترک فرما دیتے۔

2۔ اسی طرح تہجد کی نماز میں آپ کا معمول تھا، کبھی آپ اسے رات کے پہلے حصے میں، کبھی دوسرے حصے میں اور کبھی آخری، تیسرے حصے میں پڑھتے۔ اس طرح آپ کو رات کے ہر حصے میں نماز پڑھتے ہوئے بھی اور سوتے ہوئے بھی پایا گیا۔

گیارہ رکعات

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گیارہ رکعت پڑھا کرتے تھے۔ اس سے حضرت عائشہ کی مراد رات کی نماز ہے۔ اپنا سر اٹھانے سے پہلے اتنا (لمبا) سجدہ کرتے کہ جتنی دیر میں تم میں سے ایک آدمی پچاس آیتیں پڑھ لے۔ اور فجر کی نماز سے پہلے دو رکعت پڑھتے

پھر اپنی دائیں کروٹ لیٹ جاتے، یہاں تک کہ آپ کے پاس نماز کی منادی کرنے والا آتا۔ (بخاری)

فائدہ:

1۔ اس میں فجر کی دو سنتیں پڑھنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں کروٹ پر لیٹنے کے علاوہ نماز تہجد میں لمبے سجدے کرنے کا بیان ہے کیونکہ اس حالت میں انسان اللہ کے بہت قریب ہوتا ہے۔ نیز اس حالت میں غایت خشوع کا بھی اظہار ہے جو اللہ کو بہت پسند ہے۔ علاوہ ازیں سجدے میں دعا کی قبولیت کا امکان بھی زیادہ ہے۔

تہجد

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں (تہجد) گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔ (پہلے) چار رکعت پڑھتے، پس نہ پوچھو کہ وہ کتنی حسین اور کتنی لمبی ہوتی تھیں۔ پھر چار رکعت پڑھتے۔ پس ان کے حسن اور لمبائی کے بارے میں مت پوچھو۔ پھر تین رکعت (وتر) پڑھتے۔

میں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! کیا وتر پڑھنے سے پہلے آپ سوتے ہیں؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے عائشہ! تحقیق میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن میرا دل نہیں سوتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ دل نہیں سوتا کا مطلب ہے کہ دل بیدار رہتا تھا، اس لیے آپ کا وضو بھی نہیں ٹوٹتا تھا۔ اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے ہے۔

2۔ اس حدیث میں نماز کو اس کے آداب و شرائط کے مطابق خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرنے کی تاکید ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ بھی ہے۔ سنت کے مطابق اطمینان و سکون کے ساتھ نماز پڑھنا ہی نماز کا حسن ہے۔

3۔ جس شخص کو اپنی بابت آخر شب میں اٹھنے کا یقین ہو تو اسے چاہیے کہ نماز وتر عشاء کے ساتھ نہ پڑھے بلکہ تہجد کے آخر میں پڑھے۔ بصورت دیگر عشاء کی نماز کے ساتھ ہی پڑھ لے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کے پہلے حصے میں سو جاتے تھے اور رات کے آخری حصے میں اٹھتے اور نماز پڑھتے۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ: اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثریتی معمول کا بیان ہے اور یہی آخر شب تہجد کا سب سے بہتر وقت ہے۔ تاہم آپ نے رات کے ابتدائی اور درمیانی حصے میں بھی قیام کیا ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں۔ ”میں نے ایک رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم برابر کھڑے رہے یہاں تک کہ میں نے ایک برے کام کا ارادہ کیا۔“

ان سے پوچھا گیا:

”آپ نے کس چیز کا ارادہ کیا تھا؟“

انہوں نے جواب دیا: ”میں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ میں بیٹھ جاؤں اور آپ کو چھوڑ دوں۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ رات کا قیام خوب لمبا ہو، یعنی قرآت، رکوع، قومہ، سجدہ ہر رکن طویل اور نہایت اطمینان و سکون کا ساتھ ہو۔

2۔ نفلی نماز با جماعت جائز ہے۔

3۔ زیادہ طوالت کی صورت میں بعض علماء کے نزدیک مقتدی کا امام کی اقتدا سے الگ ہونا جائز ہے۔ لیکن حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے برے کام سے تعبیر کیا ہے، اس لیے اس کا جواز محل نظر ہے، تاہم احادیث میں آئمہ حضرت مقتدیوں کا خیال رکھنے کی تاکید کی گئی ہے جن سے اس کا جواز نکل سکتا

digest library.com

ہے۔ واللہ اعلم۔

طویل قیام

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

"میں نے ایک رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ بقرہ پڑھنی شروع کردی۔ میں نے (دل میں) کہا: سو آیتوں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع فرمائیں گے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت جاری رکھی۔ میں نے خیال کیا کہ آپ یہ سورت پوری رکعت،، یعنی نماز کی دو رکعتوں میں ختم فرمائیں گے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت جاری رکھی۔ پھر میں نے خیال کیا کہ آپ اس کے ساتھ (سورۃ ختم کرکے) رکوع کریں گے۔ لیکن آپ نے سورۃ نساء پڑھنی شروع کردی اور وہ ساری پڑھ لی۔

پھر آپ نے سورۃ آل عمران کی تلاوت شروع فرمادی اور وہ بھی ساری پڑھ گئے۔ آپ ٹھہر ٹھہر کر تلاوت فرماتے۔ جب آپ ایسی آیت کے پاس سے گزرتے جس میں تسبیح کا ذکر ہوتا تو آپ (اللہ کی) تسبیح کرتے۔ اور جب کسی سوال والی آیت کے پاس سے گزرتے تو اللہ سے سوال کرتے۔ اور جب کسی پناہ مانگنے والی آیت سے گزرتے تو پناہ طلب کرتے۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع کیا اور پڑھتے رہے۔ سبحان ربی العظیم۔ آپ کا رکوع بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کے برابر تھا۔ پھر آپ نے (رکوع سے سر اٹھایا اور) فرمایا: سمع اللہ لمن حمدہ ربنا لک الحمد۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیر تک کھڑے رہے، تقریباً اتنا جتنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع فرمایا تھا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور (اس میں) فرمایا: سبحان ربی الاعلیٰ۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سجدہ بھی آپ کے قیام کے برابر تھا۔ (مسلم)

فوائد ومسائل:

1۔ اس سے لمبے قیام کی خوبی، نفل نماز میں جماعت کا تلاوت میں سورتوں کی تقدیم وتاخیر کا جواز ثابت ہوتا ہے جس کے بعض لوگ قائل نہیں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا:

"کون سی نماز افضل ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لمبے قیام والی نماز۔" (مسلم)

فائدہ:

1۔ معلوم ہوا کہ نماز کے تمام ارکان (رکوع، سجدہ وغیرہ) لمبا ہوگا قرآن اتنا ہی زیادہ پڑھا جائے گا اور قرآن چونکہ افضل ذکر ہے، اس لیے طویل قیام بھی افضل ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ کو سب سے زیادہ محبوب نماز حضرت داؤد علیہ السلام کی نماز ہے۔ اور اللہ کو سب سے زیادہ محبوب روزہ حضرت داؤد کا روزہ ہے۔ وہ آدھی رات سوتے تھے، اس کے تیسرے حصے میں عبادت کے لیے اٹھ جاتے اور اس کے چھٹے حصے میں (پھر) سو جاتے۔ اور ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن چھوڑ دیتے (روزہ نہ رکھتے۔)" (بخاری ومسلم)

فوائد ومسائل:

1۔ اس میں چونکہ اپنے آپ پر سختی کرنے سے روکا گیا ہے۔ حتیٰ کہ عبادت میں بھی افراط وتعمق سے منع کیا گیا ہے اس لیے ساری رات جاگ کر عبادت کرنا یا ہمیشہ روزہ رکھنا بھی اسلام میں ممنوع اور ناپسندیدہ ہے۔

2۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ بھی اعتدال کا بہترین نمونہ ہے۔ بنا بریں اس حدیث میں حضرت داؤد علیہ السلام کے روزے اور نماز کو عنداللہ

سب سے زیادہ محبوب قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس میں بھی وہ میانہ روی ہے جس کے اپنانے کی اسلام نے تاکید کی ہے۔

3۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

''رات میں ایک گھڑی (لمحہ) ہے۔ جس مسلمان آدمی کو وہ میسر آجائے۔ وہ اس میں دنیا اور آخرت کے معاملے میں کسی بھلائی کا سوال کرے تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور عطا فرما دیتا ہے۔ اور یہ گھڑی ہر رات کو ہوتی ہے۔'' (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ یہ گھڑی بھی جمعے کی گھڑی کی طرح اگرچہ غیر متعین ہے۔ تاہم یہ بھی بالعموم رات کی آخری گھڑیوں میں ہوتی ہے کیونکہ عبادت کا افضل وقت وہی ہے۔ اس کے ابہام میں بھی لیلۃ القدر کی طرح حکمت یہی ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ وقت اللہ کی عبادت، اس کے ذکر اور اس سے دعا مناجات میں گزارے۔

قضا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درد یا کسی اور وجہ سے رات کی نماز چھوٹ جاتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دن کو بارہ رکعتیں ادا فرماتے۔ (مسلم)

فوائد و مسائل: اس سے مراد نفل نماز ہے نہ کہ فرض۔ اس سے معلوم ہوا کہ سنتوں کی قضا درست ہے بشرطیکہ انسان اپنا معمول نہ بنائے۔

قضا

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص اپنے مقررہ وظیفے یا اسی قسم کی کسی چیز سے سویا رہ جائے، پس وہ اسے فجر اور ظہر کی نماز کے درمیان پڑھ لے تو اس کے لیے لکھا جاتا ہے گویا کہ اس نے وہ رات ہی کو پڑھا ہے۔'' (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ یہاں اس سے وہ وظیفہ مراد ہے جو انسان اپنے طور پر مقرر کر لیتا ہے، مثلاً: میں رات کو تہجد کی آٹھ رکعت پڑھا کروں گا، ہر روز ایک پارہ قرآن مجید کا پڑھوں گا یا اتنی اتنی بار اللہ کا فلاں ذکر کروں گا۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

2۔ پھر وہ اپنے عزم کے مطابق امکانی حد تک عمل کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن اگر کسی وقت اس پر نیند کا غلبہ ہو جائے اور وہ اپنا وظیفہ پورا نہ کر سکے تو بعد میں وظیفہ پورا کر لے۔ اللہ کے ہاں اسے اس طرح لکھا جائے گا کہ گویا اس نے اپنے وقت ہی پر اسے پورا کیا۔

3۔ اس سے نفلی اعمال خیر کی قضا کا استحباب معلوم ہوتا ہے۔

عبادت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو رات کو اٹھ کر اللہ کی عبادت کرے اور نماز پڑھے اور اپنی بیوی کو بھی بیدار کرے۔ اگر وہ انکار کرے تو اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اللہ تعالیٰ اس عورت پر رحم فرمائے جو رات کو اٹھ کر عبادت کرے اور نماز پڑھے اور اپنے خاوند کو بھی جگائے۔ اگر وہ انکار کرے تو اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔'' (اسے ابوداؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

فائدہ: اس میں نیک میاں بیوی کا کردار بیان کیا گیا ہے۔ وہ نیکی اور اطاعت کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

☆☆

انشا سے انشا کی باتیں

نجما رحمن

digest-library.com

وہی کھنچا ہوا قد، کشمشی بالوں میں لہریے، گدی پر سے تقریباً منڈے ہوئے۔ تھا تو شاعر اور دانشور مگر بال ہمیشہ چھوٹے رکھتا تھا۔ دیکھیے، وہ سر ہلا رہا ہے۔ باتیں کرتے وقت سر کو ہلکے ہلکے جھٹکے دینا اس کی عادت ہے۔ موٹے تال کی عینک کے پیچھے سے اس کی آنکھیں مسکرا رہی ہیں۔ آیئے پوچھیں تو اس سے کہ آخر راہ فرار کیوں اختیار کی؟

"کیوں انشاء جی! ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ کج ادائی؟"

"ارے بھائی! بات یہ ہے کہ سفر تو اپنا مقدر تھا اور ہم تو پہلے ہی کہہ چکے ہیں۔

کارواں در کارواں، سپنوں کو بسرائے ہوئے
لوگ تو جانے لگے انشا! چلو تم بھی چلو

"نہیں انشاجی! ہم سے باتیں نہ بناؤ۔ تم باہر تو اکثر جایا کرتے تھے مگر ہر دفعہ ایک تو تصنیف کتاب کا مسودہ اور ایک شفقت بھری مسکراہٹ کا تحفہ لے کر واپس لوٹ آتے تھے۔ مگر خیر، تمہیں کیا دوش دیں۔ تم سے کیوں شکایت کریں کہ تم کہہ چکے ہو کہ یہ شہر، یہ قریے تمہارا وطن نہیں ہیں۔ تم سدا کے رومانی، عاشق تن، آوارہ مزاج تھے۔

"آہو وحشی جان کے تم کو ساتھ تمہارے پھرتے تھے۔"

اور تمہیں بھی کچھ ان ہی وحشیوں سے چاہت تھی۔ انہی کی سنگت پسند تھی۔

بستیاں، قریے گھوم چکے، اب دشت کو لوٹیں، بن کو چلیں
شام ہوئی آوارہ غزالو، آؤ کہ اپنے وطن کو چلیں

انشاجی تم تو خیر اپنے وطن کو لوٹ گئے یا باغ عدن کو لوٹ گئے۔ مگر دیکھ رہے ہو، تمہارے اس نا وقت سفر نے کیا قیامت ڈھائی؟

تم ایک دن چپکے سے چلے گئے۔ مگر جب تمہارا خاکی جسم تابوت میں رکھا ہوا کراچی آ کر اترا تو دیکھا تھا، کیا بجوگ پڑا۔ بیوی پچھاڑیں کھا رہی تھی، بچوں کو چین نہیں آتا تھا۔ بھائی بہنوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا رواں تھے۔ تمہارے یار دوست، تمہارے چاہنے والے، تمہارے مضامین پڑھنے والے، بلکہ شہر کا شہر ماتم کر رہا تھا۔

لندن سے تمہاری سناؤنی سنی تو عالی نے پہاڑ سی رات آنکھوں میں کاٹ دی۔

قدرت اللہ شہاب آٹھ، نو سو میل کا سفر کر کے کراچی آئے کہ تمہارا آخری دیدار کر لیں۔ ارے بندہ خدا! جانے کی ایسی کیا جلدی تھی۔

تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

میں کہتا ہوں انشاجی! آخر تمہیں ہم سے شکایت کیا تھی؟ ہم لوگ تو تمہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ جہاں جاتے ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ ہار پھول پہنائے جاتے تھے۔ لو صاحب پھر بھی آپ فرماتے ہیں۔

ان لوگوں کی بات کرو جو عشق میں خوش انجام ہوئے
نجد کے قیس، یہاں کے انشا خوار ہوئے، بدنام ہوئے
مگر ہم نے تو کبھی نہ سنا اس بدنامی کا قصہ۔ ہاں

اپنی بیماری کی طرح چھپاتے رہے ہو تو دوسری بات ہے۔ مگر کمال ہے، اپنے چلے جانے کی یہ شخص کیا کیا تاویلیں کرتا ہے۔

ہم جنگل کے جوگی ہم کو ایک جگہ آرام کہاں
آج یہاں کل اور نگر میں صبح کہاں اور شام کہاں

میری جان انشا! تم تو جوگی ہو گئے مگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے چاہنے والے بھی جوگ لے لیں۔ اب کے سفر کے بعد تم نے آس توڑ دی۔ چہرہ چھپا کر اپنے چہیتوں کی دنیا سونی کر دی۔ تمہارے لطیفوں کی پھلجھڑیاں کیا جوت جگایا کرتی تھیں۔ تم کیا گئے کہ اندھیرا چھا گیا۔ تم خوب جانتے ہو کہ جب جانے والا چلا جاتا ہے تو لوگوں کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اگر نہ جانتے تو یہ کیونکر کہتے۔

کس کا چہرہ چمکنا لائیں، کس سورج سے مانگیں دھوپ
گھور اندھیرا چھا جاتا ہے خلوت دل میں شام ہوئے

تم اپنی شاعری میں عشق کا دم بھرتے تھے۔ بڑے عاشق بنے پھرتے تھے۔ مگر یہ بھی دیکھا کہ تم خود کتنوں کے محبوب تھے؟ اور اب اپنے عاشقوں کا حال تک نہیں پوچھتے۔ خود را نصیحت، دیگراں را نصیحت۔ تم خود ہی کہتے تھے۔

اپنی زبان سے کچھ نہ کہیں گے، چپ ہی رہیں گے عاشق لوگ
تم سے تو اتنا ہو سکتا ہے پوچھو حال بچاروں کا
اچھا چلو چشم تصور میں ہی آتے رہو خواب ہی میں جلوہ دکھاتے رہو ہمیں منظور ہے۔

جنگل جنگل شوق سے گھومو، دشت کی سیر مدام کرو
انشاجی! ہمارے پاس بھی لیکن رات کی رات قیام کرو

انشاجی تمہاری وہی حالت ہے کہ ”من نہ کردم شاحزر بکنند۔“ ایک طرف آپ نصیحت فرماتے ہیں کہ......

میر مغفور کے اشعار نہ پیہم پڑھنا
جینے والوں کو ابھی اور بھی جینا ہو گا

اور خود یہ حالت بنا رکھی ہے کہ......

آوارہ آوارہ پھرنا چھوڑ۔ کے منڈلی یاروں کی دیکھ رہے ہیں دیکھنے والے انشا کا اب حال وہی بلکہ نوبت بہ اینجا رسید کہ......

کیا اچھا خوش باش جواں تھا، جانے کیوں بیمار ہوا
اٹھتے بیٹھتے میر کی بیتیں پڑھنا اس کا شعار ہوا

اور آخر وہی ہوا جو ہونا تھا اور تقدیر کا بدا تھا۔ وہ دن آ گیا جب آنکھیں ڈھونڈتی ہیں کہ انشا کہاں گیا۔

اے متوالو، ناتے والو، ورنہ اک دن یہ ہو گا
تم لوگوں سے آتے جاتے پوچھیں گے انشا کا پتا

انشا! تم اپنے گرو میر تقی میر سے ملے ہو گے۔ وہ خستہ تن تم سے مل کر ضرور خوش ہوا ہو گا۔ شعر میں وہ تمہارا استاد تھا۔ تمہارے اشعار میں بھی آہوں کا دھواں ہے۔ عشق کی آگ سلگتی بھڑکتی رہتی ہے۔ درد کی ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ تمہارے بول میٹھے ہیں۔ ان میں غضب کی گھلاوٹ ہے مگر تم خود مانتے ہو کہ میر میر تھا، تم محض پیرو ہو اور حال یہ ہے۔

اک بات کہیں گے انشاجی تمہیں ریختہ کہتے عمر ہوئی
تم ایک جہاں کا علم پڑھے، کوئی میر سا شعر کہا تم نے

مگر جان من تمہاری نثر؟ وہ تمہاری اپنی خاص چیز ہے۔ خدا کی پناہ۔ تمہاری نثر کی ایکیلی ناگن خوب ڈستی ہے۔ ہاں زہر نہیں چھوڑتی۔ تم نے وہ فقرے بازیاں کی ہیں کہ لوگ تمہیں پڑھ کر لوٹن کبوتر بن جاتے ہیں۔ اس فن کے تم استاد ہو۔ حباب کی اور اخبار کی زندگی ہی کیا۔ لیکن اخبار میں وہ چند مربع انچ جہاں تمہارا قلم موتی جڑا کرتا تھا زندہ جاوید ہو گئے۔ شعرا شعر میں تعلّی کیا کرتے ہیں، تم نے نثر میں بھی تعلّی کی مگر اس طرح گویا محض گدگدا رہے ہو۔ یاد ہے جرمنی کی وہ بڑی بی جس سے تم نے بلیڈ خریدے تھے؟ وہ انگریزی بھی۔ آپ فرماتے ہیں۔

”اس بے چاری کو جرمن نہیں آتی صرف انگریزی آتی ہے۔ ہماری طرح دونوں زبانوں پر قادر نہیں معلوم ہوتی!“

اور پھر وہ جرمن ٹیکسی والا جس کی شامت اعمال کہ اس نے آپ کو گڈ مارننگ کہا اور جناب نے کس پدرانہ شفقت سے فرمایا۔

”میاں خوب انگریزی بولتے ہو۔ ہمارے مقابلے کی نہ سہی پھر بھی اچھی خاصی ہے۔“

دنیائے ادب کے بت طناز! طنز میں بھی

تمہارا جواب نہیں۔ تم نے کاروبار کرنے والے غریب پاکستانیوں کو خوب کچوکے دیے ہیں جس کی کسک اب تک محسوس ہوتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ

”اہل فرنگ میں نیکی و نیک چلنی کا فقدان ہے کیونکہ شراب اکثر پیتے ہیں۔ گوشت بھی حلال یعنی ذبیحے کا نہیں کھاتے۔ پردے کا بھی چنداں خیال نہیں ہے۔ دکان داروں کے ماتھوں پر گٹے اور ہاتھوں میں تسبیح نہیں یعنی ان کی عاقبت کا معاملہ مشکوک ہے لیکن ملاوٹ کا کاروبار نہیں۔ دودھ، دہی اور مکھن، مسکا سب خالص ملتا ہے۔ چائے کی پتی میں بھی چنے کا چھلکا نہیں ہوتا، نہ ہلدی میں، اینٹیں ہوتی ہیں۔ چیکی دکانوں سے پلک جھپکتے غائب نہیں ہوتی نہ آٹا کہیں جاتا ہے۔ حتیٰ کہ لوگ مین ہولوں کے ڈھکنے تک نہیں چراتے۔ بیچارے یہ بھی نہیں سے ہو، ہر کارے ذہر مردے۔“

انشا! یہ سچ ہے کہ تمہارے شعر کی گھلاوٹ اور عنائیت کا پرتو ہے۔ لیکن تمہاری ”انشائیت“ تمہاری نثر میں ہے۔ یہ بڑی تحفہ چیز ہے۔ سیدھی سادی آسان زبان، چھوٹے چھوٹے فقرے، متوازن طرز ادا، کوئی پیچ نہیں، کوئی سنگلاخ مقام نہیں، بدہضمی پیدا کرنے والے ثقیل الفاظ نہیں کہ لغت ساتھ لے کر بیٹھو تو پڑھو۔ بھئی، میرا تو یہ حال ہے کہ جب تم یاد آتے ہو تو تمہاری تحریریں پڑھتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہو۔ محاورے کا نمک، اور کلاسیکی تلمیحات کے مسالے، اس پر معصوم سا طنز و مزاح لطف آ جاتا ہے۔ مولوی عبدالحق کی صحبت سے تم نے فائدہ اٹھایا۔ تم نے یہ راز پالیا کہ تحریر میں رچاؤ پیدا کرنے کے لیے کلاسیکی، ثقافتی اور تہذیبی پس منظر کتنا اہم ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ کٹے کنکوے کی طرح جدھر کی ہوا ہوئی ادھر کو بہک گئے۔

اگر تم غالب کے رسیا نہ ہوتے تو میاں شیر محمد خاں انشا یہ کیوں کر لکھتے مرے، شعر تجھ پر بھی رحمت خدا کی۔ اور اگر تم نے اسمٰعیل میرٹھی کی وہ نظم نہ پڑھی ہوتی کہ ......

اک لڑکی بگھارتی تھی دال
دال کرتی تھی عرض یوں احوال

تو یہ جملے کہاں سے لاتے ”دال مہنگی ہے اتنی کہ وہ لڑکیاں جو اسمٰعیل میرٹھی کے زمانے میں دال بگھارا کرتی تھیں۔ اب فقط شیخی بگھارتی ہیں۔“

بھئی بتول ہاورچیوں کے کیا مزے دار ”تڑکا“ لگایا ہے اور کھانے کا ذکر ہو تو تم نے یہ بھی خوب کہا کہ......

”گوشت نہ کھانے والا ہر شاعر معری نہیں ہوتا۔ بعض مہنگا ہونے کی وجہ سے نہیں کھاتے۔“

انشا! تم جیسے مرنجان مرنج آدمی تھے ویسے ہی طنز نگار بھی ہو۔ چٹکیاں لیتے ہو، پھر کر حملہ نہیں کرتے مگر فقرہ ایسا چست کرتے ہو کہ تیر کھانے والا تیر کھا کر بھی مسکراتا ہے۔ تمہارے متعلق مشتاق یوسفی نے کہ وہ خود بھی لیلائے مزاح کا اداشناس ہے، کلاسیکی بات کہہ ڈالی کہ ”بچھو کا کاٹا روتا ہے۔ سانپ کا کاٹا سوتا ہے اور انشا کا کاٹا سوتے میں مسکراتا بھی ہے۔“

انشا جی! تم نے تاریخ فہمی کی بھی نئی ادا اختیار کی۔ خوب لکھا ہے۔

”جہانگیر کو بڑا ہی زیرک اور سمجھ دار جاننا چاہیے کہ اس نے محض کبوتر اڑانے سے نور جہاں کی لیاقت کا اندازہ کر کے اس سے شادی کر لی۔ اس کے سلیقہ شعار، پابند صوم و صلوٰۃ یا...... کشیدہ کاری کا ماہر وغیرہ ہونے کی شرط نہ رکھی۔“

”شاہ جہاں بڑی دوررس نظر رکھتا تھا۔ تاج محل نہ ہوتا تو آج بھارت کی ٹورسٹ ٹریڈ کو اتنی ترقی نہ ہوتی۔“ پتا نہیں سو برس بعد کوئی تمہارے اس فقرے کا مزا لے سکے گا یا نہیں کہ......

”ہمایوں کا بیٹا اکبر سندھ کے سفر میں امرکوٹ میں پیدا ہوا تھا۔ اصلاح میں اسے نیا سندھی بھی کہہ سکتے ہیں۔“

اور پھر......

”اکبر اور کی لڑائی پانی پت میں شروع ہوئی تو ہمدردوں نے اس کے جدی وطن سے پیغام بھجوایا کہ تم

digest.library.com

اور ہیموں یہاں تاشقند آ کر صلح کرائے دیتے ہیں۔ لیکن اکبر نہ مانا۔ ہیموں ایک ہاتھی کے ہودے میں بیٹھا روپے آنے پائی کا حساب لکھ رہا تھا کہ اس لڑائی کا مال غنیمت فروخت کر کے کسی کاروبار میں پیسہ لگائے کہ ناگہاں ایک تیر قضا کا پیغام لے کر اس کی آنکھ میں لگا اور وہ بے سدھ ہو کر گر گیا ہیموں بقال کو ہم تاریخ کا پہلا سوشے وایان کہہ سکتے ہیں۔"

مجھے معلوم نہیں کہ انشا تمہیں کبھی پی جی ووڈ ہاؤس سے بھی دلچسپی رہی ہے یا نہیں مگر تمہارے بعض فقروں میں اس کا رنگ جھلکتا ہے مثلاً

"کبوتر کی دو قسمیں ہیں۔ نیلے کبوتر اور سفید کبوتر، نیلے کبوتر کی پہچان یہ ہے کہ وہ نیلے رنگ کا ہوتا ہے اور سفید کبوتر بالعموم سفید ہی ہوتا ہے۔"

اور پھر طنز کی یہ کاٹ......

"طوطے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ جنگلی طوطے جو جنگل میں رہتے ہیں۔ پالتو طوطے جو پنجروں میں رہتے ہیں۔ فالتو طوطے جنہیں جنگل میسر ہے نہ پنجرہ۔ آئے دن ان کی وطنیت کا سوال اٹھتا رہتا ہے۔"

ہائے ہائے انشا مخمل میں لپیٹ کر لگانا اسی کو کہتے ہیں۔

سوال۔ پاکستان میں کون رہتا ہے؟

جواب۔ پنجابی، سندھی وغیرہ

سوال۔ پنجابی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں، سندھی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں۔ بنگالی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں پھر یہ الگ ملک کیوں بنایا؟

جواب۔ غلطی ہوئی معاف کر دیجیے۔ آئندہ نہیں بنائیں گے۔"

انشا! انشا پردازی تمہارے لیے اتنی ہی سہل تھی جیسے آپس میں باتیں کرنا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک شام تمہیں کہیں مضمون پڑھنا تھا۔ میں تمہارے دفتر پہنچا کہ جلسے میں ساتھ ساتھ چلنے کا پروگرام تھا۔ تم دفتری کام کر رہے تھے۔ فون بھی آ رہے تھے۔ باتیں بھی جاری تھیں اور ساتھ ساتھ ایک پرچے پر مضمون بھی لکھ کر جلد جلد تیار کر رہے تھے جو گھنٹے بھر بعد پڑھنا تھا۔

اسی طرح تمہاری کالم نویسی تمہاری زود نویسی کی مرہون منت تھی۔ یہی شاید تمہاری تحریر کی بے ساختگی کی وجہ ہے۔ اس میں آمد ہے آورد نہیں۔

انشا! تم واقعی دوستوں کے دوست تھے۔ یاد ہے جب میری کتاب چھپ رہی تھی تو تم ضد کرتے تھے کہ اس میں کارٹون ضرور ہوں گے۔ اس پر جملہ بازیاں بھی ہوئی تھیں۔

میں کہتا تھا کہ آؤ ہم اپنی تصویریں لگا دیں! میں نے تم سے کہا تھا کہ "چھوڑو کس چکر میں پڑتے ہو۔"

تم نے جواب دیا کہ "بھئی مجھ پر چھوڑ دو۔" پھر تم نے کارٹون بنوائے ...... اور تقریب تعارف میں وہ جوش و خروش دکھلایا کہ میں بھول نہیں سکتا۔

تم ایسے شاعر و نثار تھے جس سے قاری کو الفت ہو جاتی ہے۔ یہی تمہاری سب سے بڑی جیت تھی۔ یوں مرنا تو برحق ہے، تم کہتے تھے۔

یاں تو آیا جو مسافر یونہی شب بھر ٹھہرا
یہ سرائے ہے یہاں کس کا ٹھکانہ ڈھونڈو

لیکن انشا جی! ایسا لگتا ہے کہ تم نے شب بھر بھی قیام نہ کیا۔ رات تو ابھی بھیگی بھی نہ تھی، چاند تو ابھرا بھی نہ تھا۔ چکور تو بولے بھی نہ تھے۔ ابھی تو یہ حالت تھی کہ۔

آغاز شباب شب ہے پیارے
جانے کا یہ وقت کب ہے پیارے

لیکن تم آئے۔ ادھر چٹکی لی۔ ادھر گدگدایا، کسی پر فقرہ کسا، کسی کا منہ چڑایا، جوگیوں کی طرح ایک نعرہ مستانہ لگایا۔ اپنی شہرت کا خرقہ کاندھے پر ڈالا۔ عقیدت و محبت کے سکوں سے بھرا ہوا کشکول سنبھالا اور لوگوں کو روتا چھوڑ اپنا دامن جھٹک کر چلتے بنے۔ واہ انشا جی! خوب رسم وفا نبھائی۔

خوب ہمارا ساتھ نبھایا بیچ بھنور کے چھوڑا ہات
ہم کو ڈبو کر خود ساحل پر جا نکلے ہو اچھی بات

☆☆

باتیں سحر خان سے

شاہین رشید

1 ''اصلی نام؟''
''سحر خان۔''

2 ''پیار کا نام؟''
''میرا نام ایسا ہے کہ بگڑ نہیں سکتا۔ اس لیے سحر ہی پیار کا نام ہے۔''

3 ''جنم دن...... جنم سال؟''
''جنم سال کو رہنے دیں۔ جنم تاریخ 29 مئی ہے۔''

4 ''قد/ستارہ؟''
''پانچ فٹ تین انچ/جیمنائی۔''

5 ''تعلیم؟''
''گریجویشن۔''

6 ''بہن بھائی؟''
''دو بھائی اور ہم تین بہنیں ہیں۔ میرا نمبر دوسرا ہے۔''

7 ''شادی؟''
''ابھی نہیں ...... جب نصیب میں ہو گا ہو جائے گی۔''

8 ''شوبز میں کس نے متعارف کرایا؟''
''کسی نے نہیں خود ہی آئی تھی۔ ایم ڈی پروڈکشن میں گئی تھی کہ مجھے آرٹسٹ بننا ہے۔ انہوں نے آڈیشن کے لیے کہا۔ میں نے آڈیشن دیا۔ گھر آ گئی۔ ایک ہفتے بعد کال آ گئی کہ مبارک ہو آپ منتخب ہو گئی ہیں۔''

9 ''پہلا ڈرامہ/وجہ شہرت؟''
''پہلا ڈرامہ ''سانوری'' تھا اور شہرت کا باعث بھی یہی ڈرامہ تھا۔''

10 ''جن کی شادی ان کی شادی رسپانس؟''
''ارے مت پوچھیں ...... بہت پسند کیا گیا سیریل اور ہم سب کی پرفارمنس ...... بہت مزہ آیا تھا اس کی ریکارڈنگ کے وقت۔''

11 ''کتنے سال ہو گئے فیلڈ میں؟''
''2018...... 2019 میں آئی تھی۔ گنتی آپ کر لیں۔''

12 ''کس کی آواز پر لازمی اٹھنا پڑتا ہے؟ امی، الارم یا مرغ کی اذان؟''
''ہنستے ہوئے۔ مرغ کی بانگ تو چھوڑ ہی دیں۔ الارم کو لفٹ نہیں کرائی۔ لہٰذا امی کی آواز پر ہی اٹھتی ہوں کیونکہ باقی دو تو کچھ نہیں کہیں گے لیکن امی......''

13 ''آپ کی خواہش ہے کہ؟''
''کہ پوری دنیا میں امن و سکون ہو جائے۔''

14 ''فخر ہوتا ہے؟''
''جب اپنی فیملی میں اپنے لیے ان کا اعتماد اور محبت دیکھتی ہوں تو۔''

15 ''ایک عادت جس پر کبھی کبھی خود بھی پریشان ہو جاتی ہیں؟''

''وقت کی پابندی۔''

16 ''آپ کی ایک عادت جو آپ کو خود بھی پسند ہے؟''

''سمجھوتا کر لیتی ہوں۔ بات میں لچک رکھتی ہوں اور دوسروں کی بات مان بھی لیتی ہوں۔''

17 ''ضدی ہیں؟''

''نہیں جی...... ضد تو طبیعت میں ہے ہی نہیں بہت اچھی بچی ہوں۔''

18 ''کھیلوں سے لگاؤ۔ پسندیدہ کھیل؟''

''مجھے گیمز سے بہت لگاؤ ہے۔ اتھلیٹ رہ چکی ہوں۔ اور کرکٹ میرا پسندیدہ کھیل ہے۔''

19 ''نعمتیں، آسانیاں قسمت سے ملتی ہیں یا جدوجہد سے؟''

''جدوجہد کے بغیر کچھ نہیں ملتا۔ محنت کرتے ہیں۔ امتحان دیتے ہیں اور پاس ہو جاتے ہیں۔ زندگی میں کچھ حاصل کرنے کے لیے بھی بہت جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔''

20 ''آپ کتنی ہی بڑی ہو جائیں اپنے آپ کو کس عمر کا سمجھیں گی؟''

''میں کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو جاؤں اپنے آپ کو ماں باپ کی گڑیا ہی سمجھوں گی۔''

21 ''کیمرہ کا خوف؟''

''اب بھی ہے۔ ہر نیا کام کرتے وقت کبھی کبھی کیمرہ بہت پریشان کرتا ہے۔''

22 ''کیمرے سے ملاقات کا پہلا ردعمل؟''

''تھوڑا...... بہت نروس تھی۔ مگر کچھ اچھے لوگوں کی حوصلہ افزائی کام آ گئی۔''

23 ''ہجوم میں کب اکیلی ہوتی ہیں؟''

''جب میں اپنی فیملی سے دور ہوتی ہوں۔''

24 ''دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے؟''

''جب سب کے ساتھ بیٹھ کر اپنے آپ کو اسکرین پہ دیکھتی ہوں۔''

25 ''مارننگ شو کی میزبانی ملے تو کس طرح کے شوز کریں گی؟''

''معاشرے کی بہتری کے لیے پروگرام کروں گی تاکہ لوگوں کی زندگی میں بہتری آئے۔''

26 ''بیمار ہو جائیں تو؟''

''ہاں، بہت گھبرا جاتی ہوں۔ ڈر جاتی ہوں۔ بس اللہ اپنا کرم کرے۔''

27 ''والدین کے لیے ایک جملہ؟''

''ان سے زیادہ پیار دنیا کا کوئی انسان نہیں دے سکتا۔ اللہ سب کے والدین کو سلامت رکھے۔''

28 ''سیاست میں پسندیدہ شخصیت؟''

''بے نظیر بھٹو صاحبہ۔''

29 ''کب جھوٹ بولتی ہوں؟''

''کوشش کرتی ہوں کہ جھوٹ نہ بولوں۔ عموماً اپنے آپ کو بچانے کے لیے جھوٹ بولتی ہوں۔ ورنہ خاموش ہی رہتی ہوں۔''

30 ''گھر آ کر پہلی خواہش؟''

''آرام کرنے کو دل چاہتا ہے، تھکاوٹ بہت ہو جاتی ہے۔''

31 ''تعریفی جملے جو آپ دوسروں کے لیے استعمال کرتی ہیں؟''

''گڈ ورک...... پرفیکٹ۔''

32 ''پسندیدہ ملک؟''

''یو ایس اے۔''

33 ''شوبز میں جگہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ؟''

''آپ گڈ لکنگ ہوں۔ آپ کو کام آتا ہو اور آپ محنت سے جی نہ چراتے ہوں۔''

34 ''کس طرح کے کردار کرنا مشکل لگتا ہے؟''

''رومانٹک...... فیملی کی وجہ سے ایسے رول کرنے ذرا مشکل لگتے ہیں۔ کیونکہ سب کے ساتھ اگر ڈرامہ دیکھوں تو اچھا نہیں لگتا اور ویسے بھی میں

digest library.com

نہیں چاہتی کہ مجھ پر کوئی بات آئے۔"

35 "کسی سے انتقام لینا ہو تو؟"

"خاموش ہو جائیں اور نظر انداز کریں۔ لاتعلق ہو جائیں۔"

36 "کھانا نامکمل لگتا ہے؟"

"اگر نوڈلز نہ ہوں تو۔"

37 "کھانا کس کے ہاتھ کا پکا پسند ہے؟"

"امی کے ہاتھ کا، خاص طور پر چاول۔"

38 "گھر سے باہر کھانے کی پسندیدہ جگہ؟"

"چائنا ٹاؤن کا چائنیز۔"

39 "آپ کی کامیابی میں کس کا ہاتھ ہے؟"

"میرے پاپا کا...... پاپا نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔ تب ہی تو کامیاب ہوں۔"

40 "پسندیدہ اینکر؟"

"پارس جہاں زیب، وسیم بادامی، جاوید چوہدری۔"

41 "پیسہ محفوظ رہتا ہے؟"

"جب تک اسے استعمال نہ کیا جائے۔ ہاہاہا۔"

42 "نصیحت سننا کیسا لگتا ہے؟"

"برا نہیں لگتا۔ جو قابل عمل باتیں ہوتی ہیں، وہ سن کر ان پر عمل بھی کرتی ہوں۔"

43 "سوشل میڈیا پسند ہے یا ناپسند ہے؟"

"سوشل میڈیا بہت کارآمد ہے۔ ہم ہر چیز سے اپ ڈیٹ رہتے ہیں۔"

44 "ایک ایسی تاریخ جو بھول نہیں سکتیں آپ؟"

"وہ دن اور وہ تاریخ جب آڈیشن دیا اور جب کامیابی کا فون آیا۔ کبھی نہیں بھول سکتی۔"

45 "کیا کیا اچھا پکا لیتی ہیں؟"

"صرف انڈا فرائی اور نوڈلز۔"

46 "ایک کھانا جو ہر وقت کھا سکتی ہوں؟"

"نوڈلز۔"

47 "سینما میں پہلی فلم کون سی دیکھی تھی؟"

"بن روئے۔"

48 "کردار کے انتخاب کے لیے آپ کی پسند؟"

"کہ ایک کردار بار بار نہ کروں، ہر بار مختلف کردار کر کے اپنے آپ کو منواؤں۔"

49 "آج کل کس نام سے پکاری جاتی ہیں؟"

"ہاہاہا...... سچ بتاؤں، خوشی کے نام سے...... "جن کی شادی ان کی شادی۔" کا یہ کردار بہت مقبول ہوا ہے۔"

50 "آپ کی خواہش ہے کہ؟"

"کہ میں بین الاقوامی سطح پر کام کر کے پہچانی جاؤں۔"

51 "جب آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتی ہیں تو؟"

"تو شکر کرتی ہوں کہ اللہ نے ایک مکمل شخصیت بنایا ہے۔"

52 "پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ کراچی؟"

"بوٹ بیسن۔"

53 "شادی میں کیا دینا چاہیے گفٹ یا کیش؟"

"گفٹ...... کیونکہ گفٹ ہمیشہ یاد رہتا ہے۔"

54 "گھر میں کس کے ہاتھ میں ذائقہ ہے؟"

"امی کے ہاتھ میں...... بہت لذت ہے ان کے ہاتھ میں۔"

55 "کب فریش ہوتی ہوں؟"

"جب اپنی نیند سے بیدار ہوتی ہوں۔ کوئی بار بار اٹھائے تو چڑچڑا پن آجاتا ہے۔"

56 "دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھاتی ہیں؟"

"دوسروں کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھاتی

ہوں اور اپنے تجربات سے بھی بہت کچھ سیکھتی ہوں۔"

57 "دنیا میں اللہ کا بہترین گفٹ؟"
"والدین اور ان کی بھرپور محبت۔"

58 "ایک کھلونا جو سنبھال کر رکھا ہوا ہے؟"
"اپنا ٹیڈی بیئر۔"

59 "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟"
"الحمدللہ بالکل......اور اپنی غلطیوں سے سیکھتی بھی بہت ہوں۔"

60 "محبت کیا ہوتی ہے اندھی بہری یا لولی؟"
"ہنستے ہوئے۔ تینوں ہی ہوتی ہے مگر محاورتاً اندھی۔"

61 "دل کا فیصلہ مانتی ہیں یا دماغ کا؟"
"پہلے دل کی سنتی ہوں پھر دماغ سے رائے مانگتی ہوں جس کا جواب بہتر ہو، اس کی مان لیتی ہوں"

62 "غصے میں پہلا لفظ؟"
"اپنی شکل نہیں دکھانا......ورنہ بہت برا ہوگا۔"

63 "کیا لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے؟"
"بالکل......ادھر لیٹی ادھر سوئی۔"

64 "سونے سے پہلے ایک کام ضرور کرتی ہیں؟"
"پہلے تو فریش ہوتی ہوں۔ پھر لیٹتے ہی اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتی ہوں اور پھر نیند کی وادیوں میں گم ہو جاتی ہوں۔"

65 "محنت یا قسمت؟ پیسہ کس سے ملتا ہے؟"
"محنت سے پیسہ ملتا ہے مگر اس کے لیے آپ کی قسمت کا اچھا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔"

66 "سیاحت سے لگاؤ؟"
"بہت زیادہ ہے۔ یو ایس اے اور یورپ گھومنے کی شدت سے خواہش ہے۔"

67 "پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہوں؟"
"اس کے قائم و دائم رہنے کی دعا کرتی ہوں۔ اس ملک نے ہمیں عزت، شہرت دولت دی۔ اللہ اسے ہمیشہ سلامت رکھے۔ یہی ہماری پہچان ہے۔"

68 "شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"میری؟......اللہ نہ کرے، اپنی کامیابیوں کی ہمیشہ دعا مانگتی ہوں۔"

☆☆

ابن انشاء کی معروف کتابیں

کتاب کا نام

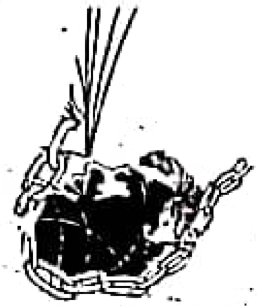

آپ سے کیا پردہ
باتیں انشاجی کی
بلو کا بستہ
قصہ ایک کنوارے کا

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے ناول افسانے اب گھر بیٹھے منگوائیں۔
پاکستان میں ہر جگہ آن لائن منگوائیں۔

مزید معلومات کے لیے فون کریں

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون: 021-32216361

باصلاحیت مصنفہ

حمیرا شفیع سے ملاقات

شاہین رشید

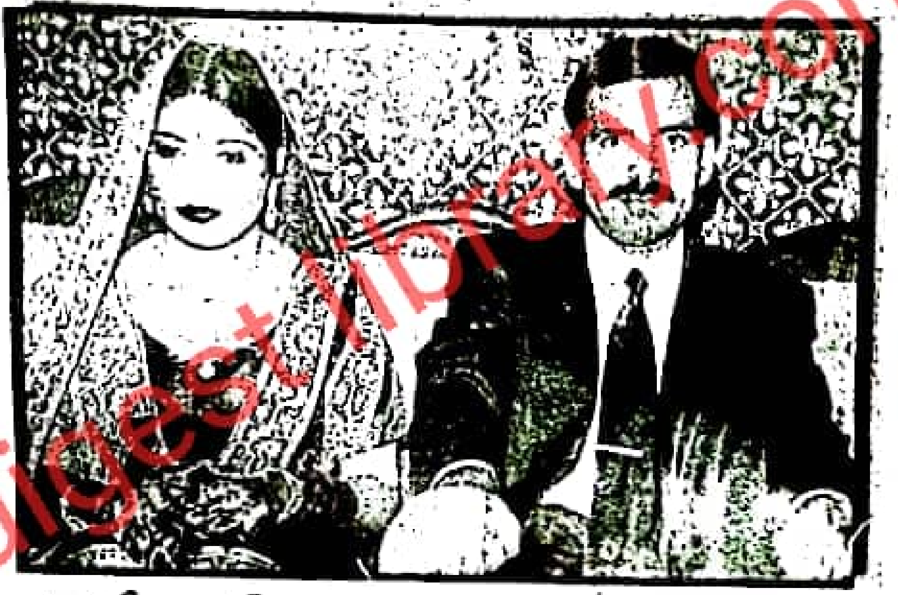

digestlibrary.com

حمیرا شفیع کو لکھتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن اس مختصر عرصہ میں انہوں نے اپنی شناخت بنالی ہے۔ مزاج کی ہلکی چاشنی لیے ان کا شگفتہ انداز دل موہ لیتا ہے۔ آج ہم آپ کی ملاقات حمیرا شفیع سے کروا رہے ہیں۔

"کیسے مزاج ہیں؟"

"الحمدللہ"

"آپ کے نام کا مطلب کیا ہے؟ آج کل کی مصروفیات اور پھر اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیں؟"

سب سے پہلے تو شاہین آپا آپ کا اور آپ کے ادارے خواتین ڈائجسٹ کا شکریہ کہ مجھے عزت دی اور محبت دی۔

میرا نام "حمیرا" ہے جس کا مطلب "سرخ رنگ کی۔" یہ نام میرے چچا جان نے نہایت شفقت اور پیار سے رکھا تھا۔ شفیع میرے والد کا نام ہے، اور میں اسی نام یعنی حمیرا شفیع کے نام سے لکھتی چلی آرہی ہوں۔ اور شادی کے بعد بھی اس نام سے لکھ رہی ہوں۔ والد صاحب کی وفات کے بعد تو ان کے نام سے اتنی جذباتی انسیت ہوگئی کہ میں نے اس نام کو اپنے نام سے ہٹایا ہی نہیں......

دراصل میرا کوئی بھائی بھی نہیں ہے تو مجھے یوں لگتا تھا کہ والد صاحب کا نام مجھے نہیں ہٹانا چاہیے تھا...... ویسے میرے شوہر صاحب کا نام "محمد جاوید" ہے پہلے وہ ایک ٹیکسٹائل انڈسٹری سے وابستہ تھے مگر آج کل وہ اپنا بزنس کر رہے ہیں۔"

"ہم پنجابی آرائیں" ہیں جو کہ کافی مشہور کاسٹ ہے۔

اب بات کرتے ہیں مصروفیات کی تو مصروفیات وہی ہیں جو ایک ہاؤس وائف کی ہوتی ہیں اور گھر داری کے علاوہ لکھنے لکھانے کا کام...... آج کل میں شعاع، خواتین اور کرن میں باقاعدگی سے لکھ رہی ہوں...... ہاں ان کے علاوہ پاکیزہ اور اردو ڈائجسٹ میں بھی وقفے وقفے سے لکھتی رہتی ہوں۔

فیملی بیک گراؤنڈ میرا زیادہ لمبا چوڑا نہیں ہے، میکہ مختصر ترین ہے۔ ہم صرف دو ہی بہنیں ہیں۔ والدین حیات نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت

فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

والد صاحب گورنمنٹ جاب میں تھے اور والدہ ہاؤس وائف، میرا ننھیال لیعل آباد کے قریب واقع گاؤں داراپور میں مقیم تھا جبکہ ددھیال ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ملحق ایک گاؤں میں مقیم تھا۔ والد صاحب جاب کے سلسلے میں صادق آباد تشریف لائے تھے اور پھر انہوں نے وہاں مستقل رہائش اختیار کرلی......

میری پیدائش، بچپن، تعلیم اور شادی سب ہی کچھ اس شہر میں ہوا۔ اس لیے مجھے اپنے شہر صادق آباد سے بہت پیار ہے یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے مگر تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن ہے، صوبہ پنجاب کے بالکل آخری کونے پر واقع ہے...... جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ ہم دو ہی بہنیں ہیں تو آپ کو بتاؤں کہ میری بڑی بہن مجھ سے تقریباً تیرہ سال بڑی ہے، شادی شدہ اور عرصہ دراز سے لاہور میں مقیم ہیں ان کی دو بیٹیاں ہیں۔ ان کا بیٹا نہیں ہے اور ہم دونوں بہنوں کا بھائی نہیں ہے اور اس انمول رشتے کی کمی کو ہم دونوں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے، ہمیشہ اپنی زندگی میں ان کی کمی بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے مگر رب کی رضا پر راضی ہیں۔

"میں نے پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے اپلائیڈ سائیکالوجی میں ماسٹرز کیا ہے۔ کچھ عرصہ لیکچرار بھی رہی۔ جس کی تفصیل آگے بتاؤں گی۔ بچے ماشاءاللہ سے میرے "تین" ہیں، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا، بڑی بیٹی فاطمہ جناح میڈیکل یونی ورسٹی میں ایم بی بی ایس کے فائنل ایئر میں ہے ابھی کچھ ہی عرصے کے بعد اس کی ہاؤس جاب شروع ہونے والی ہے۔ دوسری بیٹی اسلامیہ یونی ورسٹی سے انگلش میں بی ایس کر رہی ہے جبکہ بیٹا UET سے انجینئرنگ کر رہا ہے۔

جیسا کہ میں نے بتایا کہ ہم دونوں بہنوں میں عمروں کا فرق کافی ہے...... تو میں گھر میں تیرہ سال بعد آنے والا وہ بچہ تھی جس کی آمد پر بہت خوشیاں منائی گئیں، بہت لاڈلی تھی میں، مگر جسمانی لحاظ سے

بہت کمزور تھی میں، تو اماں ابا اور بہن تینوں نے مجھے ہاتھ کا چھالا بنا کر پالا۔

بچپن میں کافی بیمار بھی رہی۔ شرارتی تو بالکل نہیں تھی۔ بہت سنجیدہ اور سلجھی ہوئی بچی تھی۔ ذمہ دار بھی بہت تھی، چیزیں خراب نہیں کرتی تھی۔ جیب خرچ بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرتی تھی۔ شاید گھر میں کوئی دوسرا بچہ نہیں تھا سب ہی بڑے تھے تو اسی وجہ سے وہ بچپن والی شوخی اور شرارت میرے اندر نہیں آئی۔

بہن کی شادی کے بعد میں زیادہ تنہائی محسوس کرتی تھی۔ حساس بھی بہت ہو گئی تھی۔ اس کے بہت قریب تھی، چھوٹے موٹے کام بھی کردیا کرتی تھی۔ کوکنگ کا بہت شوق تھا، خاص طور پر سبزیوں کے پکوڑے بہت شوق سے بناتی تھی، چاول تو اس وقت پکانے آگئے تھے جب میں "ٹین ایج میں بھی نہیں آئی تھی...... مجھے بالکل بھی یاد نہیں کہ والدین کو کسی بھی حوالے سے تنگ کیا۔ سوائے اس ایک بات کہ میں بیمار بہت رہتی ہوں۔ ابا اماں بے چارے ہمہ وقت ہی ڈاکٹروں کے پاس چکر کاٹتے رہتے تھے۔

اور جب میں دس بارہ سال کی ہوئی تب میری صحت بہتر ہونا شروع ہوئی اور پھر بعد میں تو الحمدللہ بہت

تندرستی اور صحت پائی۔

پڑھائی کی اگر آپ بات کریں تو اس معاملے میں، میں نے اپنے والدین کو بہت خوش رکھا، بہت پڑھاکو اور کتابی کیڑا ٹائپ کی لڑکی تھی۔ ہر وقت کتابوں میں ہی گھسی رہتی تھی...... کلاس ون سے لے کر میٹرک تک ہمیشہ پوزیشن لی۔ ایف اے میں تو میری باقاعدہ بہاول پور بورڈ میں تیسری پوزیشن تھی، اسکالرشپ کے علاوہ تعریفی اسناد بھی بہاول پور بورڈ کی جاری کردہ ابھی تک محفوظ ہیں۔

بی اے میں بھی کالج میں تیسری پوزیشن تھی، پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ میں میرا میرٹ کے لحاظ سے آٹھواں نمبر تھا...... جب میرے چچا جان مجھے یونی ورسٹی میں داخلہ کروانے جا رہے تھے تو وہ اپنے ایک دوست سے کہہ رہے تھے کہ۔

”دیکھو میری بھتیجی کا پنجاب یونی ورسٹی میں کتنا اچھا میرٹ بن گیا ہے۔“ ان کا فخریہ لہجہ اور الفاظ مجھے آج بھی یاد ہیں۔

آپ نے ماحول کی بات کی تو جس گھر میں ماں باپ کے علاوہ صرف ایک بچہ ہو تو گھر کا ماحول بھلا کیسا ہو سکتا ہے؟ خاموش، سنجیدہ اور پڑھاکو۔

بہت نظم و ضبط تھا۔ افراتفری اور شور شرابے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ابا جان اخبار بینی کے رسیا تھے، ہمارے گھر میں بڑی باقاعدگی سے اخبار اور رسائل وغیرہ آتے تھے۔ مجھ میں مطالعہ کی عادت بچپن سے ہی پختہ ہو گئی تھی۔ لکھنے لکھانے کے جراثیم بھی ”نشوونما“ پا رہے تھے۔ الماری میں رکھی دادی جان کی ڈائریاں پڑی رہتی تھیں وہ بلاناغہ ڈائری لکھنے کی عادی تھیں اور ان کی وفات کے بعد ابا جان نے وہ تمام ڈائریاں سنبھال کر رکھی تھیں جو میرے ہاتھ لگ چکی تھیں، وہیں سے شاید مجھے بھی لکھنے کی تحریک ملی یا تحریک پیدا ہوئی۔

مجھے یاد ہے کہ ان دنوں ہمارے یہاں نوائے وقت اخبار آتا تھا جس میں ہفتہ وار بچوں کا صفحہ ”پھول اور کلیاں“ بھی ہوتا تھا۔ میں بہت شوق سے پڑھتی تھی، بچوں کی کہانیاں بچے ہی لکھتے تھے...... ایک دفعہ میں نے بھی اسکول کی کاپی کا صفحہ پھاڑا، چھوٹی سی کہانی لکھی، ابا کی دراز سے نیلا لفافہ چرایا، ایڈریس میں ”پھول اور کلیاں“ لکھا اور گھر کے قریب لال رنگ کے لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ اگلے ہفتے کہانی چھپ بھی گئی۔ اس کے اوپر میرا نام بھی جگمگا رہا تھا۔ کہانی دیکھ کر خوش ہونے کے بجائے خوف زدہ ہو گئی کہ گھر والوں سے ڈانٹ پڑے گی کہ اکیلی لیٹر بکس تک کیوں گئیں اس لیے بجائے بتانے کے وہ صفحہ ہی چھپا دیا۔

یوں سمجھیں کہ پانچویں جماعت میں پہلی کہانی چھپی، پھر ایسا چسکا لگا کہ مسلسل ”پھول اور کلیاں“ میں لکھنے لگی۔ میٹرک تک کئی کہانیاں ”پھول اور کلیاں“ کی زینت بنیں، گھر والوں کو بھی پتا چل گیا۔ اماں ابا بڑی بہن خوش تو بہت ہوئے مگر ساتھ ہی پڑھائی پر بھرپور توجہ دینے کی ہدایت بھی کر دی کہ اس میں کوئی کمی نہ آئے...... اور ایسا ہی ہوا۔ لکھنے لکھانے کے مشاغل کے ساتھ تعلیم پر بھی بھرپور فوکس رکھا۔

کالج کی زندگی بہت مزے کی تھی، شعاع، کرن...

digest library.com

اور خواتین ہمارے گھر آتے تھے۔ مگر اس وقت میری دلچسپی کا مرکز ان کا شعروشاعری والا پورشن تھا، پھر ہماری اردو کی لیکچرار بھی بیت بازی کا مقابلہ کروائی رہتی تھیں، تو یوں میرا رجحان نظموں اور غزلوں کی جانب چلا گیا، اور نثر کے ساتھ شاعری بھی شروع کر دی۔ کئی نظمیں غزلیں لکھیں اس میں بھی ایک الگ مزا تھا۔ آج بھی میری کہانیوں میں شاعری میری اپنی ہی ہوتی۔ پنجاب یونی ورسٹی کے آڈیٹوریم میں بھی مختلف تقاریب میں اپنی غزلیں سنائیں اور کلاس فیلوز سے خوب داد پائی......

اور پھر...... میری شادی ہو گئی۔

سسرال تو صادق آباد میں ہی تھا...... مگر میاں کی جاب فیصل آباد میں تھی، پھر شادی کے فوراً بعد ان کے ہمراہ فیصل آباد چلی گئی تھی...... سسرال میں جوائنٹ فیملی سسٹم نہیں تھا...... سب ہی علیحدہ علیحدہ رہتے تھے۔ ماشاء اللہ سے کافی بھرا پرا سسرال ہے۔

دو نندیں، چار جیٹھ، جیٹھانیاں...... اب تو ایک نند، ایک جیٹھ اور جیٹھانی وفات پا چکے ہیں۔ ساس، سسر بھی حیات نہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت میں اعلیٰ مقام دے۔

ہم دونوں چونکہ گھر کے سب سے چھوٹے تھے اور رہتے بھی دور تھے تو کافی اچھا وقت گزرا۔ کوئی بدمزگی نہیں ہوئی۔

میں اپنی زندگی کے ان سالوں کا ذکر بھی ضرور کرنا چاہوں گی جس میں، میں آزمائش کی بھٹی سے گزری۔ یہ سال میری زندگی کے مشکل ترین سال تھے۔ شاید اللہ کی طرف سے میرے صبر اور حوصلہ کا امتحان تھا۔ اب پتا نہیں میں اس امتحان میں کتنی کامیاب رہی ہوں رب کی ذات ہی جانتی ہے۔"

ہوا کچھ یوں کہ میری شادی کے بعد اماں، ابا جان گھر میں تنہا رہ گئے تھے، بہن پہلے ہی لاہور مقیم تھی اور میں فیصل آباد چلی گئی۔

میری شادی سے کچھ ہی عرصہ پہلے ابا جان کو فالج ہوا تھا اور وہ مکمل طور پر صحت یاب نہیں تھے البتہ چلتے پھرتے تھے۔ اور اپنے تمام ضروری امور خود ہی انجام دیتے تھے۔ مگر بدقسمتی سے ایک رات انہیں فالج کا دوسرا بڑا حملہ ہوا جو اس قدر شدید تھا کہ بامشکل ہی ان کی جان بچ سکی مگر وہ مکمل طور پر بیڈ پر آ گئے تھے......

باقاعدگی سے پانچ وقت کی نماز مسجد میں ادا کرنے والے میرے ابا جان، مارننگ واک کے پابند میرے شفیق والد محترم مکمل طور پر محتاج ہو کر رہ گئے۔ یہاں تک کہ ان کی چارپائی کو "وہیل" لگوانے پڑے۔

اب اماں جان کی کمزور اور ناتواں جان کے لیے اکیلے فالج کے مریض کی دیکھ بھال ممکن نہیں تھی...... اس وقت میرے تینوں بچے بہت چھوٹے تھے...... خیر باہمی رضامندی سے میں والدین کے گھر ہی شفٹ ہو گئی۔

والد صاحب تقریباً دس سال صاحب فراش رہے...... میں نے اپنی اماں کے ہمراہ ان کی ہر ممکن خدمت کی۔ نہلانا دھلانا، کھلانا، پلانا ان کی چارپائی کو کھینچ کر دھوپ میں لانا، سردی گرمی سے بچانا سب ہی کچھ کیا۔

میاں صاحب چونکہ ہمارے ساتھ نہیں تھے جاب پر تھے تو گھر کا ہر چھوٹا بڑا کام گھر کا اور گھر سے باہر سب ہی کچھ میں کرتی تھی۔ پھر بچے بھی چھوٹے تھے، ان کی بھی بیماریاں اور دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی۔ نہایت مشکل وقت تھا۔ لکھنا لکھانا پڑھنا لکھنا سب

کچھ ہی چھوٹ گیا تھا۔ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے مجھے کچھ علم نہیں تھا، کڑا وقت تھا پر گزر گیا اب سوچتی ہوں تو رب سے دعا کرتی ہوں کہ اس وقت میں جو کوتاہیاں ہوئیں انہیں معاف کر دیتا۔

والد کی وفات کے بعد میرے میاں صاحب بھی ہمارے گھر میں شفٹ ہو گئے۔ ملازمت کو انہوں نے خیر باد کہہ دیا تھا اور اپنا بزنس کو شروع کیا۔"

"لکھنے کا تو اچھا خاصا گیپ آ گیا ہوگا...... پھر شروعات کیسے کی؟"

"اچھا کیا آپ نے پوچھ لیا۔ میں آپ کو بتاتی ہوں کہ دوبار، لکھنے کی طرف ۔ ے راغب ہوئی۔"

میاں صاحب نے بزنس شروع کیا۔ ہمارے بچے بھی بڑے ہو رہے تھے جب وہ چھوٹے تھے تو جاب کا خیال ہی نہیں آیا اور آتا بھی کیسے، بچے دیکھتی یا پھر جاب کرتی۔...... اب چونکہ بچے بڑے ہو گئے تھے تو میں نے گورنمنٹ ڈگری کالج صادق آباد برائے خواتین میں اپنی سی وی جمع کروائی۔ وہاں کی اولڈ اسٹوڈنٹ بھی میں رہ چکی تھی، میڈم دل شاد نسیم ان دنوں پرنسپل تھیں...... خیر جاب آئی اور میری سائیکالوجی لیکچرار کی حیثیت سے تعیناتی ہو گئی۔

"بریک میں ہم سب آفس میں بیٹھا کرتی تھیں جس کی انچارج میری دوست جمیرا ناز تھی جو آج وہاں کی وائس پرنسپل ہیں، ہم سب کا ایک ہی گروپ تھا، صبا ممتاز، فہمیدہ، شہناز رانا، روزینہ ناز، صائمہ جعفر اور خود میں، جمیرا ناز...... خوب بحث و مباحثے ہوتے، لطیفے چٹکلے وغیرہ چائے سموسوں کا دور بھی چلتا تھا۔

ان دنوں روزینہ ناز صاحبہ اردو میگزین نکال رہی تھیں اور اس کے لیے تحریریں اکٹھی کر رہی تھیں۔ ایک دن انہوں نے مجھے کہا کہ جمیرا تم بھی کچھ لکھو...... انہی کے اصرار پر میں نے پہلے تو ایک مضمون "آفس" پر ہی لکھ دیا جو کہ مزاحیہ مضمون تھا اور سب کو ہی پسند بھی آیا تھا۔ پھر دو افسانے تحریر کیے......جس پر میری کولیگز دوستوں نے پوچھا کہ۔

"کیا تم پہلے بھی لکھتی رہی ہو۔"

تو میں نے بتایا ہاں میں لکھتی رہی ہوں۔"

تب سوچا کہ اپنی صلاحیتوں کو زنگ نہ لگاؤں بلکہ دوبارہ قلم اٹھاؤں۔ ایسا کرنا مجھے اجنبیت کا احساس تو دلا رہا تھا اور سب نے کہا بھی کہ تم نے لکھنا چھوڑ کر غلط کیا ہے۔ تب ان کی حوصلہ افزائی پر ایک افسانہ "دو لفظ" تحریر کر کے شعاع میں بھیجا جو اگلے ہی ماہ چھپ گیا۔

کہانی چھپنے کے بعد سب سے پہلا فون مجھے میری پیاری دوست "فاطمہ زاہد" کا آیا تھا۔ انہوں نے بھی گورنمنٹ کالج صادق آباد میں طویل عرصے تک انگلش لیکچرار کی حیثیت سے جاب کی ہے، زاہدہ بھی شعاع، کرن اور خواتین کی مستقل قاری ہیں۔

پھر میری اس مہربان دوست اور کولیگ نے میری حوصلہ افزائی کی، تحریروں پر تبصرہ بھی کیا...... یہ بات ہے 2019ء کی۔ تب سے اب تک لکھنے کا سلسلہ تواتر کے ساتھ جاری ہے۔

میری دوسری کہانی "بالٹی بھر گوشت" اس سے اگلے مہینے ہی شائع ہوئی۔ پہلی تحریر کا اعزازیہ "1000" ملا تھا جو کافی عرصے تک سنبھال کر رکھا۔ اب یاد نہیں کہ بعد میں کہاں خرچ کیا۔

2019ء سے مسلسل لکھ رہی ہوں۔ کتنے افسانے اور ناولٹ لکھے ہیں اس پر میں نے اپنا احاطہ کیا تو یہ ہوا کہ خواتین کے تینوں پرچوں میں میری تقریباً "90" تحریریں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں تیرہ ناولٹ اور باقی ے ہیں پاکیزہ اور اردو ڈائجسٹ میں شائع تحریریں اس کے علاوہ ہیں۔ ابھی ایک بھی نے گیپ نہیں لیا۔ اور کوشش ہے کہ آئندہ بھی نہ لوں۔

اور ہاں میں آپ کے اس انٹرویو کے توسط سے خاص طور پر امثل آپی صاحبہ کی اور ان کے علاوہ روبینہ آپی کی۔ واصفہ آپی اور باقی تمام معاون ایڈیٹرز کی بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ امثل آپی نے ہمیشہ سے جب بھی بات ہوئی انہوں نے میری کاوشوں کو سراہا میری تحریروں کو فوری

digest library.com

جگہ دی، کچھ ایک آدھ تحریریں ریجیکٹ بھی ہوئیں۔ تو ایسا تو چلتا رہتا ہے۔

اپنی پہلی تحریر کے چھپنے کے بعد آپ یقین مانیے اس کی کیفیت کی، احساس کی اس بے پایاں مسرت کی میں وضاحت نہیں کر سکتی لکھنے کے حوالے سے یہ ایک طرح سے میرا دوسرا جنم تھا۔

"بہن بھائیوں سے تعلقات؟"

"آپ نے بہن بھائیوں سے تعلقات کا پوچھا تو جیسا کہ میں نے بتایا میری ایک ہی بہن ہے جو مجھ سے تیرہ سال بڑی ہے۔ اس لیے لڑائی جھگڑے والا کوئی سین نہیں ہوا۔ ہاں ان کی بیٹیوں رابعہ، مجید اور فاطمہ مجید سے بہت بے تکلفی ہے، نوک جھونک چلتی رہتی ہے۔ دونوں ہی درس وتدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں اللہ پاک ان کے نصیب نیک کرے۔

"پلاٹ کب ذہن میں آتا ہے؟"

"اس کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ کہانیاں ہر وقت ذہن میں چلتی رہتی ہیں۔ بس فرصت ملنے پر قلم ہاتھ میں تھامنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں زیادہ نخریلی رائٹر نہیں ہوں کہ بالکل خاموشی یا تنہائی ہو تو ہی لکھوں...... میں تو ہر ماحول میں لکھ لیتی ہوں۔ زیادہ تر تو میں نے کچن میں ہانڈی چولہے پر چڑھا کر لکھا ہے۔ کئی بار کاغذ بھی داغ دار ہو جاتا ہے۔ ڈوب کر لکھتی ضرور ہوں مگر دماغ حاضر رہتا ہے۔ کبھی کچھ نقصان نہیں کیا اگر میں فراغت کا انتظار کروں تو بس پھر انتظار ہی کرتی رہ ——— جاؤں گی۔ اور کچھ لکھ نہ پاؤں گی کیونکہ میں اپنے گھر کے سارے کام خود ہی کرتی ہوں۔ اور پھر باہر کے کاموں کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہی ہے کیونکہ میاں صاحب بہت مصروف رہتے ہیں۔ اور بچے ہوسٹل میں رہتے ہی۔ اور جب وہ گھر آتے ہیں تو ان کے کھانے کی تیاری اور پھر ان کے واپس جانے کی تیاری میں مصروف ہو جاتی ہوں، مختلف تقاریب کے لیے بچیوں کے ملبوسات کی تیاری۔ سب ہی کچھ تو مجھے کرنا ہوتا ہے۔ لکھنے کے علاوہ میرا دوسرا مشغلہ اپنی بیٹیوں کے کپڑوں کی سلائی ہے جو میں بہت شوق اور دل لگا کر کرتی ہوں۔ اگر موڈ اچھا ہو تو اپنا سوٹ دو ڈھائی گھنٹوں میں سلائی کر کے پہن لیتی ہوں۔

مجھے اپنی تحریروں کا ریسپانس بہت اچھا ملتا ہے۔ الحمدللہ۔ میرے تینوں بچے میرے لکھنے سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ بیٹا کہتا ہے "مما" آپ ناولٹ زیادہ لکھا کریں۔ آپ کہانی کو جلدی ختم کر دیتی ہیں۔

بڑی بیٹی جو کہ ایم بی بی ایس کے فائنل میں ہے تو ہوسٹل میں اس کی دوستیں میری تحریروں پر بہت اچھا ریسپانس دیتی ہیں۔ اس کی دوست ڈاکٹر اسماء میری تحریروں میں خصوصی دلچسپی لیتی ہے...... گزشتہ سال "کرن" میں، میں نے سال نو کے حوالے سے تحریر لکھی تھی جس کی ہیروئن ڈاکٹر تھی تو یہ تحریر سب کو ہی پسند آئی۔ میرے ایک کزن "شہزاد حسین" جو خود بھی مضامین اور کالم لکھتے ہیں وہ میری تحریروں پر خاص دلچسپی لیتے ہیں اور ضرور تذکرہ بھی کرتے ہیں۔

پڑوسی بھی خاص دلچسپی لیتے ہیں۔ میں نے کبھی خود سے تو ذکر نہیں کیا مگر جب بچیاں پڑھتی ہیں تو نام سے پہچانی جاتی ہیں۔ اور بھی کسی بازار میں یا شاپنگ مال میں پرانی طالبات مل جاتیں تو میری تحریر کے بارے میں ضرور رائے زنی کرتی ہیں...... ایک دفعہ تو جوتے خریدتے وقت ایک بچی زیادہ جذباتی ہوگئی کہ "میڈم آپ نے "مٹھی بھر محبت" میں ہیروئن کو ہیرو سے کیوں نہیں ملوایا تھا...... ویسے بچیاں مجھ سے یہ شکوہ ضرور کرتی ہیں کہ میں ہیروئن کی شادی ہیرو سے کروانے کے بجائے کسی اور سے کیوں کروا دیتی ہوں۔ سچ میں، میں ایسا جان بوجھ کر نہیں کرتی کہانی ہی ایسا رخ اختیار کر لیتی اور پھر ہیروئن کی بھلائی بھی تو دیکھنی ہوتی ہے۔

کولیگز میں روزینہ ناز، فاطمہ زاہد، حمیرا ناز میری تحریروں میں بہت دلچسپی لیتی ہیں حالانکہ جاب کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا پھر بھی۔ والد کی طرح میری والدہ بھی چار سال بیڈ پر رہیں۔ والدہ صاحبہ کی ٹانگ

میں فریکچر ہو گیا تھا۔ آپریشن کے باوجود وہ چل پھر نہیں سکتی تھیں اور ان کی دیکھ بھال کی وجہ سے مجھے جاب چھوڑنی پڑی تھی کیونکہ انہیں بھی مکمل دیکھ بھال کی ضرورت تھی...... مجھے یاد ہے کہ ان دنوں میں ان کی چارپائی کے سرہانے بیٹھ کر لکھتی رہتی تھی۔ تب والدہ صاحبہ بہت خوش ہوتی تھیں...... اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین)

سسرال والوں سے میرے اچھے تعلقات ہیں، خاص طور پر نوجوان نسل سے کافی اچھی گپ شپ رہتی ہے۔ میرے مرحوم جیٹھ اور جیٹھانی کی بیٹیوں شازیہ اور نازیہ سے بہت دوستی ہے میری اور ان کی والدہ سے مجھے بہت انسیت تھی وہ مجھے اپنی دیورانی کے بجائے اپنی چھوٹی بہن سمجھتی تھیں۔ وہ میرے والدین کی عیادت کے لیے اکثر آجایا کرتی تھیں۔ اب جب بھی ان کے گھر جاتی ہوں ان کی یاد میں آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

میرے سسرال میں کوئی بھی ادبی مزاج کا نہیں ہے۔ بہت سوں کو تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ میں لکھ لیتی ہوں یا لکھتی بھی ہوں۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ کوئی زیادہ دل برداشتہ ہونے والی بات نہیں ہے کیونکہ ہر انسان کے الگ الگ مشاغل اور دلچسپیاں ہوتی ہیں۔

میرے میاں بھی کاروباری مزاج کے بندے ہیں، پھر مصروف بھی بہت رہتے ہیں۔ میرے لیے یہی بہت بڑی بات ہے کہ انہوں نے میرے لکھنے لکھانے پر کوئی پابندی عائد نہیں کی اور نہ ہی انہیں کوئی اعتراض ہے۔ میری تحریریں بھی ارجنٹ سیل سروس میں جمع کروا آتے ہیں۔ الحمدللہ اچھا وقت گزر رہا ہے۔

''کس موضوع پر لکھنا زیادہ آسان ہے یا آپ انجوائے کرتی ہیں؟''

''آپا...... میں نے ہر موضوع پر لکھا ہے۔ شعاع میں میری ''پہلی تحریر'' ''دو لفظ'' سنجیدہ نوعیت کی تحریر تھی...... بہت پہلے ایک میگزین میں میری ایک تحریر شائع ہوئی تھی اس میں زیادہ تر فلسفہ تھا اور بھاری بھرکم موضوع تھا اور جب میں نے اسے پڑھا تو میرا دل بھی بوجھل ہو گیا۔ زندگی کی حقیقتیں تو پہلے ہی تلخ ہوتی ہیں اور لوگ ذہنی تفریح کے لیے مطالعہ کرتے ہیں تو بہتر ہے کہ بندہ ہلکا پھلکا ہی لکھے۔''

میں اپنی والدہ کی وفات کے بعد ڈپریشن میں چلی گئی تھی، تو تحریر میں بھی اداسی آ گئی تھی۔ تو پھر اپنی ایک دوست کے مشورے کے بعد میں نے ہلکے پھلکے انداز اور مزاح کے پیرائے میں لکھنا شروع کیا اور مجھے خود بھی ایک بے نام سی اداسی سے نکلنے میں مدد ملی اور لوگوں نے بھی بہت پسند کیا۔ جب کوئی کہتا ہے کہ ہم آپ کی تحریر پڑھ کر فریش ہو جاتے ہیں، ہم اداس بیٹھے تھے سوچا کہ حمیرا شفیع کا افسانہ پڑھ لیتے ہیں تو کافی دیر تک فریش بھی رہتے ہیں اور دیر تک ہنستے بھی رہتے ہیں...... تو مجھے بہت خوشی ہوتی۔

کسی کو ایک مسکراہٹ بخش دینا بھی صدقہ ہے۔ اگر تحریر پڑھ کر کسی روتے کے چہرے پر مسکراہٹ آجاتی ہے تو میرا خیال ہے یہ بھی ایک رائٹر کی بڑی کامیابی ہے...... میری کوشش ہوتی ہے کہ تحریر مقصدیت سے خالی نہ ہو۔ کوئی نہ کوئی سبق ضرور پوشیدہ

ہو، صرف مزاح ہی نہ ہو اپنے نقطۂ نظر کو تحریر میں یوں لکھیں کہ بات بھی پہنچ جائے۔ مزہ بھی آئے مگر تخی یا بوجھل پن نہ ہو...... اب میں اس میں کتنی کامیاب ہوں یہ میرے قارئین ہی بتاسکتے ہیں۔

کہانیوں کے لیے کردار مجھے اپنے ہی ماحول سے انواع واقسام کے مل جاتے ہیں اور مزے مزے کے مل جاتے ہیں۔ میں لوگوں کے چلتے پھرتے، بات کرنے اور ان کے رویوں کا گہرائی سے مشاہدہ کرتی ہوں۔ پھر میرا مضمون ''نفسیات'' ہے تو اس حوالے سے مجھے اسٹوڈنٹ لائف سے ہی مختلف کرداروں اور ان کے معاشرتی رویوں سے خاص دلچسپی رہی ہے اور چونکہ قلم کار میں بھی تو ارد گرد کے ہی کردار بلکہ کئی کردار مجھے کہانی لکھنے پر اکساتے رہے۔

شروع میں، میں نے ایک افسانہ ''مریض دل'' تحریر کیا تھا اس کا مرکزی کردار بھی میں نے اپنے ابا جان کے ایک دیرینہ دوست کی شخصیت سے متاثر ہو کر لکھا تھا جو دل کے مریض تھے مگر پرہیز بالکل بھی نہیں کرتے تھے...... پھر ''شبو کے دولہا'' میں شبو کا کردار مولانا صاحب کی بیٹی کا تھا۔ میں نے شادی کے دن اسے دھواں دھار روتے دیکھا تھا کیونکہ اسے اپنے دولہا کے حوالے سے کئی خدشات تھے۔ اور اس روتی بسورتی دلہن کو میں نے اپنے دولہا کے حوالے سے ''مسکلاوے'' کے دن اپنے دولہا کے ہمراہ والدین کے ہاں آتے ہنستے کھلکھلاتے ہوئے دکھایا تھا۔

''دل کا آنگن سونا ہے۔'' ناولٹ جو دو اقساط پر مشتمل تھا اس کا مرکزی کردار ''پچو'' میری دوست کا بھانجا تھا۔

تحریر چونکہ لکھنے والے کا عکس بھی ہوتی ہے تو کرداروں میں مجھے اپنی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ مثلاً افسانہ ''بھی بھی'' میں اور ''روٹھے ہو تم'' کی ہیروئن ''ہاؤس وائف'' کی قاریہ وغیرہ اور ''کچن کا راجا'' میں تو بالکل میں نے اپنے میاں کی شخصیت کو سامنے رکھ کر لکھا تھا...... اگرچہ وہ شیف تو نہیں ہے مگر بھی بھی کوکنگ بہت اچھی کر لیتے ہیں۔ ویسے بھی میرے میکے میں سادہ کھانا کھایا جاتا تھا۔ جبکہ سسرال والے چٹ پٹے اور مسالے دار کھانوں کے شوقین ہیں۔ یہ بھی (میاں صاحب) شادی سے پہلے فیصل آباد میں خود ہی کوکنگ کرتے تھے۔

اب بھی کسی خاص موقع پر بچے اپنے پاپا سے فرمائش کر کے پکواتے ہیں۔ مگر یہ ہرگز نہ سمجھیں کہ مجھے ریسٹ مل جاتا ہے وہ اوپر کے سارے کام جیسے کٹنگ اور گرائنڈ وغیرہ سب ہی مجھ سے کرواتے ہیں۔ پھر شیلف پر چیزیں بھی بہت پھیلاتے ہیں۔

اب تو بچیاں بھی کوکنگ کر لیتی ہیں، مگر ان سب کو ذائقہ میرے ہاتھ کا ہی پسند ہے، غذائیت سے کچھ لینا دینا نہیں ہے جبکہ میں سادہ کھانا پسند کرتی ہوں۔

(جاری ہے)

☆☆

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
خواتین ڈائجسٹ۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:Info@khawateendigest.com

ثنا سفیان خان...... انڈیا

میں انڈیا سے تعلق رکھتی ہوں اور عرصے سے اردو ادب سے جڑی ہوئی ہوں۔ فکشن لکھنا میرے شوق اور جذبے کا اظہار ہے۔ الحمدللہ، میرے دو ناولٹ مختلف ڈائجسٹوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اب میں اپنا تازہ تحریر کردہ ایک مختصر ناولٹ آپ کے معتبر رسالے خواتین ڈائجسٹ کے لیے ارسال کرنا چاہتی ہوں۔ چونکہ میں بیرون ملک (انڈیا) سے تحریر بھیج رہی ہوں، اس لیے آپ سے مودبانہ درخواست ہے کہ مجھے باضابطہ اجازت مرحمت فرمائیں۔ اگر آپ اجازت مرحمت فرمائیں تو میں مکمل ناولٹ آپ کو بھیج دوں گی۔

ج: پیاری ثنا! اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ لکھیں۔ نازنین فردوس اور آسیہ رئیس خان کی تحریریں آپ نے ہمارے پرچوں میں پڑھی ہوں گی۔ ان دونوں کا تعلق بھی انڈیا سے ہے۔

سلمیٰ مسرت...... راولپنڈی

شعاع میں میرا خط نہیں تھا امید تھی کہ خواتین میں میرا خط ضرور آئے گا کیونکہ اپنے فیورٹ ناول مالا پر سب سے شاندار تفصیلی تبصرہ میرا ہی تھا اور پھر سروے کے سوالوں کا بھی انتظار تھا۔ خط کل ای میل کروں گی، اتنی اچھی شاندار باتیں ہوتی ہیں سب دل میں رکھ سکتی ہوں کیونکہ سب سے سینئر ریگولر قاری ہونے کے باوجود میرے مختصر خطوں کو بھی ایڈٹ کر دیا جاتا ہے یا پھر جگہ ہی نہیں ملتی، میری تجاویز دونوں رسالوں نے شائع تو کر دیں لیکن شاید قاری بہنوں نے ان پر غور نہیں کیا یا پھر آپ نے ایڈٹ کر دیا کسی خط میں کوئی ذکر نہیں، اب تو شکوے کر کر کے بھی تھک گئی ہوں مصروفیت، تھکن سے لبریز صحت کے معاملے میں بھی یہ سال بہت برا ثابت ہوا صرف ایک خوشی ملی پاکستان کی مٹی میں فتح اور دنیا میں عزت ملی۔

نمرہ کے ہر لفظ کی میں دیوانی ہوں یہ ناول بھی شاہکار تھا۔ مالا کے انجام کے لیے ہم نے خود کو تیار کر لیا تھا آپ نے جس مقصد کے لیے یہ ناول لکھا، وہ مقصد پورا ہو گا نمرہ آپ نے بالکل ٹھیک کہا لوگ رائے دینے میں ذرا نہیں سوچتے، حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اس وقت خواتین کا اکلوتا سلسلے وار ناول "کر چلے جاں نثار ہم" سب پر چھایا ہوا ہے ان کے کردار الفاظ اور کہانی سب کے دلوں میں گھر کر رہے ہیں۔ ویلڈن۔ ڈائری میں جگہ دینے کا شکریہ۔ ناہید اقبال کی نظم میرے دل کی آواز تھی پچھلے خط میں بھی میں نے تعریف کی تھی لیکن میرا خط تو غائب تھا۔

ج: پیاری مسرت! آپ کا خط پڑھ کر ہمیں حیرت ہوئی۔ ہم تو آپ کو بہت عزیز رکھتے ہیں پھر آپ کو شکوہ کیوں ہوا، ہو سکتا ہے ہم سے نادانستگی میں کوئی کوتاہی ہوئی ہو۔ اتنی اچھی اور شان دار باتیں دل میں نہ رکھیں، لکھ کر ہمیں بھیجیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ ایڈٹ نہ کریں۔

آپ کا پچھلا خط تاخیر سے ملنے کے باعث شائع نہ ہو سکا۔

مصباح یونس...... نامعلوم شہر

digest library.com

میرا نام مصباح یونس ہے۔ آج سے تین سال پہلے میں نے لکھنا شروع کیا تھا۔ ایک ناول لکھا تھا جو شعاع میں شائع ہوا تھا۔ لیکن شاید وہ پہلا ناول تھا اس لیے تنقید کا سامنا کرنا پڑا کچھ لوگوں نے سراہا بھی تھا۔

اس وقت میرا علم محدود تھا پھر میں نے لکھنا ترک کر دیا۔ عمر چھوٹی تھی دل پہ لے لیا۔

خیر اس سال میں نے دوبارہ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں اپنا ناول بھیجنا چاہتی ہوں، میں آپ کے ساتھ اپنا سفر شروع کرنا چاہتی ہوں۔

ج: پیاری مصباح! قسط وار ناول لکھنے سے پہلے آپ کچھ مکمل ناول اور افسانے لکھیں۔ تاکہ قارئین سے آپ کا تعارف ہو سکے۔

دوسری بات یہ کہ ناول لکھنے کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں۔ آپ لکھیں اچھا ہوا تو ضرور شائع ہوگا۔

مومنہ عمران...... گجرات

نمرہ احمد اور عمیرہ احمد میری موسٹ فیورٹ رائٹرز ہیں۔ وہ بھی نمرہ احمد کے ناول "مالا" کی وجہ سے۔ مالا ناول ایک بہت بہت زیادہ اچھا ناول تھا۔ میں نے لائف میں فرسٹ ٹائم کوئی ناول دل جمعی سے پڑھا۔ مگر میرا دل کشمالہ کی موت کا یقین نہیں کر پا رہا۔ جو رائٹر کو بہتر لگا انہوں نے کیا۔

ج: پیاری مومنہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ نمرہ تک آپ کی رائے پہنچا رہے ہیں۔ ہمیں خط لکھتی رہیے گا۔

ریحانہ چوہدری...... مدوکے

آپ کے ساتھ الفاظ کے سہارے سے قائم شدہ رشتہ اتنا سچا اور انمول ہے کہ یقین نہیں آتا کہ ننھے منے الفاظ میں اتنی طاقت ہو سکتی ہے کہ وہ ہم سب قارئین کو ایک اٹوٹ رشتے میں باندھ دے، وہ بھی نفسانفسی کے اس دور میں، جب خون کے رشتے اتنے ناپائیدار ثابت ہو رہے ہیں۔

سچ کہوں تو یہ سال جذباتی لحاظ سے بہت (آنسوؤں کی شدت) تغیر و تبدل کا سال رہا۔ بہت سے رشتے ختم ہوئے۔ کچھ جیتے جی اور کچھ دنیا سے جانے کی وجہ سے۔ ایسے میں 70 ماؤں سے بڑھ کے پیار کرنے والے کے ساتھ رشتہ مضبوط سے مضبوط ہونے لگتا ہے۔ اپنا خسارہ نظر آنے لگتا ہے۔ سجدے طویل ہونے لگتے ہیں۔ دعا کے لیے اٹھے ہاتھ گرنا بھول جاتے ہیں۔ اس انمول رشتے سے منسلک میری پیاری پیاری بہنیں ریحانہ چوہدری کو اپنے دل کے بہترین مقام میں جگہ دیتی ہیں۔ یاد رکھتی ہیں تو اس محبت کا قرض ادا کرنے کے لیے ان سے رابطہ ضروری ہے بلکہ شاید اس وقت تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ آپ سے رابطہ میرے لیے آکسیجن کی حیثیت رکھتا ہے۔

آپ کو خبر ہے کہ آج دھند نے بہت بری طرح قبضہ جمایا ہوا ہے مدوکے کی فضا پر۔

دھند کی چادر اوڑھ کے موسم میرے آنگن اترا ہے۔ جی تو آتے ہیں 2025 کے آخری شمارے کی طرف۔ متفق آپ سے 100% متفق کہنی ان کہنی واقعی پڑھنے کے لائق۔ آپ کے الفاظ ہیں کہ گرانقدر سرمایہ دل پہ نقش ہوتے جاتے ہیں۔

بات ہو "کرن کرن روشنی" کی تو ادارہ لائق تحسین کاوشوں کے ساتھ پہلے نمبر پہ ہے۔

صائمہ نور سے ملاقات بہت برجستہ، بے تکلف انداز میں، بہت اپنی اپنی سی لگیں بہت سی عادات اپنے سے ملتی جلتی ہوئی۔

"ہمارے نام" شمارے کی جان اور میرے خیال میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا سلسلہ۔ پیاری ناہید اسماعیل بہت شکریہ۔ صدف ناصر کی محبت کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں میرے پاس۔

سچ کہوں تو مجھے مالا کا اینڈ پڑھ کے دکھ تو ہوا مگر اینڈ غیر حقیقی نہیں تھا۔ وہی حماقت جو اجالا نے کی وہی مالا نے بھی کی۔ یہ الگ بات کہ موت دکھ تو دیتی ہے کسی کی بھی ہو۔

کاش آپ ایک جملہ اور لکھ دیتیں کہ

"مجھے آپ سب کے جذبات کا احساس ہے"

تو قاری اور لکھاری کا رشتہ اور مضبوط ہو جاتا۔ لیسے تو یہ تاثر ابھر رہا ہے کہ......

''میرے الفاظ، میری کہانی، میری مرضی'' جسے جو سمجھانے بجھتا رہے۔

''کر چلے جاں نثار ہم'' سدیعہ عمیر عمر کا ناول بہترین قاری کے ذہن پہ اپنا تسلط قائم رکھنے میں کامیاب، بشار کے کردار کی گہرائی۔ کام والے لڑکے کا وارڈن کے کمرے سے پنجیری کے ڈبے میں سے مٹھی بھر کر جیب بھر لینا بہت نیچرل لگا۔

حمیرا شفیع ویلڈن۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے آپ ایک بہترین افسانہ نگار بن گئیں۔ اکبری اصغری اپنی ازلی خصوصیات کے ساتھ نئے پیکج میں اچھی کہانی تھی۔

فرحانہ مہناز کا افسانہ اے ٹی ایم دور حاضر کے حوالے سے ایک حقیقی تصویر پیش کی۔ مزے کی بات بتاؤں میں نے خود آج تک اپنا اے ٹی ایم کارڈ خود استعمال نہیں کیا۔ راشدہ رفعت کا مکمل ناول محبت معتبر ٹھہری۔ سبق یہ حاصل ہوا کہ کسی دوسرے کے بارے میں رائے دیتے ہوئے بہت محتاط رہنا چاہیے۔

شام کی چائے نظیر فاطمہ ''نیکی برباد گناہ لازم'' شکر ہے کہ ابھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو غلط اور صحیح میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ ساجدہ رمضان کا ''پناہ گزین'' حساس موضوع پر لکھی گئی دلگداز کہانی۔

منشا محسن علی کی ''طوطا کہانی'' مگر ٹھہریے پہلے یہ تو بتا لوں کہ اس سے اوپر کا خط کل کی تاریخ میں بڑی تگ و دو کے بعد وقت نکال کر لکھا تھا پھر سارہ اسکول سے آ گئی۔ خط کے چکر میں اس کے لیے ابھی تک لنچ نہیں بنایا تھا میتھی والا آٹا پڑا تھا۔ سوچا کہ اسی کا پراٹھا بنا لوں گی مگر سارہ کی فرمائش کہ میں نے تو پلاؤ کھانا ہے۔ بھاگم بھاگ چاول دھوئے، پھر ایک چولہے پہ چاول اور ایک پہ رات کے لیے سالن، چاول دم پر رکھے تھے کہ عصر کا ٹائم ہو گیا۔ نماز پڑھنے تک انسپکٹر صاحب بھی آ چکے تھے بس پھر لکھنا لکھانا بھول بھال کچھ یاد نہ رہا۔

آج بھی لاہور جانا ہے کیونکہ صبح نور کے دو پیپر ہیں PPSC کے، عرفان صاحب کی خالہ زاد کزن ہلو باجی کو اطلاع دے دی گئی کہ رات ہم آپ کے پاس رکیں گے۔ وہ تو بہت ہی خوش ہوئیں۔ لاہور آنے کا مگر انسپکٹر صاحب کا مزاج نہیں ایسا کہ کسی کو تکلیف دی جائے۔ مگر اس دھند نے رکنے پر مجبور کر دیا۔

تو آتے ہیں طوطا کہانی کی طرف، مینا کی سادگی۔ خلوص، محنت پھر ناقدری اور پھر اللہ کی نوازشات ہاشم کی بے خودی اور مینا کی خود آگہی سب بہت اچھا تھا۔ سب نے مل کر ناولٹ کو چار چاند لگا دیے۔

فرزانہ کھرل کا تو نام ہی کافی ہے مگر سچ کہوں ایک بار جلدی میں کہانی پڑھی ہے، کچھ بھید بھاؤ معلوم نہیں ہو سکا۔ اس پر تبصرہ ادھار رہا بشرط زندگی۔

ج: پیاری بہن ریحانہ! آپ کا خط اتنا دلچسپ ہے کہ پڑھتے ہوئے شاعری لگی۔ خوب صورت الفاظ کے انتخاب اور ساتھ ساتھ حقیقت پسندانہ تبصرہ بہت اچھا لگا۔

سلمٰی عمر...... جام پور

ڈائجسٹوں سے رشتہ بہت پرانا ہے۔ اتنی پرانی تو میں خود بھی نہیں شاید! اس لیے لگتا ہے روح کا رشتہ آپ مانتی ہیں اس بات کو؟ بتایئے گا ضرور کہانیاں قابل اشاعت لگیں تو چھاپ دیجیے۔

ج: پیاری سلمٰی! کافی عرصہ بعد آپ محفل میں آئیں۔ بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں یاد کیا۔ کہانی مل گئی ہے ابھی پڑھی نہیں گئی۔

ناہید اسماعیل...... کراچی

موسم سرما میں باقی موسموں کی نسبت صحت کا خیال رکھنے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے مجھے اس موسم میں استھما کی پرابلم ہو جاتی ہے۔ اور جب سے آپ نے بتایا ہے کہ اس موسم میں آپ کو کھانسی کی شکایت ہو جاتی ہے تب سے آپ کی صحت کے لیے اور بھی زیادہ دعائیں کرتی ہوں۔

ٹائٹل پر ماڈل خوب صورت تھی لیکن ڈریسنگ کچھ خاص نہیں لگی۔ ''کرن کرن روشنی'' ہمیشہ کی طرح مفید اور معلوماتی ہے۔

''کر چلے جاں نثار ہم'' سدیعہ عمیر کی تحریروں میں ایک اور منفرد شاہکار کا اضافہ ثابت ہو رہا ہے بشار کے ساتھ کیا ہوگا ہم بالکل ویسے ہی فکرمند ہیں جیسے اجالا اور مالا کے لیے تھے اب سدیعہ پر منحصر ہے کہ وہ کیا انجام کرتی ہیں۔ بہت معذرت نمرہ کا موقف اسٹرونگ نہیں لگا۔ نہ یہ

کہ قارئین لکھاریوں کو حقیقت سے دور لکھنے کا الزام دیتے ہیں میرا خیال ہے کہ ڈائجسٹ پڑھنے والی نائنٹی نائن پرسنٹ قاری بہنیں بڑی شدومد سے خوشگوار اختتام کا اصرار کرتی ہیں۔ اور کتنا اچھا ہوتا کہ وہ اس لڑکی پر لکھیں جس کو محبت کے دعوے دار نے قتل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مرنے سے بچ گئی۔

آپ نے کہا بالا نے بہت برے حالات سہے تو پیاری نمرہ ان حالات کی وجہ سے ہی تو قارئین کی خواہش تھی کہ اسے ایک اچھی زندگی ملے لیکن آپ نے اس کا برا انجام دکھا کر ان ہی لوگوں کی رائے پر مہر لگا دی جو لڑکیوں کو ہی موردالزام ٹھہراتے ہیں۔

اس کے علاوہ اہم بات یہ کہ اس کہانی کی بنیاد اور آغاز جادو اور سفلی عملیات سے ہوا۔ نگینہ سرکار، عالیان اور کبیرہ بیگم کے کردار پورے ناول میں یہی موضوع لے کر چلے۔ اگر موضوع یہ نہیں تھا بلکہ ایک ٹاکسک رشتے میں پھنسی لڑکی کی زندگی کا ٹاپک تھا ٹاکسک رشتے سے نجات ہی اس کی پہلی اینڈنگ تھی تب تو اسے ہرگز مرنا نہیں چاہیے تھا بلکہ اچھے کیریئر اور بیٹے کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزارتے دکھانا چاہیے تھا۔ ہم چاہنے کے باوجود اپنی پیاری اور باکمال رائٹر سے ناراض نہیں ہو پا رہے، نمرہ آپ ہمیں عزیز ہیں اور ہمیشہ دعاؤں میں بھی ہیں۔

بالآخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور فرزانہ کھرل کی خوب صورت تحریر پڑھنے کو ملی جس نے اپنا سماں باندھا کہ ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر اوہ سوری بے خبر تو ہم رہتے ہی ہیں، اصل میں تو غافل ہوئے۔ جمال اور زارا کی کہانی نے دل گداز کیا۔ ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا ہونے کے باوجود اظہار نہ کر سکے اور غلط فہمی دور کرنے کی عادت نے ان دونوں کی زندگیوں میں کچھ بھی نارمل نہ رہنے دیا وقار کی خودغرضی نے دو زندگیاں اجاڑ ڈالیں مزید اپنے سگے بیٹے کی خوشیوں کے بھی درپے تھا ماہ رو نے اپنے بڑوں کی غلطیوں سے سبق لیا اور خود کو مضبوط ثابت کیا کاتب کے دل کی مکیں ماہ رو ہی تھی شاید مصلحتاً اس نے فرمانبرداری کی انتہا کی ہوئی تھی لیکن شکر ہے درست فیصلہ کرنے کا موقع اسے مل ہی گیا۔ دل کو چھو جانے والی تشبیہات اور خوب صورت ترین جملے پوری تحریر پر حصار باندھے رہے اور ہم اس حصار میں اب تک مقید ہیں۔

راشدہ رفعت کا نام فہرست میں دیکھتے ہی لبوں پر مسکراہٹ اور دل میں سکون چھا جاتا ہے دقیانوسی سوچ اور اصلیت جانے بغیر نتائج نکالنے کے نقصان کی طرف توجہ دلائی گئی جو بلاشبہ ہمارے مذہب کی بھی تعلیم ہے۔

حنا جاوید رائٹر کی لسٹ میں ایک زبردست اضافہ ثابت ہو رہی ہیں۔ سنبھل جاؤ کی نازیہ کئی مقامات پر درست تھی پر اس کی ضد اور بے لچک اصولوں نے اس کو تنہا کر دیا۔

طوطا کہانی اچھی لگی ہائے دادے نشا محسن کی کہانیوں کے گھروں میں چھپکلیوں کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ حمیرا شفیع حسب روایت ہلکی پھلکی ہنستی مسکراتی تحریر لائیں، سچی مزہ آ گیا۔ مزید مسکراہٹیں بکھیریں فرحانہ مہناز کے انے ٹی ایم نے، واہ ری معصومیت۔ فرحانہ اور حمیرا آپ دونوں ہر ماہ ایسی تحریریں لکھا کریں پلیز کہ زندگی میں مسکراہٹوں کی خاصی کمی ہوتی جا رہی ہے۔

''شام کی چائے'' سبق آموز تحریر تھی۔ پناہ گزین نے خاصا افسردہ کیا اپنی ممتا ٹھنڈی کرنے کی خواہش میں کسی کی اولاد گود لینا پھر اپنی اولاد ہوتے ہی اس بچے کے لیے جس نے ایک عرصہ ان کی محرومی دور کی تسکین دی اس کے لیے ان کی ممتا اتنی سرد کیوں پڑ جاتی ہے۔

پیاری صدف پلیز مجھے استاد نہ کہیں سچ وہ مذاق تھا اور آپ خود ماشاءاللہ زبردست لکھتی ہیں ہم کہاں کے استاذ۔

صائمہ نور کے انٹرویو کا دوسرا حصہ بھی دل کو خوب بھایا۔ سچ بتاؤں تو مجھے اپنی تمام رائٹرز دنیا سے بالکل الگ لگتی ہیں۔ میں اکثر خوابوں میں ڈائجسٹ کے آفس کا دورہ کرتی آپ سب سے ملتی ہوں اور آنکھ کھلنے کے بعد مسکراتی ہوں۔ نفسیاتی الجھنیں میں دونوں بہنوں کو عدنان بھیا نے مناسب ترین مشوروں سے نوازا۔ اللہ دونوں کو آسانیاں اور عدنان بھیا کو اجر عظیم عطا فرمائے آمین۔

نظمیں غزلیں میں فرخندہ سلیم کی نظم بہت اچھی لگی۔ فرخندہ، اور کتنی خوبیاں اپنے اندر سموئی ہوئی ہیں

digest library.com

آپ نے۔

ج: پیاری ناہید! خوابوں میں کیوں آپ تو کراچی میں رہتی ہیں جب چاہیں آفس میں آ کر مل سکتی ہیں۔ ذہین اور حساس لوگ تو ہمیں بہت اچھے لگتے ہیں۔ آپ سے مل کر ہمیں خوشی ہوگی۔

زندگی کی پریشانیاں اور آزمائشیں کہاں ختم ہوتی ہیں زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ کچھ خوش نصیب لوگ ہی ان سے محفوظ رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی پریشانیاں دور کرے اور آپ کو ڈھیر ساری خوشیوں سے نوازے۔ آپ ہماری دعاؤں میں شامل ہیں۔ آمین

ایمن بلال......سنانواں

میں ایمن بلال، علیزہ بلال کی بڑی بہن۔ میں نے بہت بچپن سے خواتین اور شعاع ڈائجسٹ سے تعلق جوڑا۔ بڑی آپیوں اور کزنز کے ڈائجسٹ چپکے سے لے آتی اور پڑھ کر واپس رکھ آتی۔ امی کو میرا ڈائجسٹ پڑھنا پسند نہیں تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں اپنی پڑھائی پر توجہ دوں میری امی نے بہت مشکل زندگی گزاری ہے اس لیے انہیں نہ تو ہمارا کتابیں پڑھنا پسند تھا اور نہ ہی کتابوں کی باتیں۔

خیر مجھے پڑھائی میں زیادہ دلچسپی نہیں۔ اس لیے ایف ایس سی کے بعد سب کے بہت سمجھانے پر بہت مشکل سے گریجویشن کیا۔ کتابیں پڑھنے کے علاوہ مجھے جس کام میں دلچسپی تھی، وہ ہیں نت نئے ڈیزائن کے کپڑے سلائی کرنا بچپن سے ہی مشین میں گھسی رہتی اور اپنی گڑیا کے کپڑے سلائی کرتی۔

اب الحمد للہ میں بہت (مہنگی) اچھی درزن ہوں نہ صرف ہمارے گاؤں سے بلکہ دو تین قریبی گاؤں سے بھی عورتیں لڑکیاں کپڑے سلائی کرنے کے لیے بھیجتی ہیں۔ (میری تعریف کا حصہ ایڈٹ کر دینا ہے...... ہاہاہا) موبائل پر کوئی ڈیزائن بھیج دیتی ہیں اور میں ویسا ڈریس تیار کر کے دے دیتی ہوں۔

خیر یہ تو ہو گیا میرے بارے میں، رائٹرز میں نمرہ احمد، سمیرا حمید، عمیرہ احمد، سائرہ رضا، ایمل رضا، فرزانہ کھرل اور بھی جن کے نام فی الوقت میرے ذہن میں نہیں۔ سب کی میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ جنہوں نے اپنے بہت پیارے اور دل میں اتر جانے والے لفظوں سے ہماری تربیت کا آغاز کیا۔

ہماری امی بہت محنتی اور جفاکش خاتون ہیں ہماری ماں نے خود کو مار کے ہمیں پالا شاید وہ ہمت ہار جاتیں تو آج ہم نے زندگی میں جو مقام پایا ہے وہ نہ ہوتا۔ امی ہمیشہ بہت مصروف رہتی تھیں تو ایسے میں یہ ڈائجسٹ تھے جن کی روشنی میں ہم نے اپنے کردار کا تعین کیا۔ ادارہ خواتین بہت بہت شکریہ ہماری زندگیوں خوب صورت ڈگر پہ چلانے کے لیے اور اس وقت میں ہمیں امید کے دیے تھمانے کے لیے جب کبھی ہم ہمت ہارنے لگیں۔

میری چھوٹی بہن مجھے بہت عزیز ہے۔ اس کی ڈائجسٹ سے محبت مجھے اکثر حیران کر دیتی ہے۔ وہ اپنی ٹف روٹین میں ڈائجسٹ پڑھنے کے لیے ٹائم نکال کیسے لیتی ہے۔ (بی ایس نرسنگ کر رہی ہے کلاس بھی اٹینڈ کرنی ہوتی ہے اور ہسپتال میں ڈیوٹی بھی دینی ہوتی ہے۔) ایک دن بیٹھی رو رہی تھی کہ میں اس عجیب سے زمانے میں کیوں پیدا ہو گئی میں نے تو کسی اور زمانے میں پیدا ہونا تھا صرف کتابیں لکھنی تھیں کتابیں پڑھنی تھیں۔ اور مجھے دیکھو کیا کر رہی ہوں۔

ج: پیاری ایمن! آپ کا خط پڑھ کر دکھ بھی ہوا اور خوشی بھی۔ دکھ اس بات کا کہ آپ دونوں بہنیں اور ماں بہت مشکل حالات میں زندگی گزار رہی ہیں اور خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ بہت سمجھدار ہیں اور بڑی بہادری سے حالات کا مقابلہ کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی میں آسانیاں اور آسائشیں عطا فرمائے۔ آمین علیزہ کا افسانہ مل گیا ہے۔ ابھی پڑھا نہیں گیا۔

انکا عباسی......حیدر آباد

اف یہ آتی سردیاں اور بخار نے وہ دھمال لگائی کہ دس دن بستر چھوڑنے کا من ہی نہیں کیا۔ اس لیے ایک مہینہ خط لکھنے میں تاخیر ہو گئی لیکن میں سوچ رہی تھی کہ خواتین میں خط کے ذریعے شمولیت کرنے والی سب بہنیں کتنی بے مروت ہیں کہ کبھی بھول کر بھی میرا نام لے کر یاد

بقیہ صفحہ نمبر 202 پر

حسنیٰ حسین

ابتہال

تمہیں خبر ہے؟
تمہاری ہجرت سے کیا ہوا ہے؟
ہمارے گھر کی وہ خواب گاہیں
جو سُرخ پھولوں کی بھینی خوشبو کی اوٹ لے کر
ہماری مرضی کے خواب دن رات بُن رہی تھیں
وہ بانجھ پن کے مجسم سانچوں سے
اپنی کوکھوں کو بھر چکی ہیں
وہ مر چکی ہیں!
تمہیں خبر ہے؟
ہمارے بستر، لحاف، تکیے
وہ حس کی نازک، گداز جلدوں کے نرم ریشے

digest library.com

digest library.com

تمہارے پوروں کا لمس پاکر جواں ہوئے تھے
وہ کھڑکیوں کی نفیس جالی سے چھن کے آتی
اداس مٹی سے اَٹ چکے ہیں
وہ پھٹ چکے ہیں!
تمہیں خبر ہے؟
ہمارے بیڈ پر وہ دائیں جانب
سفید ململ کی ایک چادر میں خواب لپٹا ہوا دھرا تھا
وہ خواب جس کی حسین آنکھوں میں زندگی تھی
جو سات رنگوں کی روشنی سے بھرا ہوا تھا
وہ خواب بیڈ پر پڑے ہوئے اک
نحیف چٹلے کی زرد آنکھوں سے رستے چشموں کے کھارے پانی میں بہہ گیا ہے
تمام کمرے کا فرش رنگین ہو گیا ہے!
تمہیں خبر ہے؟
کہیں سے دیمک کا ایک کیڑا بھی
اپنے کمرے میں آ گیا تھا

مصوری کے ہنر سے واقف،
عجیب فنکار جانور تھا

مجسم بادل تنے ہوئے ہیں
ہوا ابھی بارش کی نرم بوندیں
اُٹھا کے اِٹھلاتی پھر رہی ہے
وہیں درختوں کے پاس اِک شخص،
ٹھٹھرتے ہاتھوں میں چھتری لے کر
کسی کے آنے کا منتظر ہے!
تمہیں خبر ہے؟..................
بہار موسم میں آسماں پر
جو بکھرے رنگوں کی روشنی سے
شمالی دیوار کی جبیں پر
عجیب دلکش سی پینٹنگ بھی بنا گیا ہے
وہ پینٹنگ ہے یا زندگی کا وہ زائچہ ہے!
کہ جس میں ہے اِک رواں سڑک
اور اس کے دونوں طرف درختوں کی
لمبی لائن بھی چل رہی ہے

☆☆☆

وادی ہرناٸی پر سناٹے چھائے ہوئے تھے، جنگل تاریک اور ویران ہو چکا تھا، فارم ہاؤسز، گیسٹ ہاؤسز اور عالیشان بنگلوں کی روشنیاں مدھم پڑ چکی تھیں۔ تاہم ایک گھر ایسا تھا جس کی رنگین بتیوں میں ابھی بھی ہلچل تھی، اور وہی ہلچل اس کے دل میں بھی ہونے لگی تھی۔

کمرہ ویران تھا، رائٹنگ ٹیبل پر وہ نہیں تھی، عجلت میں قدم اٹھاتے وہ باہر آئی تھی، راہداری کے دروازے پر رک کر اس نے سامنے دیکھا تھا۔

فضا میں عود کی خوشبو بسی تھی۔ گھر کا مرکزی ہال بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ پھول دار لڑیاں تھیں، بیلیں اور جھڑیاں تھیں۔ سنہری بتیوں میں جگنوؤں کا گمان ہوتا تھا۔ کہیں خالی گلاس رکھے تھے، کہیں پلیٹ میں ادھ کھائی ہوئی مٹھائیوں کے ٹکڑے تھے۔ سفید ٹائلز پر گلاب کی پنکھڑیاں تھیں۔ زندگی کے آثار یہاں وہاں بکھرے تھے۔ پھر بھی ایک خاموشی تھی اور خوفناک سا سناٹا تھا۔ اس سناٹے سے اس کا دل دھڑکا تھا۔ جلتے بجھتے دیوں میں کہیں دھواں سا اٹھ رہا تھا۔ شاید کہیں آگ جل رہی تھی۔ وہ آگ اس کے اندر بھی اٹھ رہی تھی۔ وہ اسے تہہ در تہہ عرق آلود کر رہی تھی۔ متلاشی نگاہوں میں ایک کرب سا تھا۔ شدید غصہ اور غم سا تھا۔ تاہم لب بھینچے ہوئے تھے۔ جیسے بہت سی چیخوں کو دبائے ہوئے ہوں۔ جیسے بے بسی کے اس خوف میں اندر کہیں ٹھہرائے ہوئے ہوں۔ متلاشی نگاہیں یہاں وہاں بھٹکنے لگیں۔ وہ قدم اٹھاتی گئی۔ دروازے کھولتی گئی۔ اسے ڈھونڈتی گئی۔

وہ کہیں نہ تھی۔ نہ اپنے کمرے میں... نہ اس گھر کے کسی کمرے میں۔

اس کے وجود پر کپکپاہٹ طاری ہوئی۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے آخری کمرے کا دروازہ بجایا۔

''آجاؤ!'' حکم ملتے ہی وہ پھولے تنفس کے ساتھ اندر آئی تھی۔

digest library.com

"مجھے اجیال نہیں مل رہی......" لفظ ایک دم سے ختم ہو گئے۔ آواز پل بھر میں ساکت ہو گئی۔ عصمت بیگم کے تخت پر، ان کے برابر میں اجیال شاہ زیب بیٹھی تھی۔ خاموش، بے تاثر سا چہرہ تھا۔ آنکھوں میں سرد مہری تھی۔ لبوں پر قفل ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں گلابی جوڑا تھا۔ اور سنہری کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ میچنگ جیولری اور چمکتے سینڈلز تھے۔ گفٹ کی طرح پیک کیا ہوا سامان کھلا پڑا تھا۔

"یہ ہمارے کمرے میں آنے کا کون سا طریقہ ہے؟" عصمت بیگم برہم ہوئیں۔

آتش دان کی جلتی ہوئی آگ میں اسے اپنا وجود ایک دم سے جھلستا ہوا محسوس ہوا۔ فضا میں جو خنکی ٹھہری تھی ختم ہو گئی۔ پیشانی پر قطرے نمودار ہوئے۔ حبس شدید ہونے لگا۔

"ہالہ!" اس کے لب ہلے۔

"ہم ابھی بات کر رہے ہیں۔ تم جا سکتی ہو!"

اس نے سنا۔ اور سن کر کھڑی رہی۔ قوت سماعت سے محروم نہ تھی۔ قوت گویائی سے محروم نظر آئی۔ اس کی آنکھیں اجیال شاہ زیب پر ٹھہری رہیں۔ کچھ صدمہ تھا، کچھ دکھ، کچھ بے یقینی...... وہ ایسا کیسے کر سکتی ہے؟ اس طرح ان کے بلاوے پر، ان کے پاس کیسے جا سکتی ہے؟

"میرال!" عصمت بیگم کی آواز کاٹ دار ہوئی۔ آج سے پہلے انہوں نے کبھی بھی اجیال شاہ زیب کو نہیں بلایا تھا۔ نہ کبھی کوئی بات کی تھی۔ نہ کوئی تحفہ عنایت کیا تھا۔ نہ محبت میں کوئی حصہ رکھا تھا۔ ورنہ وہ پہلے سے ٹوکتی، پہلے سے کوئی حد وضع کرتی، کوئی اصول نافذ ٹھہراتی... مگر اس طرح... اچانک......

اس کا سر نفی میں ہلا۔

اس نے اجیال کی گود سے وہ گلابی جوڑا ہٹا دیا۔ چوڑیاں نیچے گر گئیں۔ جیولری کا سیٹ بھی لڑھک گیا۔ بازو سے پکڑ کر اس نے جھٹکے سے اسے کھڑا کیا۔

"میرال!" عصمت بیگم غیض و غضب میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "ہم تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتے، ابھی اور اسی وقت ہمارے کمرے سے نکل جاؤ۔"

ان کا ہر کام مستعدی اور تابعداری سے کرنے والی میرال اسفند نے آنکھوں میں کرب لیے ان کی طرف دیکھا۔

"ہالہ کے لیے مجھے کسی اجازت کی ضرورت نہیں۔" اتنی ہی سختی سے اس نے اجیال کا بازو دبوچ لیا تھا۔

عصمت بیگم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ پہلی بار ان کا حکم نظر انداز ہوا تھا، پہلی بار ان کی بات ٹالی گئی تھی۔

"تمہاری یہ جرأت!" وہ بھڑک اٹھیں۔ میرال اسفند ان کی خدمت گار... جس کی حیثیت اس گھر میں کسی نوکر سے کم نہ تھی۔ جو ان کے ٹکڑوں پر پلتی تھی۔ اور ان کا ہر حکم مانتی تھی۔ اس عورت کا ایسا روپ اور ایسا ردعمل انہیں آپے سے باہر کر گیا۔ چٹاخ کی آواز کے ساتھ ایک تھپڑ اسے پڑا۔ یہ تھپڑ اسے پندرہ سال پہلے بھی پڑا تھا۔ اس وقت وہ بے بس تھی، چپ چاپ سہہ گئی۔ آج وہ اتنا بے بس ہوئی کہ بول پڑی۔

"خدا کے لیے صرف مجھ تک رہیں۔ ہالہ تک مت جائیں۔" بہت ضبط سے، لب بھینچ کر پست آواز میں بولی۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو چکی تھیں۔ اس کا صبر ختم ہو رہا تھا۔ جانتی تھی یہ سب کس لیے تھا۔ کس کی وجہ سے تھا۔

"فیصلہ ہو چکا ہے۔ ہم نے ہاں کہہ دی ہے۔" عصمت بیگم نے غیض و غضب کے عالم میں ایک ایک لفظ چبا کر ادا کیا۔

"جبرین کی رخصتی کے بعد ہم اس کا نکاح کریں گے!" اب کے پتھر ہونے کی باری اجیال شاہ زیب کی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ چودہ سال کی بچی ہے یہ!" میرال کرب کے عالم میں چیخ پڑی۔

"تمہاری بچی ہے یہ!" آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر وہ بولیں۔ "تمہارا خون ہے اس کی رگوں میں۔ تمہاری

طرح یہ بھی ہمیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گی!"

ابہتال سکتے کی حالت میں گنگ عصمت بیگم کو دیکھ رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے پاس بٹھایا تو اس نے سمجھا محبت میں بٹھایا ہوگا۔ بیش قیمت جیولری اور قیمتی جوڑا بھی اپنے تلخ رویے کی تلافی کے لیے خریدا ہوگا۔ مگر اس کی تمام خوش فہمیوں کو ایک دم سے آگ لگ گئی تھی۔ تمام امیدوں پر پانی پھر گیا تھا۔

"میں نے شاہ زیب کی مرضی سے رشتے کی بات کی ہے!"

وہ اپنے اس بیٹے کا حوالہ دے رہی تھیں جو ابہتال کی زندگی میں کہیں نہیں تھا۔

"آپ کے ہر فیصلے کو میں رد کرتی ہوں!!" کس قدر ہمت کے ساتھ اس نے کہہ دیا۔

"عزت سے نکاح کا موقع مل رہا ہے اور تم اسے گنوا رہی ہو؟"

"زندگی میں عزت نہیں، نکاح سے مل جائے گی؟"

عصمت بیگم نے غضب ناک نگاہوں سے میرال اسفند کو دیکھا۔ ابہتال کو اپنے پیچھے کیے وہ کوئی اور ہی میرال لگ رہی تھی...

"ثمرہ تمہارے متعلق ٹھیک ہی کہتی ہے! دو روپ ہیں تمہارے، معصومیت کا تو صرف ڈھونگ ہی رچاتی ہو!"

میرال چپ رہی۔ عصمت بیگم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"یہ لڑکی تمہارے ہر گناہ کا حساب بنے گی۔ یہ بھی وہی کرے گی جو تم نے کیا!"

ابہتال کی نگاہیں عصمت بیگم کے چہرے پر جمی تھیں، وہ انہیں دیکھ رہی تھی، انہیں سن رہی تھی، خوش گمانی کی عمارت زمین بوس ہو چکی تھی، تحائف نے جو دل نرم کیا، وہ مزید پتھر ہو چکا تھا۔

"جیسا تمہارا کردار ہے... اسے کون بیاہے گا؟!" وہ آخری سوال گویا سوال نہیں، ایک خنجر تھا جو میرال اسفند کے دل میں اتر گیا۔

کس قدر کرب سے لب بھینچ کر میرال نے صبر کا گھونٹ بھر لیا۔ کہنے کو بہت کچھ تھا۔ پر کہہ نہ پائی۔ ابہتال کا ہاتھ تھامے کمرے سے نکل گئی۔ سمیر سیڑھیاں اتر کر نیچے آ رہا تھا۔ ان پر نظر پڑتے ہی رک گیا۔ ابہتال کی نگاہیں بے جان سی تھیں۔ وہ میرال اسفند کے ساتھ کسی کٹھ پتلی کی طرح کھنچی جا رہی تھی۔ وسیع کچن کا عقبی دروازہ کھول کر اس نے برابر والے کمرے میں ابہتال کو اندر داخل کیا۔

"جب میں نے تمہیں منع کیا تھا گھر کے کسی فرد کے سامنے مت آؤ تو تم کیوں آئیں!" دروازہ بند کر کے وہ بولی تو لہجہ سخت اور آواز بھیگی ہوئی تھی۔ "میں آل ریڈی بہت پریشان ہوں ہالہ کیوں تم اس طرح......"

اور ہالہ بتا نہیں سکی وہ اسے تنگ کرنے کی غرض سے نہیں گئی تھی، اس کے ذہن میں کوئی منصوبہ نہیں تھا، نہ بدلے یا انتقام کا کوئی جذبہ تھا۔

دل کی حقیقت محض دل تک تھی، اور صدمہ آنسوؤں میں مدغم رہا۔ وہ چپ چاپ میرال کو دیکھے گئی۔

جانے کتنے طعنے تھے جو میرال کے حوالے سے اسے روزانہ سننے پڑتے تھے۔ اور جانے کتنے بہتان اور الزام تھے جو اب اس کے وجود کا احاطہ کرنے والے تھے۔

"آئندہ وہ تمہیں اپنے پاس بلائیں یا کسی سے ملوانے کی کوشش کریں تو تم نہیں جاؤ گی!" میرال نے کہہ دیا۔ اس نے سن لیا۔

"جیسا تمہارا کردار ہے... اسے کون بیاہے گا!" عصمت بیگم کے الفاظ سماعت میں ہتھوڑے کی طرح لگے۔ اس نے سر اٹھا کر میرال کو دیکھا جو آنسو پونچھتی، لحاف اوڑھے سونے کے لیے لیٹ چکی تھی۔ پھر اس نے اپنی ہتھیلیوں کو دیکھا جن پر کوئی نقش نہ تھا۔ حالانکہ آج گھر کی تمام لڑکیوں نے مہندی لگائی

digest.library.com

تھی۔ اور کلائیاں بھر بھر چوڑیاں پہنی تھیں۔ مگر اس کی کلائیاں خالی تھیں اور لباس بالکل سادہ سا تھا۔ درفشاں نے یہ لباس پچھلی سردیوں میں پہنا تھا۔ ابتہال شاہ زیب ان سردیوں میں پہن رہی تھی۔

میرال کو کھلکھی تائی کی اترن ملتی تھی تو اسے درفشاں کی۔ اس نے اٹھ کر خود کو آئینے میں دیکھا۔ عصمت بیگم کہہ رہی تھیں، وہ میرال جیسی تھی، اور اسے لگا وہ میرال جیسی ہی ہے۔ لباس، حلیے، انداز اور چہرے کے خدوخال میں بھی۔ وہ میرال اسفند کا پرتو بنتی جا رہی تھی۔

اس کے ذہن میں بیک وقت کئی سوال اٹھے، کئی خیال جاگے۔ اور وہ دم سادھے اپنا عکس دیکھتی رہی۔ وہ عکس جو حصوں میں، ٹکڑوں میں، اور کرچیوں میں بٹا ہوا تھا۔

digest library.com

☆☆☆

تاریک کمرے کے درودیوار پر دھرے سناٹوں کا طلسم بجلی کی کڑک سے پاش پاش ہوا تھا، بارش کی بوچھاڑ طوفانی ہواؤں کا اثر لیے قصر جلال کی عمارت سے آ ٹکرائی تھی۔

"میں......اور صرف تم......" تاریکی میں ہاتھ روشن ہوا، انگلی اس کی طرف اٹھی، جسم پوشیدہ، چہرہ غائب رہا۔ "تم نہیں......تو کچھ نہیں!"

اس کے ساکن وجود میں یکایک جنبش ہوئی تھی، ڈوبتی ابھرتی سانسوں کا وزن اس کے سینے پر آ ٹھہرا تھا۔ احساسات کی ہر حد اب خوف سے جڑ چکی تھی۔

"میرا سب تم پر شروع تم پر ختم!"

وادی دواریان سے نیچے سبزہ زاروں سے ہوتے ہوئے وہ طوفان دریائے نیلم کے ساکت پانیوں میں اترنے لگا تھا، لہریں بھنور بنانے لگی تھیں، پانی اچھل اچھل کر زمین سے لپٹنے لگا تھا۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو اٹھ نہ سکا۔ کہنی کے بل اوپر ہوا تو سائیڈ ٹیبل کا لیمپ لڑھک گیا۔ پسینے سے تر وجود لیے وہ کس قدر کوشش سے اٹھ کھڑا ہوا۔

آواز سماعت میں، اور دھند بصیرت میں ٹھہر گئی۔

کہیں پر لڑکھڑاتے، کہیں پر پاؤں جماتے وہ بیڈروم سے باہر آ گیا۔

طویل راہداری ہلنے لگی، چمک دار ٹائلز ٹوٹنے لگے، دیوار گیر پینٹنگز کے سارے رنگ فریم سے نکل کر اس کے اطراف میں پھیل گئے۔

ہر رنگ میں ایک راز، ایک سیاہی، ایک منظر پوشیدہ تھا۔ وہ قدم اٹھانے لگا تو اسے لگا پاؤں تلے اب زمین نہیں ہے، وہ فضا میں کہیں معلق ہو رہا ہے، یا بحر بے کراں میں اترتا جا رہا ہے!!

"ارباز!" بمشکل آواز دیتے وہ پوری قوت سے آگے بڑھا، دماغ کا اپنا ایک جال تھا، وہ اس جال میں اب الجھنے لگا تھا۔

"ارباز......!" دوسری آواز پر قدموں کی چاپ ابھری

اس نے کھڑے کھڑے گھوم کر چاروں طرف دیکھا۔

اونچی سیلنگ اب نیچے آ رہی تھی، کرسٹل ٹوٹ رہے تھے، کھڑکیوں کے اس پار طوفان ایک بار پھر شدت سے دھاڑا تھا۔

اب وہاں وہ اکیلا نہ تھا، اس کے آس پاس کئی چہرے تھے، کئی ہیولے، کئی سائے، اور کئی سرگوشیاں بھی۔

"کیا میں تمہیں جانتی ہوں؟"

وہ مٹی کا ایک خالی پتلا تھا، جس کے چہرے پر خدوخال نہ تھے، بس بال تھے، اور کھڑکھڑاہٹ تھی، جیسے پتّے کے

digest library.com

دھاگوں کو کھینچ کر ایک حرکت سی پیدا کی جا رہی ہو، جگہ اتنی ویران کہ مکڑیوں کے کئی جالے اس پر تنے ہوئے تھے۔
اس کا ذہن تاریک ہونے لگا، آنکھوں میں ویرانی اترنے لگی۔
جگہ ان جان سی...... دنیا سنسان سی... آوازیں غیر مانوس اور چہرے بے جان سے......
پیشانی پر ہاتھ رکھے اس نے تکلیف کی شدت سے سر جھٹکا۔ پلکیں جھپک جھپک کر ارتکاز پکڑا۔ پھر دیوار کا سہارا لیے سر اٹھایا۔ دھندلاہٹ ختم، آوازیں بند ہو گئیں۔
''چھوٹے مالک!'' ارباز خان کی آواز عقب میں گونجی۔ دیوار پر ہاتھ رکھے وہ اس کی طرف مڑا۔ طویل آئینے میں اس کا عکس نمایاں ہوا۔
اس کے پیروں میں جوتے نہیں تھے، اوپری وجود پر شرٹ نہیں تھی، درد چھپا ہوا تھا، زخم عیاں ہو رہے تھے۔
''کہاں مرے ہوئے تھے تم سارے کے سارے!'' آواز پھنکار سے مشابہ تھی، آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔
اس کے اور ارباز خان کے درمیان سلاخوں کی ایک طویل دیوار تھی۔
''میں معذرت چاہتا ہوں مالک!'' ارباز خان سر جھکائے مؤدب رہا۔ اس کے پیچھے کھڑا نوجوان لڑکا البتہ حیرت کا شکار لگتا تھا، قصر جلال میں وہ نیا نہیں تھا۔ مگر یہ چہرہ اس کے لیے نیا ہی تھا۔
جلال خاندان نے جانے کن وجوہات کے تحت اسے زمینی گہرائیوں میں چھپا کر رکھا ہوا تھا۔
اس کی پشت پر جا بجا کئی زخموں کے مندمل نشان تھے، گردن سے کندھوں تک، اور کندھے سے نیچے پشت تک، اور چوڑے سینے پر بھی، جیسے کسی نوکیلی شے سے چیرا گیا ہو۔
سنہری آنکھوں میں بلا کی وحشت تھی، گھنے، بکھرے، بے ترتیب بال، شیو بڑھی ہوئی، اور جبڑے بھینچے ہوئے تھے۔
آنکھوں میں حیرانی لیے وہ اسے، اور سلاخوں کی حد لیے ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ سے مشابہ اس جگہ کو دیکھے جا رہا تھا جو قصر جلال کی زمینی گہرائیوں میں بنائی گئی تھی۔ بیڈ روم، وسیع سالاؤنج اور ڈائننگ ٹیبل جس کے وسط میں شاہی کرسی رکھی تھی، دیواروں پر کھڑکیوں کا ابہام تھا، (کھڑکیاں حقیقی نہیں تھیں پروجیکٹر پر باہر کا موسم اندر دکھایا جا رہا تھا) اس پر پردے بھی لٹکائے گئے تھے۔
بڑے مالک نے آخر یہاں کسے پناہ دے رکھی ہے؟
لڑکا ہنوز گردن سیدھی رکھے سلاخوں کے اس پار کھڑا حیرت زدہ سوچے جا رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا قصر جلال ایک خفیہ دروازہ، ایک پوشیدہ راز رکھتا ہے۔
سلاخوں کی سلائڈنگ فنگر پرنٹ سے ایک جانب سرک گئی تھی، ارباز خان اندر آ چکا تھا۔ سلاخیں پھر سے برابر ہو گئیں۔
''کیا آپ ٹھیک ہیں؟'' ارباز خان نے اس کا بازو تھاما، اسے سہارا دینا چاہا۔ مگر اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پوری قوت سے وہ دو قدم آگے بڑھا، ڈائننگ ٹیبل کی کرسی کھینچی، میز پر ہاتھ رکھا، پھر بیٹھتے ہی سر اٹھایا۔
سامنے کھڑکی کے ابہام پر بارش کی بوچھاڑ تھی، طوفان میں اب شدت آ چکی تھی۔ وہ منظر حقیقی تھا جو پتھریلی دیواروں پر دکھایا جا رہا تھا۔
قصر جلال کی در و دیوار کے اس پار دھند میں گم ہوتے درختوں کی شاخیں تیز ہواؤں سے ٹوٹ رہی تھیں، پتھریلی روش پر شور تھا، فوارے پانی سے بھرے جا رہے تھے،
اور اندر......
بھاپ اڑاتا مگ اسے پیش کر دیا گیا تھا، جوتے اس کے پیروں میں رکھ دیے گئے تھے۔ ارباز ایک بار پھر

digest library.com

مخاطب ہوا تھا۔

اطراف سے یکسر بے نیاز وہ اپنے دائیں ہاتھ کو چہرے تک لے آیا تھا۔اس کا ہاتھ بھاری تھا۔اس کی آنکھوں کی دھند ایک بار پھر واپس آرہی تھی۔

''کیا آپ... میری... مدد... نہیں کر سکتے؟'' گڑیا کی گردن الگ تھی، گڑیا کا گھر بھی ٹوٹا ہوا تھا، کھلونے بکھرے پڑے تھے۔

اس نے اپنا سر میز پر رکھ دیا۔ پنکھے پھر سے متحرک ہوئے تھے، کھڑکھڑاہٹ کی آواز گویا پاس سے گونج رہی تھی۔

اس نے بارش کی بوچھاڑ میں قدموں کی چاپ سنی، سفید فراک کے دامن پر آگ کا نشان دیکھا۔ست رنگے مفلر پر اچانک خون کی دھار گری،

کچھ دیر تک وہ گہری سانسیں لیتا رہا۔ پھر آنکھیں میچ کر اپنا سر پکڑ لیا۔

''وہ آج پھر آئی ہے!''

''یہ آپ کا ابہام ہے!''

اس نے سر اٹھا کر خون سے سرخ پڑتی آنکھوں سے ارباز کو دیکھا۔''یوں کھڑے کھڑے تمہارا گلا دبا دوں تو کیا وہ بھی ابہام ہی ہوگا؟'' ارباز خان چپ ہو گیا۔

''میں آپ کے غصے کو سمجھ سکتا ہوں!''

''نہیں، تم نہیں سمجھ سکتے!'' کرسی دھکیل کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ارباز کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر دیکھا۔

''اپنے مالک سے کہو... میرا سامنا کرے!''

عقب میں کھڑے نوجوان لڑکے کی رگ و پے میں سرد لہر دوڑی۔ اس کی آنکھوں کا تاثر، لہجے کی سختی اور بھاری آواز......

''میں ضرور کہوں گا!'' ارباز کی آواز سناٹے میں گونجی۔

درد کی ایک لہر اٹھی، اس نے بے اختیار میز کا سہارا پکڑا، دوسرا ہاتھ پیشانی پر رکھا، قدموں کی چاپ ایک بار پھر ابھر رہی تھی۔

وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔اس کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی۔

اور باہر......

قصر جلال کے احاطے کے اس پار بیرونی گیٹ پر اپنے کیبن میں براجمان چوکیدار کو یکایک احساس ہوا جیسے اس کے کیبن کے باہر کوئی کھڑا ہے، اس نے سلائڈ کھینچ کر چھوٹی سی کھڑکی سے باہر جھانکا مگر اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔

سلائڈ بند کر کے وہ ہیٹر کے پاس جا بیٹھا، واکی ٹاکی پر اس نے بٹلر ارباز خان کو سب ٹھیک ہے کا سگنل بھی دے دیا۔ اطراف سے یکسر بے نیاز ہو کر اب وہ چائے پی رہا تھا۔

اس کے کیبن سے باہر، بیرونی گیٹ کے عین سامنے نسوانی ہیولا کھڑا تھا، ست رنگا مفلر ایک ہاتھ میں لیے، دوسرے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھامے ہوئے، نگاہیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ وجود بھیگا ہوا تھا۔ کیمرہ عین اوپر لگا تھا، مگر کسی بھی اسکرین پر وہ نظر نہیں آرہی تھی۔

☆☆☆

شہر کی تاریخی عمارتوں کے پیچھے لندن کا سورج غروب ہو چکا تھا، آکسفورڈ روڈ پر خوب چہل پہل اور رونق تھی، رنگین بتیوں کا اپنا ایک حسن تھا جو ہر گلی، ہر دکان اور ہر عمارت کی کھڑکیوں سے نظر آ رہا تھا۔ ہنستے مسکراتے لوگوں کے ہاتھوں میں شاپنگ بیگز تھے، خرید وفروخت کے ساتھ ساتھ آرٹ گیلیریز کو بھی وزٹ کیا جا رہا تھا، ویڈیوز بنائی جا رہی تھیں، تصویریں کھنچوائی جا رہی تھیں۔

سیاہ تھری پیس میں ملبوس، سیاہ رنگ کا لمبا کوٹ زیب تن کیے، اسی کوٹ کی جیبوں میں اپنے ہاتھ ڈالے وہ سیلفریجز کی عمارت سے باہر نکلا تھا۔

فریڈی نے اسے دور سے دیکھتے اپنا ہاتھ ہلایا۔ وہ فوراً سے بیشتر اس تک پہنچ چکا تھا اور کچھ ہی دیر میں وہ دونوں شیشے اور اسٹیل سے بنی اس جدید عمارت میں داخل ہو چکے تھے جو رات کی تاریکی میں نیون لائٹس کی لکیروں میں گھری ہوئی تھی۔ عمارت کی بلندیوں پر بڑا بڑا VON لکھا تھا۔

داخلہ ایک وسیع ہال پر مشتمل تھا جس کے اطراف میں زجاجی (شیشے سے بنی) دیواریں تھیں، ان ہی دیواروں سے باہر کا ہر منظر دکھتا تھا۔

اندر ہوٹل کا عملہ خاموشی واحترام کے ساتھ مہمانوں کا استقبال کر رہا تھا۔ سوٹڈ بوٹڈ دو نوجوان اپنے ایئر پیس سے کچھ سنتے تیزی سے اس کے پیچھے آئے مگر فریڈی نے انہیں ہاتھ سے روک دیا۔

ایلویٹر کے دروازے کھل چکے تھے، بارہویں منزل تک پہنچتے انہیں چند لمحے ہی لگے۔

"سر! آپ کے لیے کسی نے تحفہ بھیجا ہے!"

راہداری سے گزر کر اپنے سوئیٹ کی طرف جاتے اس کی رفتار سست پڑی۔

"میں نے آپ کے کمرے میں رکھوا دیا ہے!!"

فریڈی پیچھے ہٹ گیا تھا۔ لفٹ کے دروازے برابر ہو گئے تھے۔

پاس ورڈ سے لاک کوڈ کھولتے وہ اندر داخل ہوا تھا۔ سوئیٹ کی نیم تاریکی میں پراسراریت کی روشنی ٹھہری تھی، زرکار اور مدھم سی....... اعصاب پر بھاری اور بوجھل پڑتی ہوئی۔

"خوش آمدید مالک!" کمپیوٹرائزڈ آواز چہار سو گونجی۔ ایک ہی پل میں پورا سوئیٹ روشن ہو گیا۔

اس کی نگاہیں بھٹکتی ہوئی سینٹرل ٹیبل پر جا ٹھہریں جس پر سیاہ ووڈن فریم نما باکس رکھا تھا، اپنی جیبوں سے ہاتھ نکالے وہ دھیمی چال چلتا میز کے پاس آ رکا۔

چہرے کے تاثرات میں سنجیدگی لیے اس نے اپنی سرمئی آنکھوں میں کئی سوال ٹھہرا لیے۔

باکس کے اطراف میں ہک لگے ہوئے تھے، اس نے ہک ہٹا کر کور اٹھایا۔

باکس کے اندر برطانیہ کی ملکہ ایلنور کا تصوراتی پورٹریٹ رکھا تھا جسے فریڈریک سینڈیز نے 1858 میں بنایا تھا۔

ایک ہاتھ میں چاقو، دوسرے ہاتھ میں پیالہ لیے، سر پر تاج پہنے ملکہ ایلنور اپنے چہرے کے تاثرات میں پوشیدہ حکایتوں کا اثر لیے مشرقی سمت دیکھ رہی تھی۔

پورٹریٹ کو بغور دیکھتے اپنے آپ میں وہ ایک پل کے لیے پتھر ہوا تھا۔

ایک اور تحفہ......

یعنی ایک اور تنبیہ....

اس کی بھنویں سکڑ گئیں۔ چہرے کے تاثرات میں سختی در آئی۔

اس نے وہ پورٹریٹ پلٹ کر۔

digest library.com

عقبی سائڈ پر Guildford کا نام لکھا تھا۔
اس کی بھنویں سکڑ گئیں۔
یہ لندن کا وہ شہر تھا جسے گزشتہ ہفتے اس نے وزٹ کیا تھا۔
اپنے اعصاب کو قابو رکھتے وہ سنگل صوفے پر ٹانگ جمائے اب بیٹھ گیا تھا۔ صوفے کے ساتھ پشت لگائے، ہتھوں پر اپنے دونوں بازو رکھے وہ انتہائی سنجیدگی سے اب سامنے دیکھنے لگا تھا۔
ملکہ الینور کا ساکت پورٹریٹ ہنوز پڑا رہا۔ چاقو کی چمک ویسی ہی رہی، پیالہ مشروب سے بھرا رہا۔
تنبیہ وہی جو دی جا چکی تھی، پیغام وہی جو پہنچا دیا گیا تھا۔
اس کی سرمئی آنکھوں میں وحشت کا تاثر ٹھہرا ہوا۔
رات کی تاریکی پہلے اس کی آنکھوں میں اتری، پھر اس کے دل میں آکر ٹھہر گئی تھی۔

☆☆☆

صباحت بیگم کرسی پر براجمان تھیں۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی اور کھڑکیوں کے تمام پردے سمٹے ہوئے تھے، جو روشنی اندر آ رہی تھی، وہ ان کی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ ان کے عقب میں دروازہ کھلا ہوا تھا۔ راہداری میں ننھی بچیوں کے بھاگنے دوڑنے اور معصوم قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ انہوں نے گردن موڑ کر سامنے لاؤنج کی طرف دیکھا۔
نازیہ وہیں بیٹھی تھی۔ شجاع سے انتہائی سنجیدگی سے بات کرتی ہوئی۔ ڈائری ہاتھ میں تھی، وہ کچھ لکھ رہی تھی۔ اس کے میکے میں تایا زاد کی شادی کی سو تیاریاں جاری تھیں۔ میز پر اور صوفے پر بھی کچھ زرق برق لباس رکھے تھے۔ کچھ فراک ہینگر میں لگے تھے جنہیں وہ اب شجاع کو دکھا رہی تھی۔
لاؤنج میں اتنے رنگ تھے کہ سفید اور سیاہ کا تاثر ان کے کمرے سے ان کے وجود کے اندر تک آ گیا۔
"ماما! مجھے ریڈ کلر پسند ہے، میں ریڈ فراک لوں گی!" سات سالہ زینب بھاگتی ہوئی ماں کے پاس آئی تھی۔
نازیہ کا لایا ہوا نیلا سوٹ اس نے وہیں کھڑے رد کر دیا تھا۔
"امی! مجھے سرخ رنگ پسند ہے!" کوئی بھولی بسری یاد ذہن کے کسی گوشے سے نکل کر آنکھوں میں آ ٹھہری۔ خیال سے حقیقت میں ڈھلتا ایک وجود ان کے سامنے آ گیا۔ پل بھر میں منظر بدلا اور الماری کھل گئی۔
ایک ہی رنگ کے سادہ اور پھیکے کپڑوں کا ڈھیر دکھائی دینے لگا۔
"میرے لیے چوڑیاں!" لفظ وہیں ٹھہر گئے۔ فضا میں۔
وہ جملہ کبھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ ہو ہی نہیں سکا تھا۔
انہوں نے کچھ بے قراری سے پہلو بدلا۔ آنکھیں مسلیں۔
"میں سوچ رہی ہوں، بچیوں کو کل پارک لے جاؤں۔ ذرا گھوم پھر لیں گی۔ آؤٹنگ بھی ہو جائے گی۔"
نازیہ شجاع سے اب کچھ اور کہہ رہی تھی۔ اثبات میں سر ہلاتے اس نے اجازت دی تھی۔
منظر پھر سے بدل گیا تھا۔
کتابوں کے ڈھیر میں بیٹھی ہوئی وہ لڑکی سر اٹھائے انہیں دیکھنے لگی۔ کچھ حیرت سے۔ بے یقینی سے۔
صباحت بیگم کے گھر میں ایسے رنگ، ایسی باتیں، ایسے قہقہے اور خوشیاں؟
"تم چلی کیوں نہیں جاتیں؟" ان کے لب ہلے۔
"کہاں جاؤں؟" اس نے پوچھا تھا۔
وہ دم سادھے اسے دیکھے گئیں۔ سر اٹھائے وہ دھان پان سی چودہ سالہ لڑکی ان پر نظریں جمائے کتاب پر

قلم گھسیٹ رہی تھی۔

''امی! میں کہاں جاؤں؟''

وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔شجاع نے سر اٹھاتے انہیں دیکھا۔

تسبیح ان کے ہاتھ میں تھی، دوپٹہ سر سے ڈھلک گیا تھا۔انہیں لگا کوئی دروازہ دھڑدھڑائے جارہا ہے، اور گڑگڑائے جارہا ہے۔

وہ لاؤنج سے دروازے کھولے باہر لان میں آگئیں۔انہوں نے باہر والا گیٹ کھول دیا۔

شجاع ان کے پیچھے باہر آگیا تھا۔

''کیا ہوا؟''

انہوں نے چونک کر اسے دیکھا پھر باہر نگاہ دوڑائی۔جیسے وہ تسلی کرنا چاہتی ہوں کہ کوئی ہے تو نہیں۔

شجاع نے ان کا ہاتھ تھاما اور انہیں اندر لے آیا۔

نازیہ سب چھوڑ چھاڑ ان کے پاس آگئی تھی۔ان کی نگاہ میز پر دھری مہندی، چوڑیوں کے سیٹ اور خوبصورت سینڈلز پر ٹھہر گئیں جو نازیہ کل رات شاپنگ کرکے لائی تھی۔

''دادو! آج آپا آئیں گی تو ہم اس سے مہندی لگوائیں گے، اچھی لگے گی نا؟'' وہ صوفے پر بیٹھ چکی تھیں اور بچیاں ان کے آگے پیچھے پھرتی شور مچارہی تھیں۔ان کی آواز میں دبا دبا سا جوش تھا۔اور آنکھوں میں خوشیوں کے رنگ تھے۔

''ہماری دادو اچھی ہیں، بالکل نہیں ڈانٹتیں، زہرہ کی دادو اس کی پٹائی کرتی ہیں!!'' ننھی شفا باپ کو بتارہی تھی۔

صباحت بیگم اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔شجاع نے بہت خاموشی کے ساتھ انہیں دور تک جاتے دیکھا تھا۔

☆☆☆

ساری رات برسنے والی بارش علی الصبح ختم ہو چکی تھی۔وادی ہرنائی کا آسمان صاف ہو چکا تھا۔مگر دھند ٹھہری رہی تھی۔

زمان ہاؤس میں ہنوز خاموشیوں کا راج تھا، صرف ملازم ہی بیدار تھے۔اور ان ہی ملازموں میں ایک وہ بھی تھی جو معمول کی طرح روزمرہ کی روٹین میں شامل ہو چکی تھی، گھر کے ہر فرد کا ناشتا الگ اور دوسرے سے مختلف بنتا تھا۔کچن میں آج خانساماں نہ تھا۔وہ اکیلی لگی رہی۔ناشتا بنا بنا کر میز پر لگاتی رہی۔عصمت بیگم صدر کرسی پر براجمان حکم پر حکم صادر کرتی رہیں۔چائے انہوں نے جانے کس کدورت کی وجہ سے دوبار بنوائی۔کبھی ٹوسٹ جلے ہوئے لگے۔کبھی ہاف فرائی کا نمک تیز لگا۔کئی بار اسے ڈانٹ بھی پڑی۔اور کئی بار اس نے طعنے بھی سنے۔

درفشاں اپنے بھائیوں کے ساتھ اسکول جانے لگی تو اسے ایک دم سے ابجال کا خیال آیا۔کچن میں اس کا ٹفن باکس پہلے سے تیار رکھا تھا۔وہ اسے اٹھائے تیزی سے باہر نکلی۔

''ہالہ!'' وہ اس کے قریب پہنچی تو ابجال نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔''یہ تمہارا ٹفن۔''

اس کی آنکھوں میں بہت سے شکوے دھرے تھے مگر اس نے چپ چاپ ٹفن لے لیا۔

''اپنا خیال رکھنا!'' اس نے نرمی سے ابجال کے گال پر ہاتھ رکھنا چاہا جسے ابجال نے انتہائی نفرت سے جھٹک دیا۔

"میرے ساتھ یہ ناٹک مت کیا کریں!" انتہائی سرد لہجے میں کہہ کر وہ باہر نکل گئی تھی۔ اور میرال اسفند وہاں کھڑی رہ گئی تھی۔

digest library.com

☆☆☆

زمان ہاؤس سے نکلتے ہی وہ سبز قطعہ پر پاؤں دھرتی دائیں جانب مڑ گئی تھی۔ اس کے اطراف میں دور دور تک دھند پھیلی ہوئی تھی، سبزہ بکھرا ہوا تھا، کہر برس رہا تھا۔ سڑک دائیں طرف مڑی تو شارٹ کٹ راستہ اپناتے وہ پائن، چنار اور صنوبر کے درختوں سے گزرتی ایک پگڈنڈی کو پکڑ کر نیچے اترنے لگی۔ ذرا سا سفر طے کیا تو کہیں سے لیلا اور کہیں سے کشور ساتھ آملیں۔ پھر جونیئر کلاسز کی کچھ بچیاں بھی اسی راستے کو پکڑتی تھیں۔ اور ایک گروپ سا بن کر تقریباً آدھے گھنٹے کا وہ سفر طے کرتا تھا جو انہیں گل فاؤنڈیشن ویلفیئر ہائی اسکول تک پہنچا دیتا تھا۔

یہ ایبٹ آباد کے معروف سیاست دان اور بزنس مین کا رفاہی اسکول تھا۔ جو جدید سہولیات اور قابل اساتذہ کی زیر نگرانی چلتا تھا۔ اسے دو برس پہلے ہی کھولا گیا تھا۔ ہرنائی کے آس پاس کے تمام گاؤں کے بچے اسی اسکول میں پڑھتے تھے، گو کہ سفر لمبا تھا، اور اتار چڑھاؤ لیے راستے بھی مشکل، جنگل بھی گہرا۔ مگر تعلیم کی لگن، کچھ بننے کی دھن، اور ذہنی قابلیت ہر رکاوٹ کو پار کر لیتی تھی۔

گروپ میں وہ سب سے آگے ہو کر، پھر سب سے پیچھے چلتی تھی، پیروں میں آنے والی کسی کنکر، پتھر، شاخ کو ٹھوکر مارتی ہوئی۔ اس کا سر تب تک جھکا رہتا جب تک راستہ بدلنے پر نہر نہ آجاتی۔ وہ تمام بچے کچھ دیر تک سانس روک کر اس نہر کو یوں دیکھتے جیسے وہ اس کی تند و تیز لہروں میں کسی کو تلاش کر رہے ہوں۔ مگر جسے وہ ڈھونڈ رہے تھے وہ دسمبر کے سرد ترین دنوں میں ٹھٹھرتے جماتے پانیوں میں نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ خاصی تلاش بسیار کے بعد انہیں نہر کے اس پار درخت کی کسی شاخ کے ساتھ الٹا لٹکا ہوا نظر آگیا تھا۔

"راکان!" مزنہ نے لبوں کے گرد ہالا بنا کر اسے زور سے پکارا۔ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے وہ شاخ کو ٹانگوں میں پھنسائے جھولتا رہا۔ اس کا بیگ نیچے پڑا تھا، اور مفلر کے سرے سر کے برابر سے نیچے لٹک رہے تھے۔

ابجال نے گہری سانس بھر کر وہ منظر دیکھا۔

"یہ آج چمگادڑ کیوں بنا ہوا ہے؟"

"روز ہی بنتا ہے!!

"مچھلی کب بنے گا!"

"جب گرمیاں آئیں گی۔ تب!" دبی دبی سی کھلکھلاہٹیں۔

ابجال نے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے اور انہیں وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔

"راکان کیا تم ہمارے ساتھ چلو گے۔ یا ہم جائیں؟" چھوٹی بچیاں ہر روز اس کے ساتھ ریس لگاتی تھیں۔ وہ نہر کنارے اس طرف بھاگتا تھا اور یہ اس طرف۔ مگر آج جانے کیا بات تھی، وہ اپنے مراقبے سے باہر نہیں آرہا تھا۔

"راکان!" ننھی انشی زور سے چیخی۔ "ریڈی اسٹیڈی گو۔" اس کے منہ سے بھاپ نکلی۔ منتظر نگاہیں، سانس روکے ہوئے۔ کہ راکان آج کیا کرتا ہے؟

اور پھر انہوں نے اسے شاخ کو پکڑ کر قلابازی کھاتے، اور پھر پنجوں کے بل گرتے دیکھا۔ اس نے جھٹ سے بیگ پکڑا، سر اٹھایا اور پھر ہاتھ ہلایا۔

"بھاگو!" لیلا نے دونوں ہاتھ کھڑے کیے۔ اور دوڑ شروع ہو گئی۔ راستہ سیدھا اور صاف تھا۔ بہتی ہوئی نہر

کے ساتھ وہ بچے بھاگے چلے جارہے تھے اور وہ بیگ کی اسٹرپس پر گرفت جمائے کھڑی رہی تھی،

یہ دوڑ اس کی نہیں تھی، نہ ہی یہ راستہ اس کا تھا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا، گہری سانس بھری پھر قدم اٹھانے لگی۔

دور بہت دور شہر کو پل کے ذریعے پھلانگتا راکان آج پھر جیت چکا تھا۔

☆☆☆

سرزمین اٹلی پر رومانوی شہر وینس کی صبح تازگی کے ساتھ نمودار ہو چکی تھی۔ سنگ مرمر کی قدیم مگر پر رونق گلیوں میں پرندوں کی چہچہاہٹ گونج رہی تھی۔ ساحل سمندر کے پاس عالی شان عمارت کی بارہویں منزل تھی۔ اس منزل کی دیوار گیر کھڑکیوں کے سامنے اپنی کلائی موڑ کر وقت دیکھتے شاہ زیب زمان نے چائے کا گھونٹ لیا تھا۔

محبت سے اس کی پشت پر ہاتھ رکھتی انوشے برابر میں آکھڑی ہوئی تھی مگ ہاتھ میں تھا۔ سنہری ڈائی بال کھلے ہوئے تھے۔ سفید سلک کا گاؤن خوب جچ رہا تھا۔ شاہ زیب کے لبوں پر جان دار مسکراہٹ ابھر آئی۔ انوشے کو اس پل وہ مسکراتے ہوئے اپنے پہلو میں کھڑا انتہائی خوبصورت لگا۔

"چائے اچھی بنی ہے!"

"تمہارے لیے جو کچھ بناؤں... اچھا ہی بنتا ہے!"

وہ مسکرایا۔

"ماں کا فون آیا تھا۔ پاکستان آنے کا کہہ رہی ہیں!"

انوشے کی مسکراہٹ یک لخت سمٹی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر شاہ زیب کو دیکھا۔

"اس طرح اچانک!!...... خیریت ہے؟" جانے کیوں اس پل اسے سانس لینے میں دقت ہوئی۔

پاکستان کا ذکر اسے ایک خوف میں مبتلا کرتا تھا۔ اس خوف کی ایک ہیئت تھی۔ چہرہ تھا، پہچان بھی تھی۔

"عنبرین کی شادی ہے، ارسلان کا نکاح ہے، اور تمہارے بھانجے کا عقیقہ بھی تو ہے۔" اس کے تاثرات میں کوئی پوشیدہ غم نہ تھا، نہ آنکھوں میں کسی یاد کی جھلک تھی۔

"سب چاہ رہے ہیں کہ اس بار ہم ہر فیملی فنکشن میں شرکت کریں!"

انوشے نے گہری سانس لے کر خود کو سنبھالا۔ سر اٹھائے پھر شاہ زیب کو دیکھنے لگی۔

"تیاری کرو۔ اگلے ماہ کی ٹکٹس کنفرم کروالی ہیں!"

اس کا لہجہ خوش گوار تھا۔ پھر وہ کال ریسیو کرتا باہر چلا گیا۔

انوشے ریلنگ پر ہاتھ رکھے باہر دیکھنے لگی۔

اس کے عقب میں لاؤنج تھا۔ ریموٹ ہاتھ میں لیے تیرہ سالہ یمنیٰ وہیں بیٹھی تھی۔ چھوٹی آرزو، وہیں اپنے کھلونوں کے ساتھ گھوم پھر رہی تھی۔ اس کی زندگی مکمل تھی۔ شوہر کی بہترین جاب تھی، اچھا گھر تھا۔ خوبصورت بیٹیاں تھیں۔ محبوب شوہر تھا۔ سب ٹھیک تھا۔ سب اچھا تھا۔ نہ کسی شے کی کمی تھی۔ نہ کسی محرومی کا شائبہ تھا یہاں۔ نہ کسی درد کا احساس، نہ کسی خطا کی شباہت تھی۔

کہنے کو چودہ سال بیت چکے تھے، پر سوچو تو کل کی بات لگتی تھی۔ انوشے کو وہ چھ ماہ نہیں بھولتے تھے، وہ کرب بھری شامیں، اور اذیت بھرے دن ذہن سے نہ نکلتے تھے، صرف یہ تصور کہ شاہ زیب اس کا نہیں اس کی جان نکال چکا تھا۔ صرف یہ ادراک کہ وہ اس کی پسند نہیں۔ اس کی زندگی مٹا چکا تھا۔ شاہ زیب اسے نہ ملتا تو وہ مرجاتی۔ مگر قسمت کے پتوں پر زندگی لکھی تھی، محبت بھی لکھی تھی اور شادی بھی۔ وہ پتے ایک ایک کر کے اس کی جھولی میں گرتے گئے۔ سب یوں بدلا جیسے کبھی بگڑا نہ ہو۔ جیسے وہ چھ ماہ ان کے مابین کبھی آئے نہ ہوں۔ سب بھلا کر اس نے

ایک نئی شروعات کر ڈالی۔ سب اسے مل گیا۔ سب اس کا ہو گیا۔ زندگی اب مکمل تھی۔
پر جانے کیوں دل میں خوف سا تھا۔
کچھ چھن جانے کا خوف۔
اور وہ خوف ایک پل کے لیے بھی اس کے دل، ذہن اور خیال سے آزاد نہیں ہوتا تھا۔

digest library.com

☆☆☆

آفس سے واپسی پر وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو تمام بتیاں روشن تھیں۔ ڈریسنگ ٹیبل کے طویل القامت آئینے کے سامنے اپنے سیاہ لبادے کا دامن پھیلائے وہ مسکارا لگا رہی تھی۔ شاہ زل کی آمد کا اس نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا، نہ نگاہ اٹھائی، نہ سلام کا جواب دیا۔ اپنے بھرے بھرے ہونٹوں کے کٹاؤ تک لگی ہوئی سرخ لپ اسٹک پر اس نے ایک اور شیڈ کا اضافہ کیا، تا کہ وہ زیادہ ''ڈارک'' لگے۔

''کہاں جا رہی ہو؟''

فراک کا لبادہ سمیٹ کر وہ ایک ادا سے اٹھی، اسی ادا سے مڑتے ہوئے اس نے جوڑے میں مقید بالوں کو نفاست سے چھوا پھر گلے میں چمکتے سنہری نیکلس پر انگلی رکھی۔

''زارا کی انگیجمنٹ پر!''

آنکھوں میں بے یقینی لیے شاہ زل اسے دیکھ کر رہ گیا۔

''وقت دیکھا ہے؟ موسم دیکھا ہے؟''

''تم دیکھتے ہو؟ وقت بھی۔ اور موسم بھی؟''

شاہ زل کے لب بھنچ گئے۔

''تم آج کہیں نہیں جاؤ گی!'' ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے اس نے فیصلہ سنا دیا۔ بیڈ پر بیٹھتے اپنی رسٹ واچ اتاری۔

''میں نے جو کمٹمنٹ زارا کے ساتھ کر رکھی ہے، اس سے نہیں پھر سکتی!''

''اور جو کمٹمنٹ میرے ساتھ کر چکی ہو اس کا کیا؟'' اب کے سر اٹھا کر اس نے لہجے میں سختی پرو کر پوچھا تھا۔

''یہ تو تمہاری ضد ہے، ورنہ میں تو تمہیں اپنا ہر فیصلہ سنا چکی ہوں۔'' دل ربا نے ایک بار پھر اپنا موقف واضح کر دیا تھا، اس کا فیصلہ اٹل تھا۔

''کیا یہ ضروری ہے کہ ہر رات اسی طرح ہمارے درمیان بدمزگی ہو!''

''یہ بدمزگی تم چاہتے ہو، مسلسل تم ہی میرے ساتھ الجھتے ہو، میرے معاملات میں بولتے ہو!''

اب وہ بیڈ کی پائنتی کے ساتھ لگے صوفے پر ٹک گئی، جھک کر اپنے گورے پیروں کو سیاہ پنسل ہیل میں مقید کرنے لگی تھی۔ اس نے آنکھوں پر آج کوئی لینز نہ لگائے تھے، سو ان کی سیاہی میں اس کا وجود اندھیرا ہو رہا تھا۔

''یہ سب کب تک چلے گا دل ربا؟'' وہ بری طرح سے تھک چکا تھا۔

''ہمارے درمیان کیا کچھ چل بھی رہا ہے!؟'' وہ کھوکھلی سی ہنسی ہنسی۔

''میرا اگر نہیں تو ''اہل'' کا ہی خیال کر لو!'' وہ بے بسی سے گویا ہوا۔ پیار، محبت، اخلاق ہر طریقہ اپنا چکا تھا وہ۔ مگر دل ربا کا رویہ ایک سا ہی تھا۔

''اہل تمہاری خواہش ہے، اسے تم ہی دیکھو!'' جملہ ذو معنی تھا، ایک طرح کا حملہ بھی...؟ اولاد اسے کبھی نہیں چاہیے تھی۔ کبھی نہیں۔ کم از کم شاہ زل کبیر سے نہیں۔ وہ اس گھر میں اس کی زندگی سے نکلنے کے لیے ہی آئی تھی۔ گزشتہ چار سالوں سے اس کی یہ کوشش بار بار ناکام ہو رہی تھی۔ شاہ زل کبیر بار بار اس کے اشاروں کو ان دیکھا

کر رہا تھا، اس کے جھگڑے اور فساد کو ان سنا کر رہا تھا۔ اس گھر میں وہ کئی بار دردانہ کے ساتھ بدتمیزی کر چکی تھی، کئی بار ہادی اور اریبہ کے ساتھ الجھ چکی تھی،

ملازم اس کے مزاج سے عاجز تھے، پڑوسی اس کی حرکات سے تنگ۔ شاذل کی زندگی جتنی وہ مشکل بنا سکتی تھی، بنا چکی تھی۔ مگر پھر بھی۔ اس کے رویے کی تلخی، آنکھوں کی تختی اور دھتکار شاذل کبیر کو تاحال کسی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور نہ کر سکی۔

شاذل کبیر کو دل ربا سے محبت تھی، محبت بھی کیا عشق تھا اس سے۔ اس کے تصور کے بنا زندگی ادھوری۔ اس کی ذات کے بنا زندگی نامکمل تھی، وہ اسے خود سے الگ نہیں کر سکتا تھا،

دل ربا نے بیچ اپنے نفیس ہاتھوں میں دبایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میرا انتظار مت کرنا! میں دیر سے آؤں گی!" کمرے سے نکلتے وقت اس نے ایک بار بھی مڑ کر شاذل کو نہ دیکھا، اسے اس کے چہرے سے نفرت تھی، وجود سے نفرت تھی، اس محبت کے احساس سے بھی جو وہ اس سے کرتا تھا۔

یہ محبت کی زنجیر ہی تھی جس نے تاحال اسے اس رشتے میں جکڑ کر رکھا ہوا تھا، ورنہ وہ کب کا آزاد ہو چکی ہوتی۔ اس کی ہر جہد بس اس ایک جذبے کے آگے ناکام ہوئی تھی۔ نفرت کا اظہار اس کے لیے کچھ نہ تھا، بدتمیزی کا وہ کوئی نوٹس نہیں لیتا تھا، اسے اجازت تھی وہ کچھ بھی کر سکتی تھی، مگر ہر شے کی ایک حد تھی، وہ حد اس رشتے کی تھی جس کی پابند وہ نہیں رہنا چاہتی تھی۔

سیڑھیاں اترتے اس نے سوچا کل سے وہ اپنے لباس پر فوکس کرے گی۔ وہ شارٹس پہنے گی، سلیولیس بھی۔ شاذل کبیر کو وہ ایسے ہی اشتعال دلا سکتی تھی،

کبھی نہ کبھی۔ کسی نہ کسی دن تو اس کے منہ سے وہ لفظ نکلے گا جسے سننے کی خواہش دل میں لیے وہ اپنے گھر سے رخصت ہو کر یہاں آئی تھی۔

نچلی منزل روشن تھی، ملازم متحرک تھے، دردانہ کسی ملازمہ کو ڈانٹ رہی تھیں، آواز یہاں تک آ رہی تھی، اور اس آواز میں ایک آواز ——— اہل کی بھی تھی۔ وہ رو رہی تھی، اور اتنا رو رہی تھی کہ دل ربا کے کان پھٹنے لگے۔ سر دکھنے لگا۔ اسے وہ اذیت یاد آئی جو اس نے اہل کی پیدائش پر جھیلی تھی۔ وہ زخم یاد آئے جو اپنے وجود پر برتے تھے۔

"میڈم صاحبہ وہ اہل!!" ملازمہ اس پر نظر پڑتے ہی بھاگی چلی آئی تھی۔

"بھاڑ میں جائے اہل!" وہ اس پر پھٹ پڑی۔ "تم لوگوں کو میں نے یہاں کس لیے رکھا ہوا ہے؟ چھوٹی سی بچی نہیں سنبھالی جا رہی۔" اس کا خوبصورت چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔ ملازمہ سہم کر سر جھکا گئی۔ دردانہ نے تاسف بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

"زبان سنبھال کر دل ربا! بیٹی ہے تمہاری!! بھلا کوئی اپنی اولاد کے لیے بھی ایسے لفظ استعمال کرتا ہے؟"

"ہاں تو میری اولاد ہے، میری مرضی میں جو بھی بولوں۔ آپ ہوتی کون ہیں میرے معاملات میں بولنے والی؟"

دردانہ کے لب باہم پیوست رہے۔ ان کے اعصاب متحمل، ان کے انداز میں کوئی تختی نہ آئی۔ ڈرائی فروٹ کی پلیٹ سے کاجو اٹھاتے وہ ہنسی نما مسکراہٹ کو ہلکا سا دکھا کر دبا گئیں۔

دردانہ کا یہ ردعمل ہمیشہ اسے جوار بھاٹے میں کھڑا کرتا تھا۔ وہ ایسے ہی اس کے کسی نہ کسی بات پر معنی خیز مسکراہٹ دکھا کر چپ رہتی تھیں۔ ان کی خاموشی اس کے اعصاب پر بھاری پڑ جاتی۔ وہ انہیں مشتعل کرنا دیکھنا

digest library.com

چاہتی تھی۔ خواہش رہتی ان کا بھی چہرہ سرخ ہو، آواز بلند ہو۔ اپنے تلخ رویے کے بعد مقابل کے چہرے پر دکھ، درد اور غصے کے تاثرات دیکھ کر جانے کیوں اسے تسکین ملتی تھی۔ جیسے وہ اپنے حملے میں کامیاب ہوئی ہو۔ مگر دردانہ......

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''صرف تمہاری ہوتی تو کبھی نہ بولتی!! شاذل کی ہے اس لیے کہہ رہی ہوں!'' اپنے نائٹ گاؤن کی ڈوری کو باندھتے ہوئے وہ ایک بار پھر مسکرائیں اور سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئیں۔

دل ربا کا موڈ بری طرح سے غارت ہو چکا تھا۔ پاؤں پٹختی وہ صدر دروازہ عبور کر گئی تھی۔

''بھاڑ میں جائے ایل!!'' آواز بازگشت بن کر گونج رہی تھی۔ اوپری منزل کی ریلنگ پر اپنی ہتھیلیاں جمائے شاذل کبیر اپنی جگہ سن کھڑا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

زارا کی منگنی اس نے عجلت میں اٹینڈ کی تھی، اسے جانے کی جلدی تھی، بار بار موبائل پر وقت دیکھتے، میسج کرتے، وہ بے سکونی کا شکار تھی، ہر گزرتا لمحہ اس کے اعصاب پر بھاری پڑ رہا تھا۔ فیضان ہمیشہ سے وقت کا پابند رہا تھا، کسی بھی وعدے پر تاخیر اس کی جانب سے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ پر آج جانے کیا بات تھی، نہ وہ کال سن رہا تھا، نہ پیغام کا جواب دے رہا تھا۔

بوفے کے دوران کال آئی تو اس کی جان میں جان آ گئی۔

اپنا کلچ سنبھالتی، دوستوں کو خدا حافظ کہتی وہ باہر کو بھاگی۔

گاڑی سامنے ہی روڈ پر تھی، فیضان بونٹ سے ٹیک لگائے اس کا منتظر کھڑا تھا۔

چند قدم چل کر وہ رک گئی۔ بڑی بڑی آنکھوں میں خفگی سمو کر اسے گھورا۔ وہ ہنستے ہوئے اس کے پاس آ گیا۔

''سوری یار!!! اماں کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی، اس لیے دیر ہو گئی۔ ورنہ تم تو جانتی ہو، میں کبھی لیٹ نہیں ہوتا!''

''تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے، میں کتنا پریشان ہو گئی تھی۔ کم از کم کال تو اٹھا لیتے۔''

''بس مصروف تھا میں، پھر ڈرائیونگ کرتے ہوئے سوچا پہنچ کر ہی کال کروں!''

وہ اپنی خفگی کو بھلا کر اس کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو گئی۔

''ذرا سی دیر کیا ہوئی، تمہارا یہ حال ہو گیا، مجھے دیکھو، میں پچھلے چار سالوں سے تمہارے لیے خوار ہو رہا ہوں۔''

اب وہ گردن موڑے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''غور سے دیکھو جان من!! میں وہیں رہ گیا، اور تم نے شادی کر لی!''

اسٹیرنگ وہیل گھماتے ہوئے وہ گاڑی کو کچھ ہی دیر میں مرکزی شاہراہ پر لے آیا تھا۔

دل ربا کا موڈ اس آخری جملے پر بری طرح سے غارت ہوا۔

''خوشی سے نہیں کی تھی، زبردستی کروائی گئی تھی!!'' اسے آج تک اپنے مرحوم باپ پر غصہ تھا، جس نے انکار کے باوجود شاذل کے ساتھ اس کی شادی طے کر دی تھی۔

''مگر ابھی تک تم آزاد نہیں ہو سکیں اپنے گھر، تمہارے لیے اپنے گھر، اور خاندان والوں سے جنگ لڑ رہا ہوں اور تم......'' اس نے گہری سانس بھری۔ دل ربا نے تفکر کے ساتھ اسے دیکھا۔

''اماں سحر کے ساتھ میرا رشتہ طے کرنا چاہ رہی ہیں، آج بھی میری ان سے اسی ٹاپک پر اچھی خاصی بحث

ہو گئی۔"

دل ربا کے چہرے کا رنگ متغیر ہو چکا تھا، "پھر......."

"بار بار پوچھتی رہیں کسی لڑکی کو پسند کرتے ہو تو بتا دو، اسی سے شادی کروا دیتی ہوں، ورنہ پھر مر ...... بہت مشکل سے انہیں راضی کیا ہے کہ صرف سال چھ ماہ کی مہلت دے دیں......"

گاڑی میں ایک دم سے گہری خاموشی چھا گئی۔ اپنی بے ترتیب دھڑکنوں میں الجھتی دل ربا پریشانی سے سامنے دیکھ رہی تھی۔

"تم نے شاہ زل سے طلاق کی بات کی؟"

دل ربا کا سرنفی میں ہلا، نظریں مایوسی سے جھک گئیں۔

"وہ مجھے طلاق نہیں دینا چاہتا فیضان! وہ میرے ہر مطالبے کو نظر انداز کر رہا ہے، بات بات پر اب وہ اہل کو لے آتا ہے۔"

فیضان نے گہری سانس بھری۔ وہ بہت پریشان لگ رہی تھی۔ جو تعلق گزشتہ چار سالوں سے "پہلے محبت کا ذکر تھا، اب بچی کا ذکر ہے!" دونوں کے مابین پوشیدہ تھا، اس تعلق کو اب وہ بھی ایک نام دینا چاہتی تھی، وہ بھی اب ایک نیا سفر، ایک نئی پہچان چاہتی تھی۔ شاہ زل کبیر کا وجود اب اسے اپنی زندگی سے خارج چاہیے تھا۔

"تو پھر خلع......."

"تم اچھی طرح سے جانتے ہو میں خلع کے لیے پہل نہیں کر سکتی۔" وہ انتہائی بے بسی سے گویا ہوئی تھی۔

فیضان چپ ہو گیا۔

"میری اماں، بھائی، خاندان...... میرے لیے ان سب کو ایک ساتھ فیس کرنا مشکل ہو جائے گا۔"

"کیوں مشکل ہوگا؟ تم اس کے خلاف بات کر سکتی ہو!"

"سب اس کی فطرت سے واقف ہیں فیضان!! میں کیا عذر دوں گی؟ دو بار جھوٹ بولا تھا اور وہ بھی بے نقاب ہو گیا!! یہ سب اتنا آسان نہیں ہے!"

"تو پھر تم بتاؤ کیا کریں؟" فیضان کے لہجے میں ناراضی آ چکی تھی۔ "طلاق وہ نہیں دے رہا، خلع تم نہیں لے سکتیں!! بتاؤ یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟ تمہارے انتظار میں، میں کب تک اس طرح سڑتا رہوں گا؟"

"فیضان۔" اس نے تڑپ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"فار گاڈ سیک دل ربا!" اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔ "ہر بار ملاقات پر میں سوچتا ہوں کوئی تو پیش رفت ہوئی ہو گی، مگر تمہارا جواب ہر دفعہ ایک سا ہوتا ہے!! تم بے بس ہو تو کیا میں نہیں ہوں؟ میں اپنی شادی کو اور کتنا عرصہ ٹال سکتا ہوں؟"

"فیضان!! کیا ہو گیا ہے تمہیں!"

"ابھی بھی تمہیں سمجھ میں نہیں آ رہا مجھے کیا ہوا ہے!" وہ مزید خفا ہوا تھا۔ "میرا خیال ہے میں ہی بے وقوف بن رہا ہوں!"

"ایسا مت کہو!"

"تو کیا کہوں؟ مجھے لگتا ہے اب ہمیں ایک دوسرے سے الگ ہو جانا چاہیے!"

الگ ہونے کے تصور سے ہی دل ربا کی جان سولی پر اٹک گئی تھی۔

"پلیز فیضان! یہ مت کہو!! پلیز!! تم جانتے ہو میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں!"

"لیکن محبت میں قربانی تو یہاں میں دے رہا ہوں!" اس کی آنکھوں کی سرخی بڑھ چکی تھی۔ آواز میں ایسا غم تھا کہ دل ربا کا دل پسیج گیا۔

"ہم۔ ہم کچھ سوچتے ہیں!" دل ربا نے پھر سے ہمت پکڑی۔ پھر سے اسے منایا۔ "تم مجھے بتاؤ کوئی حل ہے تمہارے پاس؟ کوئی بھی حل۔ میں تمہارا پورا ساتھ دوں گی!"

"اب کوئی حل نہیں بچا!! کس بریک اپ!"

دل ربا کی دھڑکنیں ساکن ہو گئیں، اس کے آس پاس اندھیرے چھا گئے، "فیضان!"

"میں چار سالوں سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں!"

"نہیں فیضان۔ یہ انتظار ختم مت کرو!! میں تمہارے بنا مر جاؤں گی!"

"تم میرے بنا زندہ ہو!" گردن موڑے، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ گلوگیر لہجے میں گویا ہوا تھا۔

"تمہارے پاس شوہر ہے، بیٹی ہے، گھر ہے، تم کیوں مجھ جیسے انسان کے پیچھے آنا چاہو گی؟ مجھے تو اب اس محبت پر بھی شک ہو رہا ہے!" وہ بدگمانی کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر چکا تھا۔ دل ربا کی جان پر بن گئی۔

بہت منت اور محبت سے ایک بار پھر وہ اس سے مخاطب ہوئی، ہاتھ تھامے اصرار کیا، محبت کا واسطہ دیا، وفا کی یقین دہانی کروائی۔ فیضان کچھ نرم پڑا تو وہ چپ ہو گئی۔ اب وہ سامع بن چکی تھی، صرف اسے سننا چاہتی تھی، جو بھی راستہ تھا، اب فیضان نے نکالنا تھا۔

کچھ دیر تک سڑک پر گاڑی بے مقصد دوڑاتے رہنے کے بعد وہ واپس اسے زارا کے گھر لے آیا تھا، سڑک پر گاڑی روک کے اب وہ خاموشی سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ گھر کے لان سے اٹھتا شور شرابا اور تیز میوزک کی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔

کچھ دیر تک وہ اسٹیئرنگ وہیل پر گرفت جمائے بیٹھا رہا، پھر وہ قوت مجتمع کرتا اس کی طرف مڑا۔

"میں ایک بہت ہی پیچیدہ سی بات کرنے لگا ہوں،"

دل ربا کا دل زوروں سے دھڑک اٹھا، کہیں فیضان بریک اپ کی بات دوبارہ نہ کر دے۔۔۔

"میں خود غرض انسان نہیں ہوں لیکن یہاں تمہیں اور مجھے خود غرض ہونا پڑے گا۔"

دل ربا نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ گویا وہ اب ہر سچویشن کے لیے تیار ہو چکی تھی۔

"بہت سوچ و بچار کے بعد مجھے ایک حل سمجھ میں آیا ہے!"

فیضان نے چند لمحوں کے لیے ایک ڈرامائی وقفہ اختیار کیا۔

"اگر ہم طلاق سے نظر ہٹا کر سوچیں تو......" دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑتے ہوئے اس نے دل ربا کے تاثرات پڑھنا چاہے۔

"میں سمجھی نہیں؟" وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"ایک سچویشن ایسی ہو سکتی ہے جس میں ہم دونوں کا فائدہ ہو سکتا ہے، کوئی تم سے ناراض نہیں ہو گا، اور ہماری شادی بھی آسانی سے ہو جائے گی!"

"کیا ایسا ممکن ہے؟" پلکوں کی جھالر اٹھاتے اس نے کچھ بے تابی سے پوچھا تھا۔ "تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"کیا تم سچ میں میرا اشارہ نہیں سمجھیں؟" اس کی آنکھوں میں معنی خیزی ابھر آئی۔

دل ربا نے نفی میں سر ہلایا۔

"جو مسئلے کی جڑ ہے، اس جڑ کو ہی اگر اکھاڑ دیا جائے۔!"

اور وہ ایک جڑ آگ پکڑ کر اس کے اطراف میں پھیل گئی۔ بات اشارے میں تھی، منصوبہ لفظوں میں دبا تھا۔

digest library.com

دل ربا پھٹی پھٹی آنکھوں سے فیضان کو دیکھے جا رہی تھی، سماعت پر لمحے بھر کے لیے اسے یقین نہیں آیا تھا۔ بات جڑ کی تھی، جو ایک تناور درخت تھی۔

''تم...... تم قتل کی بات کر رہے ہو!'' اس کے لبوں کو ہلکی سی جنبش ہوئی۔

''حادثے کی بات کر رہا ہوں!'' آنکھوں میں سرخی لیے وہ کچھ بے رحمی سے تاریکی میں دیکھ رہا تھا۔

''صرف یہی ایک حل بچا ہے، منظور ہے تو ٹھیک ورنہ سب یہیں ختم کر دیتے ہیں!''

دل ربا نے سانس لینا چاہا مگر اسے سانس نہیں آیا، اس کے دل پر کوئی بھاری شے ٹھہر گئی تھی، اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے اور وجود اس پل بے جان ہونے لگا تھا۔

''کوئی جلدی نہیں ہے، تم جب چاہو اپنا فیصلہ سنا سکتی ہو۔''

گاڑی کے لاک اس ایک پل میں کھل گئے، ایسا ہی ایک لاک اس کے اندر بھی کھل چکا تھا، اسے اپنے وجود کے اندر تاریکی اترتی محسوس ہوئی۔ دروازے کھولے وہ باہر نکل گئی۔

''تمہارے لیے یہ جرم بھی قبول ہے مجھے!''

فیضان اسی پل گاڑی بھگا لے گیا تھا۔

اور وہ روشنیوں سے جگمگ کرتی دیواروں کے آگے ساکت سی کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

درفشاں نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا، کمرہ خالی اور تاریک پڑا تھا، ابجال اسکول گئی ہوئی تھی اور میرال اوپر تھی۔ اپنی سرگرمی کو سرانجام دینے کا یہ ایک بہترین موقع تھا۔ لائٹس آن کرتی وہ اندر آ گئی تھی۔

پہلی نگاہ اس کی ابجال کی رائٹنگ ٹیبل پر پڑی جو چند برس قبل تک اس کے زیر تصرف رہی تھی، اور چونکہ اسے علم تھا نئی آنے کے بعد یہ ابجال کو ملے گی سو اس نے اس پر کئی لکیریں، کئی ضربیں، کئی الفاظ موٹے مار کر کے لکھ رکھے تھے، اور تب سے اب تک جانے وہ کتنی بار اس کمرے میں ابجال اور میرال کی غیر موجودگی میں آ چکی تھی، اور جانے کتنی ہی بار وہ کمرے کی تلاشی بھی لے چکی تھی، اسے ابجال کی درازوں سے اوراق نکال کر پڑھنا، اس کی ڈرائنگز کو دیکھنا، اس کی کتابیں، نوٹ بکس حتیٰ کہ استعمال کی دیگر اشیاء میں بھی دلچسپی رہتی تھی، اور آج تک گھر کے کسی بھی فرد کو یہ بھنک نہیں پڑ سکی تھی کہ وہ وہاں آتی رہتی تھی، میرال اور ابجال کو بھی نہیں۔

وہ سیدھا رائٹنگ ٹیبل پر جا بیٹھی۔

یہ لیمپ اسے کب ملا؟ ذرا حیران ہو کر اس نے اس نئی دریافت کو چھوا۔ نیا سا لگتا تھا، گھر میں ایسا کسی کے پاس نہ تھا۔ ذرا سا عجیب لگا تو اس کے سوئچ بورڈ کی تار کو کھینچ کھینچ کر یوں بگاڑا کہ وہ دوبارہ آن نہ ہو سکا۔ پھر اس نے چھوٹے سے اس اسنیک پلانٹ کو دیکھا جو میز پر دھرا ہوا تھا۔ حالانکہ اسے پچھلی سردیوں میں جانے کہاں سے لائی تھی۔ پوچھنے پر بھی اس نے نہیں بتایا تھا۔

اب وہ ایک ایک کر کے درازیں کھولے جا رہی تھی، ان میں رکھی کتابوں کو اوپر نیچے کر رہی تھی، چاہتی تھی کوئی دلچسپ شے ہاتھ لگ جائے مگر نہ لگی۔

جس شے کی اسے تلاش رہتی تھی وہ اسے رائٹنگ ٹیبل، الماری، حتیٰ کہ بیڈ کے نیچے رکھے کارٹنز سے بھی نہیں ملتی تھی۔

وہ ایک زرد رنگ کی ڈائری تھی جس پر ابجال اکثر کچھ نہ کچھ لکھتی ہوئی پائی جاتی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس دن بھی اسے مایوسی ہوئی۔ اور اسی مایوسی میں اس نے شرارتاً اسنیک پلانٹ کا پتا توڑ مروڑ ڈالا۔ ایسا اس نے پہلی بار کیا تھا، پہلے وہ کوئی نشان نہیں چھوڑتی تھی، اب وہ چاہتی تھی ابجال مخمصے کا شکار ہو، اسے بھی کسی قسم کا خوف لاحق

ہو، وہ بھی غصہ ہو اور گھر میں سوال کرے یا دادی سے لڑے۔

اف کتنا مزا آیا تھا اس دن......جب مما سے ڈانٹ پڑی تھی اسے۔ سوچ سوچ کر اسے گدگدی سی ہونے لگی۔

digest library.com

اچھا خاصا وقت اس کمرے میں گزار کر وہ باہر نکلی تو کافی فریش سی تھی۔ میرال ابھی بھی اوپر تھی۔ شاہ زیب چاچو کی آمد پر اوپر والے پورشن کی پوری صفائی ہو رہی تھی۔

وہ گنگناتی ہوئی پورے گھر میں ٹہلنے لگی۔ دوپہر میں جب ابجال آئی تو اسے پورا یقین تھا وہ اس پودے کے لیے پورے گھر میں ہنگامہ کرتی ہوئی باہر نکلے گی۔ مگر کافی وقت گزرنے کے باوجود وہ باہر نہ آئی۔

میرال اسے کھانا دینے گئی تو کمرے سے کافی دیر تک بولنے کی آوازیں آتی رہیں۔ درفشاں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی مگر سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ہاں البتہ جب میرال باہر نکلی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

در ے چھپ چھپ کر دیکھتی رہی۔ مسکراتی رہی۔ میرال اپنے کام میں لگ چکی تھی اور اندر ڈائننگ ٹیبل کے پاس کھڑی ابجال پودے کو ہاتھ لگا رہی تھی۔

اس نے سیڑھیاں چڑھتے، موبائل پر کوئی گیم لگاتے سر اٹھایا تو ذہن میں پچا مسلنے کا منظر گھوما۔

وہ ایک بار پھر مسکرا دی۔

اب وہ اپنے کمرے میں آ چکی تھی۔

ثمرہ اس کے استعمال شدہ کپڑے ابجال کو دیتی تھیں، سو اس کے اندازے کے مطابق جو کپڑے بھا سے دیے جانے تھے اس نے وہ تمام کے تمام الگ کر دیے، قینچی نکالی اور کمال مہارت سے کٹ لگاتی گئی۔ کھینچا کھینچی کر کے اس نے قمیض اور ٹراؤزرز کو ایسی جگہوں سے ادھیڑا جہاں لگا ہوا پیوند صاف نظر آئے۔

وہ چاہتی تھی ابجال پر یہ اثر پڑے کہ کپڑے ابتر حالت میں تھے تب ہی اسے دیے گئے۔ اور اس کی یہ سوچ اب کی نہیں، کئی برسوں سے تھی، وہ چھوٹی سی تھی اور اس کا ذہن اسی حرکت پر آمادہ ہوا تھا۔ سب سے پہلے اس نے چھ سال کی عمر میں ایسا کرتے ہوئے ثمرہ کو دیکھا تھا۔ اور تب سے اب وہ ایسا کرتے خود کو دیکھ رہی تھی۔

خراب کی ہوئی، ٹوٹی ہوئی، پھٹی ہوئی اشیاء کو ابجال کے پاس دیکھنے سے جانے کیوں اسے سکون ملتا تھا، اسے اچھا لگتا تھا کہ ایک ہی فیملی کا حصہ ہو کر دونوں کا نصیب اور مقدر کتنا مختلف سا تھا۔ چچا اس کے بھی تھے، دادی اس کی بھی تھیں، مگر پھر بھی سب صرف اس کا ہی تھا۔

وہ اوپری منزل کی ملکہ تھی، اور وہ نچلی منزل کی کوئی رعایا۔ جو بے عزتی کی مستحق۔ پیروں تلے روندے جانے کے قابل تھی۔

☆☆☆

شام کے سات بجے میرال کمرے میں آئی تو ابجال ندارد تھی۔ پریشانی کے عالم میں وہ تیزی سے باہر آئی تھی۔ اس کی تلاش میں آج پھر اسے پورے گھر کا چکر کاٹنا پڑا تھا۔ مگر وہ وہیں تھی جہاں اسے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ عصمت بیگم نے آج پھر اسے بلایا تھا۔ آج پھر وہ ان کے کمرے میں، ان کے تخت پر، ان کے برابر میں بیٹھی تھی۔ دستک دے کر داخل ہوتی میرال نے یہ منظر دیکھا تو اس کا وجود ہزار حصوں میں بٹ گیا۔ ہر حصے سے لہو رسا۔ ہر حصے سے درد اٹھا۔

آج بھی ابجال کے سامنے کچھ سامان کھلا پڑا تھا۔

"ہالہ!"

"یہ کیا طریقہ ہے؟" عصمت بیگم کی رعب بھری آواز نے اس سے قوت گویائی چھین لی۔ وہ اپنی جگہ ٹھہر

گئی۔
''ہم نے بلایا تھا اسے۔ ہم اس سے ملنا چاہ رہے تھے!'' ان کا جواب اسے پتھر کرنے کے لیے کافی تھا۔
''خیریت؟'' لبوں پر جنبش ہوئی
''اب ہم تمہیں بتا کر کوئی کام کریں گے؟'' آواز سرد ہوئی۔
''آپ نے مجھ سے کہہ دیا ہوتا تو...'' بھاری سانسوں کے بیچ وہ بمشکل بول پائی۔ چند روز قبل کا واقعہ ذہن میں تازہ تھا۔
''ہم تم سے کیوں کہتے؟'' نگاہوں میں حقارت اتر آئی۔ تاثرات کٹیلے ہو گئے۔ ''ہم جب چاہیں اس سے بات کر سکتے ہیں۔ جب چاہیں اسے بلا سکتے ہیں!''
ابتہال گم صم بیٹھی تھی۔ وہ ان قیمتی ملبوسات کو دیکھ رہی تھی جو اسے پہلی بار خاندان کی کسی شادی میں شریک ہونے کے لیے ملے تھے، مایوں کا، بارات کا اور ولیمے کا بھی۔
''خیر سے اب یہ بچی نہیں رہی۔ سمجھ اسے بھی ہے۔ اور پھر ہمارا بھی خیال ہے کہ اسے عنبرین کی شادی میں شریک ہونا چاہیے۔'' انہوں نے ایک ہی لمحے میں اسے کاٹ کر ابتہال کی ہر تصویر سے الگ کر دیا تھا۔ میرال جتنی مضبوطی سے کھڑی تھی، اندر سے اتنا ہی ریزہ ریزہ ہونے لگی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کبھی اس طرح بھی ہوگا۔ عصمت بیگم ایسا بھی کریں گی؟
''یہ سامان اٹھاؤ اور چلو جاؤ شاباش!'' آواز میں نہ کوئی نرمی تھی نہ محبت کی چاشنی۔ ابتہال نے سر اٹھا کر ایک بار پھر اسے دیکھا۔ میرال کی آنکھوں میں کرب اتر آیا۔ کاش وہ رکھ دے سامان۔ اور رد کر دے انہیں۔
''سنا نہیں ہم نے کیا کہا؟'' عصمت بیگم ہالہ سے مخاطب ہوئیں۔ وہ اپنے حکم کی تعمیل فوری چاہتی تھیں۔
سامان پلاسٹک بیگ میں ڈالتے ہوئے ابتہال اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ خاموشی سے وہ اس کے برابر سے گزر کر باہر چلی گئی تھی۔ میرال اس کے پیچھے تھی۔ مگر وہ کمرے میں نہیں آئی تھی۔ آنکھوں میں ڈھیر ساری نمی لیے اس نے مرکزی ہال کا رخ کر لیا تھا۔
کچن کا سارا کام سمیٹ کر اپنے کمرے میں آئی تو اس وقت ڈھائی بج رہے تھے۔ عصمت بیگم کی طرف سے دیا جانے والا سامان وہیں پڑا تھا۔ ابتہال نہیں سوئی تھی۔ وہ گم صم سی بستر پر اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ برابر میں کٹے ہوئے بال ماتھے پر بکھرے تھے۔ فرنچ چوٹی آگے ڈال رکھی تھی۔ دیوار گیر کھڑکی سے لان کی روشنیوں کا عکس اس کے موہی چہرے پر پڑ رہا تھا۔ آنکھوں میں کئی سوال تھے اور لبوں پر کئی شکوے۔ مگر وہ چپ تھی۔ اور اسے دیکھے جا رہی تھی۔
''تم سوئیں نہیں ابھی تک!'' تھکن سے چور ہوتے بدن کے ساتھ وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ آواز کمزور تھی۔ چہرہ زرد لگ رہا تھا۔ ہالہ چپ رہی۔
''صبح تم نے اسکول جانا ہے!'' اٹھ کر الماری کھولی۔ لان کا ایک سوٹ نکالا۔
''عصمت بیگم نے کہا ہے چھٹی کر لو!''
وہ لمحے بھر کے لیے تھم گئی۔
''کہہ رہی تھیں عنبر آپی کل سیلون جائیں گی تو میں بھی ساتھ چلوں۔''
ہینڈل پر گرفت جمائے میرال نے بمشکل خود کو سنبھالا۔
''انہیں میرے لمبے بال پسند نہیں آئے۔ کہہ رہی تھیں کندھوں تک کٹوا دو امیں نے کہا ٹھیک ہے!''
اس نے مڑ کر ابتہال کو متوحش نگاہوں سے دیکھا۔

"تم نے کہا، ٹھیک ہے؟" صدمے سے لب ہلے۔
"آپ بھی تو ان کی ہر بات پر یہی کہتی ہیں!" ہالہ کے لہجے میں کانچ کی چبھن تھی۔ لب بھینچے وہ آنکھوں میں نمی لیے اسے دیکھ کر رہ گئی۔
"ہالہ! تم بال نہیں کٹواؤ گی!"
"آپ نے کیوں کٹوائے تھے؟"
میرال اپنی جگہ سن ہو گئی۔ "تم سے... تم سے کس نے کہا؟"
اس کا سر جھک گیا۔ وہ چپ رہی۔
"کچھ پوچھ رہی ہوں میں؟"
"بس پتا ہے مجھے!" اس نے سر اٹھایا۔ "مجھے لگتا ہے ان بالوں کی وجہ سے میں آپ کی طرح دکھتی ہوں، مجھے آپ کی طرح نہیں دکھنا!"
میرال کی گردن پر جیسے کسی نے پاؤں رکھ دیا۔
"میں چاہتی تھی میرا قد چھوٹا رہے، پر آپ کی طرح ہو گیا! لباس بھی آپ کے جیسا، وجود بھی آپ کے جیسا، زندگی بھی آپ کے جیسی۔"
"ہالہ۔" میرال کانپ کر رہ گئی۔
"کاش میں آپ کو بتا سکتی، مجھے آپ سے کتنی نفرت ہے!" نیم تاریکی میں میرال اسفند کا دل پھٹ گیا۔
"کاش آپ میری ماں نہ ہوتیں۔" میرال اسفند کا وجود فضا میں معلق ہوا۔ آنکھوں میں ایک چہرہ آٹھہرا، روتی گڑگڑاتی آواز سماعت میں تھم گئی۔ ہاتھ اس کے آگے جڑ گئے۔
"کاش تم میری بیٹی نہ ہوتیں میرال! کاش میں نے تمہیں پیدا نہ کیا ہوتا!"
میرال اسفند عقبی دروازہ کھول کر کھلی فضا میں آ گئی تھی۔ مگر پھر بھی اسے سانس نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن عنبرین پارلر جانے لگی تو ملازمہ اسے بھی بلانے آئی۔
"کیوں بلایا ہے؟" کتاب سے سر اٹھا کر وہ اسے دیکھنے لگی تھی۔
میرال کے ہاتھوں میں جزبی تھی۔ وہ ناشتے سے فراغت کے بعد بس ذرا دیر کو کپڑے بدلنے اندر آئی تھی۔ مڑ کر ملازمہ کو دیکھنے لگی
"بیگم صاحبہ کہہ رہی ہیں، بال کٹوانے پارلر جانا ہے!"
میرال کا سانس رک گیا۔
"ان سے کہہ دو، میں خود کاٹ لوں گی!" اب کے سر اٹھائے بنا ابتہال نے جواب دیا تھا۔
میرال اپنی جگہ دم سادھے کھڑی تھی۔ ملازمہ جواب سن کر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد عصمت بیگم نے اسے بلا لیا۔ اپنا کام چھوڑ کر میرال بھی اس کے پیچھے گئی۔ اسے ابتہال کے بالوں کی فکر تھی۔ اس نے سوچا عصمت بیگم سے وہ خود بات کرے۔
مگر کرنے میں صرف ابتہال ہی گئی۔ اسے دروازے پر رکنا پڑا۔
"عنبرین پارلر جا رہی ہے۔ میں نے اسے سمجھا دیا ہے، کہاں تک بال کٹوانے ہیں۔ کوئی ہیئر اسٹائل نہیں بنوانا!" اپنے تخت پر براجمان وہ تحکم سے بولیں۔
"بال کیوں کٹوانے ہیں؟" اس نے الٹا سوال داغا۔ عصمت بیگم نے بے اختیار سر اٹھایا۔ انہیں خوش فہمی سی

digestlibrary.com

تھی کہ ابتہال ان کا حکم بغیر کسی تردد کے مان لے گی۔ مثبت جواب تو انہیں وہ دے ہی چکی تھی۔ مگر اب یہ سوال۔

''کیونکہ ہم کہہ رہے ہیں!''

''آپ کیوں کہہ رہی ہیں؟'' اس کا لہجہ عام سا تھا۔

عصمت بیگم کے لب بھینچ گئے۔ گاؤ تکیے کے سہارے ایک ادا سے براجمان وہ اسے یک ٹک دیکھے گئیں۔ خیال تھا جو مہنگا سامان انہوں نے دیا ہے وہ رعب میں تو ضرور آئے گی۔ مزید کی چاہ میں سر بھی جھکائے گی اور حکم بھی مانے گی۔

میرال لب کاٹتی باہر کھڑی تھی۔ اس کا سانس رکا ہوا تھا اور دھڑکن تھمی ہوئی تھی۔ جانے عصمت بیگم کے ذہن میں کیا چل رہا تھا۔ وہ ابتہال میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہی تھیں؟ وہ اس پر اپنا تسلط کیوں جمانا چاہ رہی تھیں؟ یہ اچانک ایسا کیا ہوا تھا۔

''یہ سوال کرنے کا تمہیں حق نہیں!''

''یہ حکم دینے کا آپ کو حق ہے؟''

عصمت بیگم نے سخت نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ میرال اسفند نہیں تھی کہ چپ چاپ سر جھکا دیتی۔

''بالکل حق ہے۔ یہ ہمارا گھر ہے۔ ہم کوئی بھی حکم دے سکتے ہیں!''

''یہ آپ کا گھر ہے!'' اس نے بازو پھیلا کر ان کی تصحیح کی۔ ''میں آپ کا گھر نہیں ہوں!''

عصمت بیگم نے بمشکل ضبط کیا۔ یقین نہیں آتا تھا وہ لڑکی جو ہر وقت چپ چاپ رہتی تھی، سامنا کرتی تھی نہ جواب دیتی تھی۔ انہیں ایسا روپ اور ایسا رنگ دکھائے گی؟ مگر وہ لڑکی ایسا رنگ۔ اور ایسا روپ دکھا چکی تھی۔

ابتہال مزید کوئی بات کیے بنا ان کے کمرے سے چلی گئی تھی اور عصمت آرا غیض و غضب کے عالم میں اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

کبیر ہاؤس میں زندگی بیدار ہو چکی تھی، ملازم اپنے کام میں مگن تھے، ناشتے کی تیاری ہو رہی تھی، وہ واک سے ابھی کچھ دیر پہلے ہی لوٹا تھا، اور سیدھا اہل کے کمرے میں چلا گیا تھا۔

تین سالہ اہل کی طبیعت گزشتہ کئی روز سے خراب تھی، اس نے پیشانی پر ہاتھ رکھا بخار چیک کیا، پھر اس کا ہاتھ چوما، گال چوما۔ بیڈ پر اس کے برابر میں کافی دیر تک لیٹا رہا۔

دل ربا بیڈ روم میں ابھی تک سو رہی تھی، اس نے گزشتہ رات واپسی پر نہ اس کمرے کا رخ کیا تھا، نہ ہی اس سے اہل کی طبیعت کے بارے میں پوچھا تھا۔ اپنے دل پر ایک بھاری بوجھ لیے وہ نیچے آگیا تھا۔

ہادی اور اریبہ اسکول کے لیے تیار ہو چکے تھے، دردانہ انہیں ڈائننگ ٹیبل پر بلا رہی تھیں، سفیر بھی سوٹڈ بوٹڈ تیار ہو کر صدر کرسی سنبھال چکا تھا۔

آج آفس سے اس نے چھٹی کا ارادہ کر رکھا تھا اور ناشتے کا بھی فی الحال کوئی ارادہ نہ تھا سو گھر کے اندر، عقبی جانب شیشے کی ایک لمبی دیوار کا دروازہ کھولے وہ مخصوص باغیچے میں آگیا تھا جس کے تمام پودے اس کی والدہ زرینہ حفیظ نے خود لگائے تھے، ہرے بھرے باغ کا منظر پیش کرتا وہ چھوٹا سا باغیچہ جنت کا کوئی ٹکڑا لگتا تھا۔ سامنے والی دیوار بیل بوٹوں سے چھپی ہوئی تھی، دو سفید کرسیاں وسط میں رکھی تھیں، ایک فوارہ بھی تھا۔

یہ باغیچہ زرینہ حفیظ کا تھا، جب تک وہ حیات رہی تھیں اس کی دیکھ بھال ہمیشہ انہوں نے ہی کی تھی، اپنے ہاتھوں سے مٹی کی کھدائی کی تھی، اپنے ہاتھوں سے ہی ایک ایک پودا لگایا تھا، ہر پودے کو مناسب دھوپ لگوانا، پانی دینا، حتیٰ کے کھاد وغیرہ کے معاملات میں بھی انہوں نے مالی سے مدد کبھی نہیں لی تھی جو ان کی دیکھ بھال کرتا

تھا۔

گھر کا یہ مخصوص حصہ ان کی خود ساختہ جنت تھی۔ جسے کہانے سنوارنے میں ان کے دن کا اکثر حصہ یہیں گزرا کرتا تھا۔

digest library.com

آہستگی سے قدم اٹھاتے اس نے جیبوں میں ہاتھ ڈال لیے۔ کھلی فضا میں اس نے سر اٹھا کر نیلگوں آسمان کو دیکھا۔

اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی، سیاہ آنکھوں میں کئی ویرانیاں سی ٹھہری ہوئی تھیں، سرخ لکیریں گواہ تھیں وہ رات بھر جاگتا رہا تھا۔

"بھاڑ میں جائے اہل!" آواز بازگشت بن کر ایک بار پھر گونجی تھی۔

"بھاڑ میں جائے آپ کی بھانجی!"

اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے وہ سامنے کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ نگاہیں سامنے اسنیک پلانٹ پر جم گئی تھیں اریکا پام پر بھی...... ایسے کئی پودے گھر کے اندر، اور اس کے بیڈروم میں بھی رکھے گئے تھے، تاکہ ہوا تازہ رہے، ماحول فریش رہے، سانس میں دقت نہ ہو۔ دم کشیدہ نہ ہو۔

مگر اس لمحے قدرت کی ان تمام رعنائیوں میں بھی اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔

"میری زندگی، خواب اور خواہشات کا کیا؟"

"نکاح ہے تم دونوں کا شاہ زل!"

"میری جگہ ایجاب و قبول آپ نے کیا ہے، میں اس نکاح کو نہیں مانتا!"

"اس میں کمی کیا ہے؟"

"کمی تو ساری مجھ میں ہے؟ کیا فائدہ اتنی تعلیم اور آزادی کا، جب آپ نے میری شادی ایسی لڑکی سے کرنی تھی۔"

"وہ ان پڑھ، گنوار تو نہیں ہے،" انہوں نے احتجاج کیا تھا۔

"شکل سے تو لگتی ہے، اس سے بات تک نہیں ہو پا رہی تھی ماما، سامنا تک اسے کرنا نہیں آتا۔ کیا اس نے آپ سے کبھی کوئی بات کی؟ بابا سے کی؟ کیونکہ میں نے تو کبھی نہیں دیکھا۔ سلام دعا کر کے کتابوں میں گھس کر بیٹھ جاؤ...... یہ مینرز ہیں؟"

زرینہ لاجواب سی ہو گئیں۔ "بچی ہے وہ۔ ناسمجھ ہے، شرماتی ہے!"

"خالہ اسکول پرنسپل ہیں، اور آپ مجھ سے کہہ رہی ہیں، وہ شرماتی ہے؟ آپ نے لاسٹ ٹائم اس کے کپڑے دیکھے تھے، آئی مین......!!" وہ کچھ کہتے کہتے پیشانی مسلنے لگا تھا۔

"ممی! اسے ڈزنٹ ایون نو ہاؤ ٹو کیری ہر سیلف اپ!! اور آپ چاہتی ہیں میں...... شاہ زل کبیر اس سے شادی کروں؟"

"شادی کے بعد لڑکیاں بدل جاتی ہیں، شوہر کی پسند ناپسند کا خیال رکھتی ہیں......" انہوں نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی سعی کی۔

"ماما! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ وائے وڈ شی چینج ہر سیلف فار می؟ جیسی وہ ہے ویسی ہی رہے، مجھے کسی کو بدلنے کا کوئی شوق نہیں ہے!"

"شاہ زل پلیز بیٹا!!! تحمل سے کام لو۔ تمہارا اس سے نکاح ہے، یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے!"

"اور یہ اتنی بڑی بات بھی نہیں ہے، جتنا آپ اسے بنا رہی ہیں۔ بڑوں نے ہمارے بچپن میں جو رشتہ طے

کر دیا تھا، اسے ختم کرنے یا بنائے رکھنے کا حق اب صرف میرا ہے!!! اور میں وہی کروں گا جو میں چاہتا ہوں!"
"نکاح ختم ہوگا تو اس معصوم پر بہت سوال اٹھیں گے، اپنی خالہ کا سوچو بیٹا!!"
وہ آنکھوں میں صدمہ لیے انہیں غم سے دیکھ کر رہ گیا۔ "ماما! آپ کو دوسروں کی پروا ہے پر میری نہیں؟ آپ اس کی خاطر میری زندگی برباد کرنا چاہتی؟"
"کیسی باتیں کر رہے ہو تم؟ میں ماں ہوں تمہاری!! کیا میرا انتخاب غلط ہو سکتا ہے؟"
"ایک ایسی لڑکی کو آپ جبراً مجھ پر مسلط کرنا چاہ رہی ہیں جس سے نہ مجھے محبت ہے، نہ اس کے حوالے سے میں کچھ محسوس کرتا ہوں۔"
"شاہ زل!"
وہ نفی میں سر ہلاتا ناراضی سے پیچھے ہوا تھا۔
"میں نے ہمیشہ آپ کا ہر حکم مانا ہے، کبھی کوئی بات نہیں ٹالی...... لیکن یہ...... ماما مجھ سے یہ نہیں ہوگا! میں شادی اپنی پسند کی لڑکی سے کروں گا۔ محبت سے کروں گا، مجھے ایک ایسا شریک حیات چاہیے جو کم از کم میرے ساتھ اچھا تو لگے، مکمل تو لگے۔ جس لڑکی کو کسی کا سامنا نہیں کرنا آتا وہ میرے ساتھ زندگی کیسے گزار سکتی ہے؟"
فیصلہ حتمی تھا جو اکتوبر کی ایک شب اس نے اسی باغیچے میں کھڑے کھڑے انہیں سنا دیا۔
"شاہ زل وہ ایک بہت اچھی لڑکی ہے!"
"ماموں کا رشتہ طے کرتے وقت بھی تو آپ نے یہی کہا تھا، اپنی پسند کی لڑکی لائی تھیں آپ ان کے لیے آپ نے ایسے ہی کہا تھا کہ اچھی لڑکی ہے!"
زرینہ کا سانس حلق میں اٹک گیا، چہرے پر وحشت سی در آئی۔
"پھر اس اچھی لڑکی نے آپ کے بھائی کے ساتھ کیا کیا۔ بتائیں؟"
انہوں نے ہاتھ کھڑا کر کے اسے مزید کچھ بھی کہنے سے منع کیا۔ ان کے تاثرات بدل چکے تھے۔ کوئی گہری چوٹ آ کر لگی تھی انہیں۔
"ماما!" وہ گھبرا کر ان کی طرف بڑھا مگر انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔
"اپنے ماموں کا تم نے آج نام لیا ہے، آئندہ مت لینا!"
اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ابھی ابھی اس سے یہ بات کہہ کر گئی ہوں۔ ان کے لہجے کی سختی، آنکھوں کی خفگی، اور پھر غصے سے۔ جس طرح وہ اس باغیچے سے گئی تھیں، اسے وہ منظر آج بھی بہت اچھے سے یاد تھا۔
گہری سانس بھر کر اب وہ گلاس وال کی طرف دیکھنے لگا تھا، دل ربا سیڑھیاں اتر کر نیچے آ رہی تھی، اس کے بال کھلے ہوئے تھے، فون ہاتھ میں تھا، وہ مسلسل کال کر رہی تھی، مگر کوئی فون اٹھا نہیں رہا تھا۔ پھر وہ کچن کی طرف چلی گئی تھی۔
پہلے اس نے ملازمہ پر غصہ کیا، پھر کاؤنٹر پر پلیٹ پٹخ کر ماری، آواز نہیں آ رہی تھی، مگر انداز سے ظاہر تھا وہ اونچا اونچا بول رہی تھی۔
"ایسی لڑکی جو میرے ساتھ اچھی تو لگے!"
اس نے اپنی آواز سنی، پھر نظر ہٹالیں۔
ایک فیصلہ کئی برس قبل یہیں ہوا تھا،
ایک اور فیصلہ اب ہونے جا رہا تھا۔

☆☆☆

''تم اگر کل ہی انکار کر دیتیں تو آج یہ بدمزگی تو نہ ہوتی۔'' ابتہال اپنے بیڈ پر بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی جب سماعت سے میرال کی آواز ٹکرائی۔

digest library.com

وہ ابھی ابھی کمرے میں آئی تھی۔ چہرے پر بیزاری چھائی ہوئی تھی۔ وجود تھکاوٹ سے چور لگتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا عصمت بیگم نے اس کی خوب کلاس لی تھی۔ کوئی بھی بات ہوتی، کسی کا بھی غصہ ہوتا، نکلتا وہ میرال پر ہی تھا۔

''جب وہ کہہ رہی تھیں تب ہی منع کر دینا چاہیے تھا!''

''کل انکار کر دیتی تو مجھے پتا کیسے چلتا، وہ کیا سوچ رہی ہیں؟''

میرال کو ایک دم سے شاک لگا۔

''ہالہ۔''

''میں نے آج انہیں بس یہ بتایا ہے کہ میں میرال نہیں ہوں!'' اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اب وہ کچھ لکھ رہی تھی۔

''تو وہ کپڑے۔''

''نہ لیتی تو کیا وہ رشتے کی بات کرتیں؟'' اب کے وہ سر اٹھا کر بولی۔ میرال ساکت رہ گئی۔ اس پر ایک انکشاف ہوا، وہ اب بچی نہیں رہی تھی۔ چودہ سال کی نہیں رہی تھی۔

اس کی سوچ کئی واہموں کو جگا گئی۔ کئی خوف اس کے اندر کلبلا گئے۔

''تم یہ ٹھیک نہیں کر رہیں!'' جانے کس خوف، کس خدشے، کس احساس کے تحت وہ بولی۔ عصمت بیگم کی انتقامی فطرت سے واقف تھی وہ۔ جانتی تھی سرکشی کا انجام کیا ہو سکتا تھا۔

''آپ ٹھیک کر رہی ہیں؟ میرے ساتھ؟ اپنے ساتھ؟''

میرال اسے بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی۔

''میں تمہاری زندگی......''

''آپ اپنی زندگی کو بھی شیپ نہیں کر پائیں تو میری زندگی کو خاک کریں گی؟'' وہ انتہائی بدتمیزی سے گویا ہوئی تھی۔

آنکھوں میں کرب لیے میرال بیٹھی رہ گئی۔

''کبھی میں نے روکا آپ کو، بے عزتی نہ سہیں، مار نہ کھائیں، ذلیل نہ ہوں؟''

میرال کا دل کٹ کر رہ گیا۔

''ہاں آپ یہ ضرور چاہ رہی ہیں، میں بات نہ کروں، جواب نہ دوں، سوال نہ کروں۔''

آنکھوں میں غصہ، نفرت لیے وہ پھر سے لکھنے لگی تھی۔

دل میں درد لیے میرال اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

کمرے کی نیم تاریکی میں، لیپ ٹاپ اسکرین کی نیلگوں روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی، اسکرین پر ایک کریک تھا، بیک سائڈ پر بھی کچھ نشان تھے۔

اس کے ہاتھ تیزی سے متحرک تھے۔ کی بورڈ کی آواز بارش کے شور میں دب رہی تھی۔

عجلت میں کچھ ٹائپ کرتے، نا ٹیب کھولتے، چند لفظوں کو ہٹاتے، نئے جملے کا اضافہ کرتے وہ ایک بار پھر اپنے سابقہ کام کی طرف واپس آ چکی تھی۔ اسکرین تاریک ہو کر روشن ہوئی تو اس پر ان گنت حروف اور نمبرز کی

بھر مارتھی، وہ اسکرول کرتی جا رہی تھی۔ کلک کر کے، عجلت میں کچھ ٹائپ کرتی اب وہ ایک نیا صفحہ کھول چکی تھی۔
اس کی آنکھوں کی چمک یکا یک بڑھ گئی۔
کی بورڈ کے برابر میں ہی دیوار کے ساتھ ننھا سا سیلف واٹرنگ پاٹ رکھا تھا، اس کی تہہ میں جمع شدہ پانی میں ٹھہری ہوئی جڑوں میں جنبش ہوئی تھی، تہہ در تہہ پانی نے اپنی ایک لہری بنالی۔
چائے کا گھونٹ بھر کر اس نے کی بورڈ پر دوبارہ ہاتھ رکھا۔
صفحے پر مینیا چرہاؤس کا خاکہ ابھر آیا۔
نچلا لب دانتوں تلے دبائے وہ کچھ ٹائپ کرتے کرتے رک گئی۔
چھٹی حس نے اشارہ دیا کچھ تو گڑبڑ ہے، اس نے کی بورڈ سے ہاتھ ہٹا لیے۔
اسی پل بادل شدت سے گرجے تھے، کمرے کی بتیاں ایک لمحے کو بجھ کر پھر سے جل اٹھیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ پردے سرکا کر کھڑکیوں سے باہر دیکھا۔
قصر جلال کے سرسبز احاطے میں ازباز خان سیر پر چھاتا تانے پتھریلی روش پر چلتا ہوا آگے جا رہا تھا۔
اونچے لمبے درختوں کے اس پار بیرونی دیوار تھی، جس کی تمام بتیاں تاریکی میں روشن نظر آ رہی تھیں۔
ہیڈ لائٹس کی لکیر گیٹ سے آگے تک پھیل گئی۔
اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ سوال کرتے اور ممکنہ جواب کو سوچتے اس کی بھنویں سکڑ گئیں۔
اس کی نگاہ گاڑی پر پڑی، گہری سانس بھر کر اس نے پردہ چھوڑ دیا۔ فوراً سے لیپ ٹاپ بند کرتی وہ کمرے سے باہر آ گئی۔ عجلت میں قدم اٹھاتے وہ آفس روم میں داخل ہو چکی تھی۔ نیم تاریکی میں، کسی شے سے الجھے، ٹکرائے بنا اس نے وہ لیپ ٹاپ آخری دراز میں رکھ دیا تھا۔
دھک دھک کرتے دل کے ساتھ وہ کچھ ہی دیر میں اپنے کمرے میں واپس آ چکی تھی۔
بیڈ پر بیٹھی اب وہ کچھ بے قراری سے نچلا لب کاٹ رہی تھی۔ نگاہیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ قدموں کی آواز دروازے کی جانب لحہ بہ لحہ بڑھنے لگی۔
کہیں اس کے آفس روم میں کیمرہ تو نہیں لگا ہوا؟ اس کی دھڑکن تیز ہو گئی۔
قصر جلال کی در و دیوار پر ایک پُراسراریت اتر آئی۔
قدموں کی چاپ بند دروازے کے سامنے ایک پل کو تھمی، وہ منتظر رہی کب دستک ہوتی ہے اور دروازہ کھلتا ہے...... مگر
آواز دروازے سے دور ہونے لگی۔
خشک لبوں کو تر کرتے اس نے کچھ دیر بعد دروازہ کھول کر راہداری میں جھانکا۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اگر آفس روم میں کیمرہ ہوتا تو یقیناً اس کی حاضری لگ چکی ہوتی۔
سکھ بھری سانس لیے وہ بیڈ پر ڈھے گئی۔ آنکھوں میں شک و بدگمانی کا اثر لیے اب وہ سیلنگ کو دیکھ رہی تھی۔
پردوں کی درز سے، بیرونی دیوار پر لٹک کر کسی نے بند شیشے پر اپنا ایک ہاتھ رکھ دیا تھا۔
سیلف واٹرنگ پاٹ کے پانی میں ایک بار پھر حرکت ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

انگریزی کا پیریڈ شروع ہو چکا تھا، مس ثنا بورڈ پر گرامرز کے کچھ اصول سمجھا رہی تھیں جن کے پوائنٹس نوٹ بک پر لکھتے قلم کی سیاہی اچانک ختم ہو گئی۔ ابتہال نے برابر میں بیٹھی رمشہ سے قلم مانگا۔ اس نے پن کیس کو اوچھے

سے کھنگالا اور کئی رنگوں کو نکالنے کے بعد ایک قلم ہاتھ آ گیا جو اس نے ہالہ کو تھما دیا۔
اس نے قلم ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ اس نے بے اختیار گردن موڑ کر رمشہ کو دیکھا، جس کی آنکھوں میں جانے کس احساس کے تحت وحشت اتر آئی تھی، کس کر لپیٹے گئے اسکارف کو اس نے پیشانی کے پاس سے جیسے کھینچا تھا۔

digest library.com

''کیا ہوا؟'' اس نے گردن موڑ کر اجمال کو دیکھا، کچھ حیرت سے۔ کہ قلم لے کر وہ اب کچھ لکھ کیوں نہیں رہی؟

اجمال نے نگاہ ہٹالی۔ پیریڈ ختم ہوا تو بریک ٹائم شروع ہو گیا، اس نے رمشہ کو پلے گراؤنڈ کی سیڑھیوں پر جالیا۔

وہ اپنی نوٹ بک ہاتھ میں لیے عجلت میں اور بہت تیزی سے کچھ لکھ رہی تھی، اجمال کو دیکھا تو جھٹ سے ڈائری بند کر دی۔

''تمہارے سر پر کیا ہوا ہے؟''
اور رمشہ جمیل سانس نہ لے سکی۔
''ک۔ کچھ نہیں!! میرے سر پر کیا ہوا ہو گا!''
''تم نے اسکارف نہیں اتارا آج!''
''ٹھنڈ ہے نا تو اس لیے......''
''تمہاری ماں نے پھر سے مارا ہے تمہیں!''
''ت...... تمہیں کیسے پتا...'' رمشہ کے حلق سے لفظ ٹوٹ کر نکلے۔ کچھ صدمے سے۔ بے یقینی سے۔
''تم اپنے باپ کو کیوں نہیں بتاتیں!''
''تم نے میری ڈائری پڑھی!'' ناراضی کے عالم میں رمشہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
''تم...... تم نے پہلے بھی یہی کیا تھا، تم نے میرے بیگ کی تلاشی لی؟''
''وہ تمہیں مار ڈالیں گی!!''

رمشہ نے جیسے کچھ سنا نہیں۔ وہ شدید غصے میں آ چکی تھی۔ ''تم ہمیشہ میری پرائیویسی میں انٹرفیئر کرتی ہو، میری پرسنل چیزیں دیکھتی ہو!''

اجمال چپ رہی۔ سیڑھیاں اتر کر رمشہ نے سیدھا کلاس کا رخ کیا تھا۔ اس کا بیگ خون سے تر ہوئے ٹشوز سے تقریباً بھرا ہوا تھا، آنکھوں میں نمی لیے اس نے کلاس کے کوڑے دان میں وہ ٹشوز پھینک دیے، پھر اسکارف اتار کر دوبارہ پہننے لگی تو اس کے ماتھے کے اوپر مانگ کے عین وسط میں گہرے زخموں سے خون جما ہوا دکھائی دیا۔

سسکی کی آواز حلق میں کہیں دبا لی گئی۔ اور باہر مشرقی گراؤنڈ کے وسط میں کھڑی اجمال شاہ زیب اسکول کی عمارت کو دیکھتی رہی، اس کے ہاتھ میں وہی قلم تھا جس کی نب ٹوٹی ہوئی تھی۔

☆☆☆

''پتا ہے شاہ زیب چاچو آ رہے ہیں!''
کتاب ہاتھ میں لیے، بال پین سے لفظ کھینچتے اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ وہ شاہ بلوط سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

درفشاں بنچ پر کھڑی تھی، اور دیوار پر لگی بیلوں کو اوپر تک دیکھے جا رہی تھیں۔ ''شاہ زیب چاچو... تمہارے ڈیڈا!'' اس کی آنکھوں میں چمک اتری، لبوں پر مسکراہٹ ابھری۔

ابتہال کے تاثرات پتھر رہے، اس کی آنکھوں میں خاموشی ٹھہری رہی۔ لب بھینچے رہے۔
"تمہاری اسٹیپ مام اور اسٹیپ سسٹرز کے ساتھ آ رہے ہیں!! میری تو انوشے آنٹی سے فون پر بہت لمبی بات ہوئی تھی۔ وہ میرے لیے اٹلی سے کپڑے لائیں گی!! آئم سو ایکسائیٹڈ!" دھپ سے وہ نیچے اتری اور اس کے سامنے بنچ پر بیٹھ گئی۔
"ذرا بتاؤ تو۔ تمہارے ڈیڈ آ رہے ہیں۔ کیسی فیلنگز ہیں؟"
ابتہال کے اطراف میں دور تک پھیلا ہوا سبزہ سیاہ ہو گیا۔ درخت کا گھنا سایہ وحشتوں میں ڈھل گیا۔ آنکھوں میں تاریکی آ گئی۔
"میرے ڈیڈ!؟" لب بھینچ کر اس نے درفشاں کو دیکھا۔
"یس تمہارے ڈیڈ!" درفشاں کو جانے کیوں مزا آ رہا تھا۔ اس کے چہرے کا اترتا ہوا رنگ، آنکھوں سے جھلکتا ہوا غم۔ اور تاثرات کی تندہی اسے مزا دے رہی تھی۔
"اگر تمہارا باپ مر کر زندہ ہو جائے۔ تو تمہاری کیا فیلنگز ہوں گی؟"
درفشاں کی مسکراہٹ یک لخت سمٹی۔
"میرے ڈیڈ کی بات کیوں کر رہی ہو؟ وہ تو میرے پاس ہیں۔ مجھے چھوڑ کر نہیں گئے۔"
"اسی لیے باپ ہیں کیونکہ چھوڑ کر نہیں گئے!؟" ابتہال کی ہنسی چھوٹ گئی۔ لاؤنج کی دیوار گیر کھڑکیوں سے ثمرہ نے یہ منظر انتہائی ناگواری سے دیکھا تھا۔ انہیں اپنی بیٹی کا اس طرح ابتہال کے قریب پھٹکنا انتہائی گراں گزرتا تھا۔
"مائنڈ یور لینگویج۔" درفشاں کا چہرہ سرخ ہو گیا، نتھنے پھول گئے۔ "میرے ڈیڈ ایک عزت دار فیملی سے بلونگ کرتے ہیں، میری ممی کو وہ پورے خاندان کے سامنے بیاہ کر لائے تھے۔!" سر اٹھائے اس نے انتہائی متکبرانہ انداز میں کہا۔ "تمہاری ماں نے تو بھاگ کر شادی کی تھی! چوری چھپے، کورٹ میرج!"
ابتہال اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
"اسی عزت دار باپ کا ایک بھائی انتہائی بے غیرت نکلا۔ وہی بھائی۔ تمہارا شاہ زیب چاچو۔ اس کی بھی تو بات کرو۔"
اس کا وہ جملہ اس طرف آتے ہوئے ثمرہ نے سن لیا تھا۔ آگے بڑھ کر اس نے ایک تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا۔
"بدتمیز، بے حیا لڑکی۔ شرم نہیں آتی ایسے لفظ ادا کرتے ہوئے؟ میرال نے تمیز نہیں سکھائی تمہیں؟"
"تمیز میرے باپ نے سکھائی تھی، اس نے نہیں سکھائی!" آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر وہ بولی۔
"باپ؟ ہمیں کیا معلوم تمہارا باپ کون ہے؟ ماموں نے پتا نہیں کس کا گناہ ہمارے سر لا کر منڈھ دیا۔" اور کوئی دلیل نہ رہتی تو یہی خنجر رہ جاتا۔
"اگر میں گناہ ہوں تو آپ کے دیور کا ہوں۔" اس کی آنکھوں کا غصہ اور مشتعل وجود انہیں لمحے بھر کے لیے ساکت کر گیا۔
"اس سے بازپرس کر لیں پہلے۔ اسے بے حیا اور بدتمیز کہہ لیں۔ پھر میرا سامنا کیجیے گا!"
"میں تمہاری زبان کھینچ لوں گی!" ثمرہ کا غصہ بڑھ گیا۔ ابتہال کی بدتمیزی پر خون کھول اٹھا۔ عصمت بیگم ملازمہ کے بتانے پر تیزی سے باہر آئی تھیں۔
"یہ کیا ہو رہا ہے یہاں!" ان کی رعب بھری آواز گونجی تو ثمرہ فوراً ان کی طرف لپکی۔ سارا حال کہہ سنایا۔

عصمت بیگم آنکھوں میں غیض لیے اسے دیکھے جا رہی تھیں۔
"بڑی ..... اب یہ لڑکی شاہ زیب کو گالی دے گی؟" ثمرہ نے انتہائی حقارت سے اس کی جانب اشارہ کیا۔

digest library.com

"گالی تو آپ نے اپنے دیور کو خود دی ہے۔ مجھے ناجائز کہہ کر۔"
"ابتہال!" عصمت بیگم کی دھاڑ سی آواز گونجی۔ "ایک لفظ اور نہیں!"
ثمرہ نے ہاتھ اٹھایا تھا، گال پر نشان ثبت تھے، آنکھوں میں نمی ٹھہری تھی مگر تاثرات انتہائی پتھریلے اور سخت ہو رہے تھے۔
"آئندہ ہمارے گھر کے کسی بھی فرد کے لیے تم نے ایسی گھٹیا زبان استعمال کی تو ہم سے برا کوئی نہیں ہوگا!" انہوں نے واضح لفظوں میں دھمکی دی تھی۔
"جو گھٹیا زبان میرے لیے استعمال ہو رہی ہے، اس کا کیا کریں گی؟"
"یہ بڑوں کے معاملات ہیں، تمہیں اس میں پڑنے کی قطعاً ضرورت نہیں!"
"بڑے اپنے معاملات چھوٹوں تک کیوں لا رہے ہیں؟"
عصمت بیگم کے لب سختی سے بھنچ گئے۔
"انتہائی بدتمیز لڑکی ہو، بڑوں کا ادب لحاظ کچھ نہیں سکھایا ماں نے!!"
"ماں سکھاتی ہے؟ تمیز لحاظ، ادب؟ شاہ زیب کو تو آپ نے کچھ نہیں سکھایا۔"
ثمرہ کا صدمے سے منہ کھلا۔ قریب تھا کہ عصمت بیگم ایک اور تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیں، یا شاید بالوں سے پکڑ لیں۔
"آپ نے تو اپنے بیٹے کو غیرت بھی نہیں سکھائی۔" اس کے الفاظ چابک کی طرح عصمت بیگم کے وجود پر لگے اور ان کا ہاتھ اٹھ گیا۔ بالوں سے پکڑ کر انہوں نے اس کا سر بیچ پردے مارا تھا۔ تھپڑوں کی بارش شروع ہو گئی تھی۔ اب وہ چیخ رہی تھیں۔ شاہ زیب پر کوئی حرف آئے، اس کے کردار پر کوئی سوال اٹھے، ان کی تربیت پر کوئی اعتراض ہو، ان سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ ثمرہ نے انہیں نہ روکا۔ درفشاں منہ پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی۔
انہوں نے انتہائی غضب کے عالم میں اسے بازو سے پکڑا اور کھینچتے ہوئے اندر لے گئیں۔ میرال کچن میں تھی، اس کے قدموں میں لا پھینکا۔
"تو یہ تربیت دی ہے تم نے اپنی بیٹی کو۔" ان کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ میرال نے متوحش ہو کر ابتہال کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ سے برتن چھوٹ گیا۔ فوراً جھک گئی۔ ابتہال کا چہرہ تھاما۔
"یہ۔ یہ گالی دے گی ہمیں؟ یہ سوال اٹھائے گی ہماری تربیت پر؟"
خون کی دھار اس کی پیشانی سے پھوٹ رہی تھی، آنکھیں کھلی تھیں، حواس بحال تھے، وہ پتھریلی نگاہوں سے ابھی بھی عصمت بیگم کو دیکھ رہی تھی۔ شور شرابا سن کر ملازم اکٹھے ہو گئے۔ کامران آج آفس نہیں گئے تھے، آوازیں سن کر وہیں آ گئے۔
"میں تو سمجھتی رہی بھولی بھالی ہے، تمیز شعور والی ہے مگر اسے تو تم نے اپنے جیسا بنا دیا۔ ایسی گندی زبان استعمال کی ہے خدا کی پناہ۔ جاہل گنوار۔!" ان کے منہ میں جو آ رہا تھا وہ بول رہی تھیں۔
اپنے دوپٹے کے پلو سے خون صاف کرتی، اس کے گال پر ہاتھ رکھتی، اسے اپنی جانب متوجہ کرتی میرال کسی طور حواسوں میں نہ تھی۔ اس کے کان بند ہو چکے تھے، اور زبان کو تالا لگ چکا تھا۔ وہ عصمت بیگم کو نہیں سن رہی تھی۔ وہ صرف ابتہال کو دیکھ رہی تھی۔ جس کی آنکھوں میں اس قدر وحشت ٹھہری ہوئی تھی کہ اسے اپنے آس پاس

موت کے سناٹے نظر آنے لگے۔

کامران نے عصمت بیگم کو پیچھے ہٹایا تھا، وہ انہیں روک رہے تھے مگر عصمت بیگم کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھیں۔ چاہتی تھیں کہ میرال ابھی کے ابھی اپنی بیٹی کو لے کر اس گھر سے دفع ہو جائے۔ گھر میں اچھا خاصا ہنگامہ مچ گیا۔

''ہم نے اس پر ترس کھایا، ہمدردی کی اور یہ دیمک بن کے ہمیں ہی اندر سے کھا رہی ہے۔'' ان کی آواز کچن سے باہر راہداری تک آتی رہی۔

اور میرال ہالہ کو کندھوں سے پکڑے اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

شام کے جانے کس پہر آنکھ کھلی تو جسم بخار میں پھنک رہا تھا۔ ہلکی روشنی میں اسے میرال سرہانے بیٹھی نظر آئی۔ اس کی آنکھیں سرخ اور متورم تھیں، چہرہ ستا ہوا تھا، آنسو اتنے بہہ چکے تھے کہ گالوں پر نمی کی تہہ ٹھہری ہوئی تھی۔

وہ اٹھ کر بیٹھی تو فوراً سائڈ ٹیبل سے دودھ کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ گھونٹ گھونٹ پی چکی تو میرال نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے میرال کی آنکھوں میں ٹھہری ساری نمی اور بہت سارا اندھیرا دیکھا۔ زندگی بھی دیکھی اور موت کا سناٹا بھی دیکھا۔

''کیوں کیا ایسے؟ منع کیا تھا کسی کے ساتھ مت الجھا کرو، اگنور کیا کرو!''

میرال نہیں جانتی تھی، وہ جانے کب سے اور کتنی باتوں کو نظر انداز کرتی آ رہی تھی۔ زہر قطرہ قطرہ رگوں میں سرایت کرتا رہا تھا۔ برداشت ٹوٹ رہی تھی۔ اب وہ ہمت نہیں رہی تھی، اب وہ صبر نہیں رہا تھا۔ ابتہال بڑی ہو رہی تھی۔ اس کے لیے اس گھر کے ہر اصول کا نظریہ بدل رہا تھا۔ ہر شخص کی پہچان ہو رہی تھی۔ اپنی حیثیت سمجھ آ رہی تھی۔

''ہماری زندگی پہلے ہی بہت تنگ ہے ابتہال۔ اسے مزید تنگ نہ بناؤ۔''

''ہماری زندگی؟'' اس کے لبوں پر استہزائیہ مسکان ابھری۔ ''اپنی زندگی کی بات کریں۔ اپنی بات کریں۔'' وہ نظروں کا رخ بدل گئی۔ لحاف بھی اچھے سے اوڑھ لیا۔

''تم مجھ سے الگ ہو گئیں؟''

''میں آپ کے ساتھ، آپ کی زندگی میں کب ہوں؟''

میرال آنکھوں میں بے بسی لیے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''اور کتنی بار کہا ہے یہ فکرمندی کا ناٹک مت کیا کریں، میری زندگی جہنم بھی آپ کی وجہ سے ہے، عذاب بھی آپ کی وجہ سے ہے۔ سو پلیز!'' اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ چاہتی تھی میرال اس کے بستر سے اٹھ جائے اسے نظر بھی نہ آئے۔

''کھانا کھا لو!'' اس کی باتوں کا قطعی برا مانے بغیر اس نے کہا۔

''نہیں کھانا۔ مہربانی!'' کہہ کر لیٹ گئی۔

صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ میرال کمرے میں نہیں تھی اور ملازمہ اسے بلانے آئی تھی۔ پہلے تو وہ کچھ دیر تک اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ پھر اس نے شال اوڑھی اور اس کے پیچھے عصمت بیگم کے کمرے تک آ گئی۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ گھر کے تمام افراد کمرے میں موجود تھے۔ عصمت بیگم، ان کے دو بڑے بیٹے کامران اور نعیم، ان کی بیویاں اور بیٹیاں، بیٹے بھی۔

میرال مجرموں کی طرح ان کے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی۔ عصمت بیگم نے اپنا حکم سنا دیا تھا۔ وہ انہیں

گھر سے نکال رہی تھیں۔

اس نے میرال کو دیکھا۔ وہ ستے ہوئے چہرے کے ساتھ ابتہال کی ہر غلطی کی معافی مانگ رہی تھی۔

"آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ ابتہال کو میں نے سمجھایا ہے، وہ اب ایسا نہیں کرے گی۔" وہ بار بار کہہ رہی تھی۔ بار بار یقین دلا رہی تھی۔

digest library.com

"آپ خود سوچیں جوان بچی ہے، میں اسے لے کر کہاں جاؤں گی!"

اور تب ہی عصمت بیگم کی نگاہ اس پر پڑی۔ اعصاب مزید تناؤ کا شکار ہو گئے۔ وہ آہستگی سے اندر آ گئی تھی۔ میری آنکھوں میں عجیب سی چمک آ گئی تھی۔ چیونگم چباتے ہوئے وہ اسے یک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔

"اس سے کہو، معافی مانگے ہم سے!"

میرال اپنی جگہ تھم گئی تھی۔ پہلو میں ابتہال کھڑی ہے، اس بات کا ادراک اسے اب ہوا تھا۔ اس نے اپنے تئیں معاملہ سلجھانے کی کوشش کی تھی مگر عصمت بیگم کو اس کی معافی سے کوئی سروکار نہ تھا۔

"کس بات کی معافی مانگنی چاہیے مجھے؟" اس کی داہنی آنکھ پر سوجن تھی اور پیشانی پر بھی چوٹ کا نشان واضح تھا۔ تاثرات ازلی سرد مہری لیے ہوئے اور انداز اجنبی سا تھا۔

"جو کل تم نے ہمارے ساتھ بدتمیزی کی!" عصمت بیگم نے ضبط کر کے اسے یاد دلایا۔

"بدتمیزی نہیں کی تھی، جواب دیا تھا۔ سوال کیا تھا۔"

کامران ٹانگ پر ٹانگ رکھے اسے دیکھے جا رہے تھے، آنکھوں میں دونوں ماں بیٹی کے لیے ناگواری ہی ناگواری تھی۔ انہیں پہلے دن سے ان دونوں کے اس گھر میں رکنے اور پھر رہنے پر اعتراض تھا۔

"ابھی بھی ہٹ دھرمی پر قائم ہو!"

"معافی کی بات انسان تب کرتا ہے جب اس نے سزا نہ دی ہو۔ آپ تو مجھے سزا دے چکیں۔" اس نے شال ہٹا کر اپنا بازو، اپنا چہرہ، اپنی پیشانی کا زخم بھی دکھایا۔

"غصہ آپ نے دکھا دیا، مار بھی پیٹ بھی کر لی۔ معافی کس بات کی؟ مجھے بتائیے۔ میں مانگ لیتی ہوں؟"

میرال دم سادھے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کا لہجہ ایک لمحے کے لیے ڈگمگایا تھا، نہ ہی آواز کانپی تھی۔ اسے گھر کے کسی فرد کا کوئی خوف نہیں تھا۔ نہ کچھ چھن جانے کا ڈر تھا۔ ایسی بہادری اس نے کبھی نہیں سکھائی تھی۔ ایسی بغاوت پر بھی نہیں اکسایا تھا۔ اس نے سامنا کرنا سکھایا ہی نہ تھا۔ ہمیشہ اس کی کوشش رہی وہ گھر والوں کے سامنے نہ آئے۔ چپ رہے۔ چھپی رہے۔ اور اب جب وہ سامنے آ گئی تھی تو۔

اس کا یہ رخ، یہ رویہ اور انداز۔ اسے لگا وہ ابتہال کو نہیں جانتی۔ ابتہال کی نفرت صرف ان تک محدود نہ تھی، غصے اور عداوت کی حد اس تک نہ رہی تھی۔

کیا یہ سب اس لیے کہ شاہ زیب آ رہا ہے۔ یا اس لیے کہ عصمت بیگم نے رشتے کی بات کر ڈالی ہے؟

میرال کے دل پر کوئی ثقیل شے ٹھہر گئی۔ عصمت بیگم غصے سے ابتہال کو دیکھے جا رہی تھیں۔ کامران نے مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔

"تمہاری اب اس گھر میں کوئی جگہ نہیں۔" عصمت بیگم نے کروفر سے حکم سنا دیا۔

انہیں لگا میرال روتی گڑگڑاتی ان کے قدموں میں گر جائے گی۔ اس کی حالت زار دیکھ کر ابتہال کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑے گا۔ مگر میرال صدمے سے ابتہال کو دیکھے جا رہی تھی۔ یہ واضح تھا وہ معافی نہیں مانگے گی۔ اس کا سر نہیں جھکے گا۔ غلطی تسلیم نہیں ہوگی۔ حساب برابر نہیں ہوگا مگر پھر۔

"مجھے معاف کر دیں!" ابتہال شاہ زیب نے عصمت بیگم کے سامنے ادب سے جھکا دیا۔ میرال حیران رہ

ششدر اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس کی یہ حرکت انتہائی غیر متوقع تھی۔
"مجھے خاموش رہنا چاہیے تھا!" اس نے اعتراف بھی کیا۔
عصمت بیگم کا سر اٹھا رہا۔ معافی قبول نہ ہوئی۔
میرال اسفند نے ابتہال شاہ زیب کو عصمت آراء کے پیروں میں بیٹھے دیکھا۔ عصمت بیگم کے اعصاب کو ڈھیلے پڑے، آنکھوں میں ہنوز نفرت ٹھہری رہی۔ انہوں نے ہاتھ سے جانے کا اشارہ دیا۔ ابتہال اپنی جگہ سے اٹھ کر مڑی۔ میرال اسفند نے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ تھی اور ویران آنکھوں میں ایک شاطرانہ چمک۔
ابتہال اس کے پاس سے گزر کر جا چکی تھی مگر میرال اسفند وحشتوں میں گھری کھڑی رہ گئی تھی۔

digest.library.com

☆☆☆

وادی ہرنائی میں ہر سو دھند چھائی ہوئی تھی، فضا میں چیڑ کی مہک بسی تھی، دیودار اور اخروٹ کے درختوں سے بھرا جنگل سناٹوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ چیڑ کے کئی پتے اس کے پیروں تلے چرمرا گئے، کہیں سے پرندوں نے اڑان بھری، کہیں جھاڑیوں میں ہلچل ہوئی۔
وہ بیدار ہو چکی تھی، جنگل اب بیدار ہو رہا تھا۔
وہ سانس لیتی تو فضا میں گھنے بادل اٹھ جاتے۔ رک جاتی تو جنگل بھی تھم جاتا، پتے ساکن، شاخیں جھک جاتیں، سر اٹھائے وہ کتنی ہی دیر تک فضا میں رچی اس مانوس سی گیلی خوشبو کو اندر اتارتی رہی۔
خوشبو ریشے اور کنیر کی تھی، چیڑ کی تھی......
"صبح بخیر!" دونوں ہاتھ ہونٹوں کے قریب لا کر وہ بلند آواز چلائی۔
جنگل اس کا ساتھی، اس کا ہمراز تھا، سن کر جاگا، ہنسا پھر دھند میں سما گیا۔
اب وہ قدم اٹھاتی جا رہی تھی اور دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے درختوں کی شاخوں کو ہٹاتی جا رہی تھی۔
بارش رات بھر ہوئی تھی، ہوائیں بھی تیز چلی تھیں، اس دوران کئی شاخیں ٹوٹی تھیں، کئی پتے بکھرے تھے، کئی پتھر لڑھکے تھے، کئی گھونسلے گرے تھے، پرندوں نے کل رات بہت شور مچایا تھا، مگر جنگل نے وہ آوازیں اپنے اندر دبالی تھیں۔
جنگل باتیں کرتا تھا، وہ اسے سب بتاتا جا رہا تھا، وہ سنتی جا رہی تھی، دیکھتی جا رہی تھی، اور پھر وہ ایک منظر ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آ کر ٹھہر گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ رک گئی تھی۔
جنگل نے پھر سے آواز دی تھی، جنگل نے پھر سے چونکا دیا تھا، اس نے اب کے دائیں جانب گردن گھمائی۔
جنگل میں رات کا سماں تھا، برستی بارش میں کوئی مٹی کھود رہا تھا، پاس ہی گٹھری نما کوئی شے رکھی تھی۔ بادل گرج رہے تھے، بجلی چمک رہی تھی، موسلا دھار بارش میں مٹی کھودتا وہ انسان پل بھر کے لیے رک گیا تھا۔
"ہالہ!" یکا یک ایک مانوس آواز بلندیوں سے اٹھی، ابتہال ایک جھٹکے سے مڑی۔
اسے پتھروں کے اس پار وشی نظر آئی۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ وادی کی طرف جا رہی تھی، اس نے دور سے ہاتھ ہلایا۔ جواباً اس نے بھی ہاتھ لہرایا۔
"ماکان سے ملو تو اس سے کہنا۔ اس کا قلم ظاہر کے پاس ہے!"
ایک پیغام تھما کر وشی چلتی بنی، گھنے درختوں کے جھنڈ میں کہیں غائب ہوئی۔
اپنا سانس روکے ابتہال نے سر جھٹکا، پھر گھوم کر اس نے چاروں اور دیکھا۔
ہرنائی کا جنگل اب خاموش ہو چکا تھا۔ اس کے راز زمینی گہرائیوں میں اتر چکے تھے، اس کی فضا میں اب کوئی رمز نہ رہا تھا۔
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عمارہ صفدر

باسی سالن

"فاطمہ، فاطمہ بیٹا کہاں ہو آپ؟" کچن سے صبیحہ اپنی لاڈلی کو آوازیں دے رہی تھیں لیکن وہ تھی کہ مس کرنہ دے رہی تھی اس لیے انہیں کچن سے باہر آنا پڑا اور یہ دیکھ کے تو صبیحہ بیگم کا پارہ آسمان کو چھو گیا کہ فریحہ صاحبہ لاؤنج کے صوفے پر نیم دراز کانوں میں ہینڈ زفری لگائے دنیا مافیہا سے بے خبر گانوں پہ سر دھن رہی تھیں۔

انہوں نے آگے بڑھ کر کھینچ کے فریحہ کے کانوں سے ہینڈز فری نکالے وہ ہڑبڑا کے اٹھی۔

"کیا ہوا امی! ابھی کام سے فارغ ہو کہ تھوڑی

دیر کے لیے لیٹی تھی لیکن آپ کو پھر اب کوئی کام یاد آ گیا ہوگا۔" وہ روہانسی ہو کے بولی۔

"ہاں تو میں نے تم سے کہا تھا کہ جب فارغ ہو جاؤ۔ تو جا کے اماں بی کو سالن دے آنا، وہ جلدی کھانا کھا لیتی ہیں پر تمہیں کوئی بات یاد رہے تو جب ناں۔" صبیحہ بیگم فاطمہ کو ڈپٹتے ہوئے بولیں۔

اماں بی صبیحہ بیگم کے پڑوس میں رہتی تھیں۔ جن کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ اولاد اللہ پاک نے دی نہیں اور شوہر بھی چند مہینے پہلے اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ صبیحہ بیگم کے شوہر ملک سے باہر ہوتے تھے اور وہ اپنے دو بچوں فاطمہ اور حمدان کے ساتھ اماں بی کے پڑوس میں ہی رہتی تھیں۔

جب سے اماں بی کے شوہر کی وفات ہوئی تب سے صبیحہ بیگم ہی اماں بی کو صبح شام سالن بھجواتی تھیں تا کہ انہیں اپنی اکیلی جان کے لیے سالن بنانے کی پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔

ابھی بھی وہ فاطمہ سے کہہ رہی تھیں کہ وہ جا کے وقت پہ اماں بی کو سالن پہنچا آئے۔

"ور نہیں، میں بالکل بھی اماں بی کو یہ باسی اور بچا ہوا سالن نہیں دینے جاؤں گی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا باسی اور بچا ہوا سالن یہ آلو بینگن میں نے کل رات کو بنائے ہیں اور ابھی بھی اچھے سے گرم کر کے رکھے ہیں۔" صبیحہ بیگم نے غصے سے فاطمہ سے کہا۔

"یہی تو بات ہے امی کہ آپ نے کبھی بھی اماں بی کو تازہ سالن نہیں دیا۔ ہمیشہ پچھلے دن کا دیا اور بچا ہوا دیا، آپ نے کبھی بھی ان کے لیے پہلے سے سالن نکال کے نہیں رکھا ہمیشہ جو ہمارے کھانے کے بعد بچ جاتا ہے وہ آپ اماں بی کو بھجوا دیتی ہیں اور نہ ہی آپ نے کبھی انہیں گوشت یا مرغی کا بھنا ہوا سالن دیا ہمیشہ آخر میں ایک بوٹی میں پانی ملا کے پتلا شوربہ بنا کے دے دیتی ہیں، امی اگر آپ نے نیکی کرنی ہی ہے تو کم از کم اپنی نیت تو صاف رکھیں کیونکہ اللہ پاک تو انسان کی نیت دیکھتے ہیں نہ کہ یہ کہ انسان زیادہ دے رہا ہے یا تھوڑا۔" فاطمہ نے بے بسی سے کہا وہ کب سے اپنی امی کی یہ حرکت نوٹ کر رہی تھی لیکن بولنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی لیکن آج اس نے اتنے دنوں کا جمع شدہ غبار نکال ہی دیا۔

"ارے میں پتلا شوربا تو اس لیے دیتی ہوں کہ کہیں ان کی طبیعت بھنا ہوا سالن کھا کے خراب ہی نہ ہو جائے اور رہی بات دوسرے سالن کی تو دوسرے دن تم ہی لوگوں کے حلق سے باسی سالن نیچے نہیں اترتا، اب وہ میں ضائع تو نہیں کر سکتی نا اور اماں بی بغیر کسی نخرے کے کھا لیتی ہیں اس لیے انہیں بھجوا دیتی ہوں، اب بس بحث ختم کرو اور اماں بی کو سالن پہنچا کے آؤ۔" صبیحہ بیگم تن فن کرتی وہاں سے چلی گئیں۔

وہ جانتی تھی کہ وہ اپنی امی کو نہیں سمجھا سکتی کیونکہ صبیحہ بیگم کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو آسانی سے اپنی غلطی نہیں مانتے وہ بس دعا ہی کر سکتی تھی۔

☆☆☆

آج صبح سے ہی صبیحہ بیگم کا ارادہ اپنے میکے جانے کا تھا۔

صبیحہ بیگم کا میکہ شہر کے دوسرے کونے پہ تھا اس لیے ان کا آنا جانا بہت کم تھا کیونکہ ماں، باپ اور ایک عدد بھائی تھا جو بیوی بچوں کے ساتھ آباد تھا۔

اس لیے وہ جلدی جلدی ہاتھ چلا رہی تھیں تا کہ وقت پہ چلی جائیں اور شام سے ہونے سے پہلے واپس بھی آ جائیں جلدی سے کام ختم کر کے انہوں نے رکشا منگوایا اور تقریباً بارہ بجے وہ اپنے میکے پہنچ چکی تھیں۔

دروازہ ان کی بھابھی نازش نے ہی کھولا اور بہت تپاک سے نند بھاوج ایک دوسرے سے ملیں۔

"اللہ صبیحہ تم نے کتنے عرصے بعد چکر لگایا ہے اور کتنی دفعہ کہا ہے کہ بچوں کو بھی ساتھ لایا کرو، دونوں تو اتنے بے مروت ہیں کہ مہینوں ادھر کا رخ نہیں کرتے۔" نازش نے کہا۔

"بس بھابھی! دونوں ہی بہت مصروف ہوتے ہیں فاطمہ کی پڑھائی اور حمدان کا آفس۔ دونوں کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ کہیں آ جا سکیں۔ لے دے کے ایک اتوار کا دن ہوتا ہے اس میں بھی دونوں

اپنے اپنے کاموں میں ہی مصروف ہوتے ہیں۔"
صبیحہ بیگم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
"اچھا تم بیٹھو۔ میں تمہارے لیے پانی لاتی ہوں۔"
"بھابی! آمنہ نظر نہیں آرہی؟" نازش پانی لے کے آئی تو صبیحہ نے پوچھا۔
آمنہ صبیحہ کی سب سے بڑی بھتیجی تھی جو کہ گریجویشن کرنے کے بعد گھرداری سیکھنے میں مصروف تھی۔
"آمنہ آج اپنی کسی سہیلی کی طرف گئی ہوئی ہے کہہ رہی تھی کہ کھانا کھا کے آئے گی اور ہادی اور روحا ابھی کالج سے آتے ہی ہوں گے۔"
کچھ ہی دیر میں ہادی اور روحا بھی آگئے تو نازش کھانا لگانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔
جب سب کھانا کھانے بیٹھے تو صبیحہ کو عجیب لگا کہ نازش نے پیالے سے شوربے کی پلیٹ میں جس میں بوٹیاں تیر رہی تھیں۔ ان کے سامنے لاکے رکھیں جب کہ ہادی اور روحا کے سامنے ایک چھوٹے باؤل میں بھنا ہوا گوشت موجود تھا۔
صبیحہ کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر نازش جلدی سے بولی۔ "ابھی تو میں نے گوشت بنایا تھا لیکن مجھے پتا ہے تم دل کی مریض ہو اور بیف تمہاری صحت کے لیے اچھا نہیں ہے تو رات کو جو سالن بچ گیا تھا، میں وہ تمہارے لیے تازہ کر کے لے آئی کیونکہ مجھے پتا ہے کہ تم کھانے میں نخرے نہیں کرتیں۔"
نازش کی بات سن کر صبیحہ بیگم کے ذہن میں وہ سارے مناظر چلنے لگے کہ کس طرح وہ بھی بہت سی باتوں کا جواز بنا کے اماں بی کو باسی سالن کھلاتی رہی ہیں۔
انہوں نے دو چار نوالے زہر مار کیے اور جلدی سے اجازت لے کے گھر کو روانہ ہوئیں پورے راستے وہ اپنا محاسبہ کرتی آئیں۔
وہ سوچ رہی تھیں کہ اللہ نے انہیں نیکی کرنے کا کتنا اچھا موقع دیا ہوا ہے لیکن اس میں بھی وہ اپنی نیت صاف نہیں رکھ سکیں جب نیت میں ہی فتور ہوگا تو اجر کس چیز کا ملے گا۔
"کتنا سمجھایا تھا مجھے فاطمہ نے لیکن میں نے اس کی ایک نہیں سنی اگر آج میرے ساتھ یہ نہ ہوتا تو میری آنکھ کبھی نہ کھلتی۔"
وہ بے ساختہ اپنے رب کی شکر گزار ہوئیں کہ اللہ نے وقت پہ ان کی آنکھیں کھول دیں اور خود سے عہد کیا وہ آئندہ سب سے پہلے اماں بی کے لیے سالن نکال کر رکھیں گی اور چھوٹی سے چھوٹی نیکی کرتے ہوئے بھی اپنی نیت کو صاف رکھیں گی۔ وہ اٹھ کے وضو کرنے چل دیں کہ انہیں شکرانے کے نفل بھی تو ادا کرنے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے وقت پہ ان کی آنکھیں کھول دیں۔

☆☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

ملال زیست	آمنہ ریاض
بڑا آدمی	نسیم سحر قریشی
فصل غم کا گوشوارہ	رضیہ جمیل
دل اک گلشن	رضیہ جمیل
سوچ نگر کی رانی	رضیہ جمیل
حنا	نادرہ خاتون
چلمن	نادرہ خاتون

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

ساجدہ رمضان

کچھ یہاں محبت ہے

digestlibrary.com

"بھائی جان! آپ تو خاندان کی کسی تقریب میں شرکت ہی نہیں کرتے۔" رفاقت نے کمال سے محبت بھرا شکوہ کیا۔

"گاؤں کے لوگوں کی طرح فارغ تو نہیں بیٹھا، کاروباری بندہ ہوں سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔"

حیثیت اور شخصیت کا جو فرق اس کے بڑے گھر اعلیٰ قیمتی لباس اور انداز و اطوار سے ظاہر ہو رہا تھا اس فرق کا اظہار کمال نے اپنی زبان سے بھی کر دیا۔

رفاقت خفیف سا مسکرا دیا۔ اماں ٹھیک کہتی تھیں کہ شہر کی زہریلی آب و ہوا انسان کو زہریلا بنا دیتی ہے۔

"یہ بھی درست ہے مگر اپنوں کے لیے وقت تو نکالنا پڑتا ہے۔"

رفاقت نے جیسے اسے یاد دلانے کی کوشش کی کہ کمال کے سامنے اس کا کوئی ملازم نہیں بھائی بیٹھا ہے۔ جو اپنی شادی کا کارڈ بھجوانے کے بجائے بذات خود شادی پہ آنے کی دعوت دینے آیا ہے۔ اماں الگ فون کرتی رہتی تھیں۔

"جو اپنے ہیں ان کے لیے تو وقت نکال ہی لیتا ہوں۔"

کمال نے نہایت سادگی سے اسے ایک اور ضرب لگائی۔ وہ نجانے کس بات کا بدلہ لے رہا تھا۔

"چلیں میں چلتا ہوں، شیری کو میری طرف سے پیار دیجیے گا اور اگر وقت ملے تو شادی پہ بھی ضرور آیئے گا۔"

اسے مزید یہاں بیٹھنا دشوار لگا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "یہ رکھ لو۔"

کمال نے اپنے والٹ سے پانچ ہزار کے دو نوٹ نکال کر اس کی سمت بڑھائے۔

"یہ آپ نے مجھے میری شادی پہ آ کر دینا ہے۔"

اسے لگا کمال کا شادی پہ آنے کا ارادہ نہیں اور وہ اسے ایڈوانس نیگ دے کر ٹرخا رہا ہے۔

"او نہیں یار، یہ تمہارا جیب خرچ ہے، گاؤں سے اتنا کچھ لائے ہو۔" کچھ لوگ بڑے بے ڈھنگے ہوتے ہیں انہیں محبت دینے کا فن آتا ہے اور نہ ہی لینے کا۔ کمال شاید ان میں سے ایک تھا۔

رفاقت گاؤں سے سبزیاں، پھل، دیسی گھی، مکھن، انڈے، ساگ، اتنا کچھ لایا تھا کہ کچن بھر گیا تھا۔ اصیل مرغا الگ کونے میں پتلی ڈور سے بندھا کٹ کٹ کر رہا تھا جو خصوصاً شیری کے لیے لایا گیا تھا۔

"ہمارے خلوص کا جلوس تو نہ نکالیں بھائی جان! یہ چیزیں اماں نے بھجوائی ہیں۔ ان کی قیمت بھی اماں کو جا کر دے دیں۔" وہ ضبط کر کے تھک گیا تھا مگر کمال جوتے مار کے نہیں تھک رہا تھا۔

"تم تو برا ہی مان گئے یار۔" کمال نے رفاقت کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔

ثمرہ بھابھی گھر پہ موجود نہ تھیں۔ شیری کے اسکول سے آنے کا وقت ہو چلا تھا۔

اگر کمال جھوٹے منہ بھی اسے مزید کچھ دیر رکنے کا کہتا تو وہ شیری سے مل کر روانہ ہوتا۔ مگر کمال نے تو اس سے پانی تک کا نہ پوچھا تھا۔ اوپر سے اس کا دل

جلانے والی گفتگو کی تھی، وہ اپنے شہر آنے پر پچھتا رہا تھا۔

نفیسہ بیگم کو آج بھی یاد تھا کہ ایجاب وقبول کے بعد وہ اور صابر علی اسٹیج پر بیٹھے تھے۔

جب زینت باجی نے جو کہ اس کی دیورانی بھی تھیں۔ ہنستے ہوئے تین سالہ کمال کو اس کی گود میں یہ کہہ کر ڈال دیا کہ اللہ تمہیں میرے کمال جیسا بیٹا دے۔ وہ تو شرم سے سر جھکا گئیں مگر ساتھ بیٹھے صابر علی نے ضرور آمین کہا۔ اس کے زرتار چمکیلے، کام والے لباس کو چھوتا، زیور سے کھیلتا ”سوہنڑی خالہ۔“ کہہ کر خوشی سے کھلکھلا اٹھتا۔

باراتیوں کو گاڑیوں میں سوار کراتے، زیور، تحفے سنبھالتے، زینت ایسا مصروف ہوئیں کہ انہیں کمال بھول ہی گیا۔ نفیسہ کے گاڑی میں سوار ہونے کا وقت آیا تو رشتہ دار خواتین کو اس کی گود میں سوئے کمال کا خیال آیا۔

یہ سچ تھا ایک ہی پوزیشن میں بیٹھنے سے خاصی مشکل ہوئی تھی، مگر اس کی گود میں سویا، گھنگھریالے بالوں اور سیب کے سے سرخ گالوں والا کمال اتنا پیارا تھا کہ اسے یہ مشکل بالکل بھی بری نہ لگی تھی۔

☆☆☆

پھر وہ ہوا جو کسی کے گمان میں بھی نہ تھا۔ رات کے اندھیرے اور شدید دھند میں ڈرائیور سامنے سے آتے ٹرالر کو نہیں دیکھ پایا تھا۔ تصادم سے بچانے کی کوشش میں گاڑی نہر میں جا گری تھی۔ کہرام تھا جو دسمبر کی شب آخر میں اس سڑک پہ مچ گیا تھا۔ قیامت تھی جو دلوں پہ ٹوٹ گئی تھی۔

اس نے سکتے کی سی کیفیت میں کمال کو کلیجے سے لگایا تو پھر ساری عمر لگائے رکھا۔ ساس سسر، زینت اور اس کا شوہر برکت علی، بڑی نند سمیرا، سب کے سب جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ سسرال تو کیا گاؤں بھر میں منحوس مشہور ہو جانے والی نفیسہ، کمال کے لیے برکت کا سامان بنی رہی۔

کمال نہ تو اتنا چھوٹا تھا کہ اسے ماں باپ کی یاد

نہ ستاتی اور نہ ہی اتنا بڑا کہ موت کے معنی ومفہوم سے آشنا ہو پاتا۔ سو وہ کمروں میں جھانک کر امی، ابو چلاتا پھرتا اور روتا۔ نفیسہ میرا لعل کہتے اس کے پیچھے دوڑتی پھرتی۔

ماں باپ کو کہیں نہ پا کر۔ وہ تھک ہار کر اس کی آغوش میں پناہ لیتا۔ اللہ نے اسے دو بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا مگر اس کے دل سے کمال کی محبت کم نہ ہوئی۔ وہ پہلے پڑھنے کے لیے شہر رہا مگر شادی کر کے مستقل رہائش اختیار کر لی۔ کاروبار بھی جما لیا۔ اور پھر ترقی کی دوڑ، دوڑتے گاؤں میں چھوڑے تمام مخلص رشتوں کو کہیں پیچھے چھوڑ دیا۔

دس میں سے کسی ایک کال کا جواب دیتا۔ سالوں بعد گھنٹے دو گھنٹے کے لیے کسی تقریب میں شرکت کرتا۔ ہاں مگر گاؤں سے آنے والی سوغاتیں پورے حق سے وصول کرتا۔

”آپ اتر جائیں مجھے واپس جانا ہے۔“

گاڑی جھٹکے سے رکی تو وہ چونکا۔

کمال نے اسے بس اسٹیشن تک چھوڑنے کے لیے اپنے ڈرائیور کو بھیجا تھا۔ ڈرائیور کے چہرے پہ پریشانی کے آثار واضح تھے۔

"کیا ہوا ہے۔" اس نے پریشانی سے سوال کیا۔

"شیری بابا کو چوٹ لگ گئی ہے۔"

"چلو واپس چلو۔" وہ چلا اٹھا۔

"صاحب کا حکم ہے میں آپ کو یہیں چھوڑ کے آؤں۔" ڈرائیور نے خاصی بدتمیزی سے کہا۔ جس گھر کے مالک آپ کو عزت نہ دیں اس گھر کے نوکر بھی آنکھیں دکھانے لگتے ہیں۔

"میں صاحب کا بھائی ہوں۔ میرا حکم بھی مانو اور اسپتال چلو۔" اس نے جواباً غصے سے کہا تو ڈرائیور نے گاڑی اسپتال کی طرف موڑ لی۔

وہ اسپتال پہنچا تو ثمرہ سامنے بیٹھی آنکھیں بند کیے دعاؤں کا ورد کر رہی تھی۔ کمال ادھر سے ادھر ٹہلتا فون پہ لگا ہوا تھا۔ ثمرہ نے قدموں کی چاپ پہ سر اٹھایا۔

"خون بہت بہہ گیا ہے، ابھی تک خون کا بندوبست نہیں ہوا۔" ڈرائیور تو موقع پہ ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ دسمبر کا وسط تھا۔ دھند ایسی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ شیری کی گاڑی سامنے سے آتی گاڑی سے ٹکرا گئی۔

کمال بلڈ بینک والوں سے مایوس ہونے کے بعد اپنے دوستوں سے رابطے کی کوشش کر رہا تھا۔ شیری کا بلڈ گروپ او نیگیٹو تھا جو کہ فوری ملنا خاصا مشکل تھا۔

"بھائی جان! میں خون دے سکتا ہوں۔" اس نے تیزی سے آ کر، کال کے دوران ہی کمال سے کہا تو اس نے ناگواری سے ہاتھ کا اشارہ کر کے واپس جا کر بیٹھنے کو کہا۔

شیری کا بلڈ گروپ جانے بغیر کال کے بیچ میں جس طرح رفاقت کو کمال نے ٹوکا تھا۔ از حد پریشان ہونے کے باوجود بھی اسے برا لگا تھا۔

"آپ لوگوں نے ابھی تک بلڈ ارینج نہیں کیا۔" رفاقت نے نرس کی سمت دیکھا۔ ثمرہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کمال ابھی تک کال پہ لگا ہوا تھا۔

"میرا بلڈ لے لیں سسٹر۔" نرس نے برا منہ بنایا۔

"حد ہے، ابھی تک کس چیز کا ویٹ کر رہے تھے آپ۔"

وہ اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی آگے بڑھ گئی۔ جبکہ وہ کہہ نہ سکا کہ وہ اپنی بات سنی جانے کے انتظار میں تھا۔

شیری کو خون لگا دیا گیا۔ وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آیا تھا مگر اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔

"مزید ایک اور بوتل کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔" نرس نے اسے خبردار کیا۔

"میرے جسم کے خون کا ہر قطرہ اس پر قربان، بس وہ ٹھیک ہو جائے۔"

اندر داخل ہوتے کمال کا دھاڑیں مار کر رونے کو جی چاہا۔ جب وہ خون کے لیے کال کرتا ہلکان ہو رہا تھا تب ثمرہ نے اسے آ کر بتایا کہ رفاقت بلڈ دے رہا ہے۔

اتنی دیر بعد اس کے لیے جوس لے کر اندر جاتا اس بات پر واپس پلٹ آیا۔

☆☆☆

بہت سارے دن بیت گئے۔ شیری اسپتال سے لوٹ آیا۔ گاؤں سے رشتہ داروں کا تانتا بندھ گیا۔

اس بار کمال سب سے بہت محبت اور احترام سے ملا اور خوب خاطر مدارت کی۔ نفیسہ بیگم بھی چند دن رہ کر چلی گئی تھیں کہ رفاقت کی شادی سر پہ تھی۔

دسمبر اختتام پذیر ہوا تو وہ لوگ شادی سے ایک ہفتہ قبل ہی گاؤں روانہ ہو گئے۔

"میرا لعل۔" نفیسہ بیگم نے کمال کو اپنے ساتھ لگایا تو دیر تک ساتھ لپٹائے کھڑی رہیں۔ صابر علی بھی کمال سے بے پناہ محبت کرتے تھے مگر نفیسہ بیگم کی محبت اس سے خالص ماؤں والی تھی۔

"جیسے جیسے عمر کی منزلیں طے کر رہے ہو شفقت بھائی کی مشابہت بڑھتی جا رہی ہے تم میں۔" قدسیہ

پھپھو نے نم اور محبت پاش لہجے میں کہا۔
سارہ چمکتے ہوئے نئے برتن، نئے لحاف نکال رہی تھی۔ ''بھابھی یہ، بھابھی وہ۔'' کہتے اس کی زبان ہی نہ تھک رہی تھی۔

☆☆☆

''میرے مونڈھے (کندھے) پہ بیٹھو تمہیں باغ کی سیر کرالاؤں۔''
اگلے روز جب دھند کچھ چھٹی تو سہیل کے بیٹے اسد نے اکڑوں بیٹھ کر شیری کو اپنے کندھے پہ سوار ہونے کی دعوت دی۔
شیری پاؤں پہ لگنے والی چوٹ کے باعث ابھی ٹھیک طرح چل نہیں پاتا تھا۔
بھینسوں، گائے، بکریوں اور مرغیوں کی منصفانہ تقسیم کے بعد اب باغ کی باری آئی تھی۔
''کمال بھائی! آپ کے باغ میں گاؤں کے تمام باغات سے زیادہ پھل لگتا ہے۔'' وہ سب بھی بچوں کے ساتھ باغ میں چلے آئے تھے جب سارہ نے کہا۔
''میرا باغ......'' وہ حیران ہوا۔ اس نے تو بہت پہلے اپنی زمین فروخت کردی تھی۔
''تیری زمین میں نے خرید لی تھی، رفاقت نے باغ لگایا تو تیری زمین پر بھی لگوا دیا۔ باغ کی آمدن سے ہی تو تیرے لیے پورشن بنایا ہے۔''
وہ جو باغ پہ حیرت زدہ تھا لفظ پورشن پہ گنگ ہو گیا۔ انہیں قیام کرنے کے لیے الگ پورشن دیا گیا تھا۔ شیری کی دیکھ بھال کے لیے میل نرس بھی ساتھ موجود تھا۔
اس نے تو سمجھا تھا وہ پورشن سہیل کا ہے۔ رفاقت اپنے لیے بنوا رہا تھا تو اس نے بھی نیا گھر بنوایا ہوگا مگر یہ بات اس کی سوچ سے باہر تھی۔
اسد جب گھر میں موجود ہر چیز، یہ میری ہے، یہ تمہاری ہے، کہہ کر بانٹ رہا تھا۔ وہ اس نے ایک چھوٹے معصوم بچے کی خوشی اور محبت سمجھا تھا مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اس برعکس حقیقت نے اسے خود سے نظریں چرانے پہ مجبور کردیا۔

☆☆☆

''مجھ پر اپنے احسانوں کا بوجھ نہ لاد کمال۔''
اس نے اپنے نام کی گئی ہر شے خوشی خوشی قبول کرلی۔
اپنے پاس جو کچھ تھا وہ بھی بانٹنے کا فیصلہ کرلیا۔ اپنا پورشن ضروریات زندگی اور آسائشات سے بھرا تو سہیل اور رفاقت کا گھر بھی بھر دیا۔
نفیسہ بیگم اور رفاقت کی ہونے والی بیوی کے لیے لیا۔ رفاقت کی شادی پہ کھانا دینے کی ذمہ داری بھی لے لی۔
''آپ نے بھی تو اتنا کچھ کیا ہے میرے لیے۔''
کمال نے ان کے ہاتھ تھام کر کہا تو ان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔
''میں تو ماں ہوں بیٹے، میری ممتا سے تیری کیا برابری۔''
وہ رفاقت کی دلہن کو چڑھانے جانے والے زیور اور کھانے کے خرچے کے لیے پریشان تھیں۔ یہ بات کمال نے بھانپ لی تھی۔
''ممتا سے مقابلہ نہیں کر رہا، بیٹا اور بڑا بھائی ہونے کا فرض نبھا رہا ہوں۔''
اس نے جواباً جس محبت اور مان سے کہا وہ مسکرا دیں۔ ان کا صبح کا بھولا بیٹا سر شام ہی گھر لوٹ آیا تھا اس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔
''ٹھیک ہے جو تیری مرضی۔''
دیر سے ہی سہی مگر کمال کو احساس ہو گیا تھا کہ انسانی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت اور نعمت خونی رشتے ہوتے ہیں جو وقت پڑنے پر اپنے لہو کی بوند بوند نچھاور کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ سو اس نے سال کے آغاز میں ہی رشتوں کو نئے سرے سے استوار کرلیا تھا۔
بہت برس پہلے ان ہی دنوں میں انہی رشتوں نے اسے سینے سے لگایا تھا۔ اس بار اس نے آگے بڑھ کر انہیں گلے لگالیا تھا۔

☆☆

Digest Novels Lovers Group

آسیہ رئیس خان

ہم تیرے دشوار رستے

مکمل ناول

اس کے آگے ڈبیہ رکھ کے وہ اٹھ کر الماری کی جانب بڑھا۔ الماری کے پٹ کھلے اور کچھ دیر بعد ملحقہ غسل خانے کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ وہ جو ہکا بکا بیٹھی تھی، ہوش میں آئی۔ چند لمحوں اور کچھ لفظوں کے بعد احساسات یکسر بدل گئے تھے۔

وہ ہمیشہ سے ڈھل مل مشہور تھی۔ کہیں جانے کی بات ہو یا لباس کی خریداری، چھوٹا ہو یا بڑا، وہ دو فیصلوں اور ہاں نہ کے درمیان ہی ڈولتی رہتی جب تک کہ مہناز اس کے لیے حتمی فیصلہ نہ کر لیتیں۔ مگر فی الوقت دل و دماغ میں بڑی شفاف تصویر تھی، اپنا اٹھا سر اور پراعتماد، پرسکون چہرہ۔

وہ اٹھی، تیزی سے اپنے بیگ کے پاس پہنچی، اس کا دستہ پکڑ کے کھینچا اور دروازہ کھول کے باہر نکل گئی۔

کمرہ الگ تھلگ تھا اور باہر جانے کے لیے ہال سے گزرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بیگ گھسیٹتی باہر آئی جو نیا ہونے کی وجہ سے بڑی سہولت سے شور پیدا کیے بنا چل رہا تھا۔ اس نے فون سامنے کیا تو دیکھا، ویڈیو ریکارڈنگ جاری تھی۔ اس نے بند کر کے کامل کا نمبر ملایا۔ رنگ ختم ہی ہونے والی تھی کہ اس کی تھکی سی آواز آئی۔

”اگر کچھ بھول گئی ہیں تو پلیز صبح پہنچا دوں گا ابھی میں۔“

”سوال کیے بغیر اور گھر میں کسی کو کچھ بتائے بنا فوراً مجھے لینے آؤ۔“

کامل کی ساری سستی غائب ہوگئی۔

”کک...... کیا...... سب ٹھیک ہے...... کیا ہوا؟“ اس نے گڑبڑا کے پوچھا۔

”یہ وہ میری زندگی اور موت والی کال ہے۔“ اس نے فون رکھ دیا۔

کبھی کھیل کھیل میں ان سب نے ایک دوسرے سے پوچھا تھا اگر زندگی اور موت کا سوال ہو اور ایک فون کال انہیں بچا سکتی ہے تو وہ کسے کال کریں گے، تب ان دونوں نے ایک دوسرے کا نام لیا تھا۔ اسے یقین تھا، کامل کبھی اسے مذاق نہیں سمجھے گا۔

وہ اپنا بھاری جوڑا اور بیگ سنبھالتی لان میں آئی اور ایک نظر چاروں طرف ڈالنے کے بعد بائیں جانب کی تاریک اور تنگ گلی میں آ کھڑی ہوئی کہ گیٹ سے باہر نکلتی اور کوئی سڑک پر اسے تلاش کرنے نکلتا تو وہ چھپ نہیں سکتی تھی۔ اب انداز میں پہلے والی احتیاط، حیا اور سست خرامی غائب تھی۔ عروسی جوڑے کی قدر بھی اس کمرے سے نکلتے ہی ختم ہو گئی تھی جو وہ اسے ہاتھوں سے سمیٹتی یا بچاتی۔

وہ ابھی نوید کی باتیں ذہن سے جھٹک کے آگے کیا کرے، سوچ رہی تھی، آوازیں آنے لگیں مگر مبہم تھیں۔ ظاہر ہے کمرے میں اسے نہ پا کر دولہا اسے ڈھونڈ رہا ہوگا۔ اس کا خیال آتے ہی پھر اس کا خون ابلنے لگا۔ اس نے بے دردی سے لپ اسٹک سے سجے لب کچلے۔ کامل اگر فون سنتے ہی نکلا ہو تو بھی بیس سے پچیس منٹ تو لگنے تھے۔ وہ بھی سواری پر منحصر تھا۔ بائیک سے آتا یا رکشا سے۔

”کیا میں خود ہی باہر نکل کے رکشا روک لوں یا اوبر بلا لوں؟“ اس سے پہلے کہ گھر والے اسے ڈھونڈ

digest library.com

لیتے وہ وہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ لیکن اس حلیے میں رات کے اس پہر تنہا نکلنا بھی مصیبت کو دعوت دینا تھا اور یہ رہائشی علاقہ ایسا تھا جہاں باہر نکلتے ہی رکشا ملنا بھی مشکل تھا۔

"یہاں کوئی نہیں ہے۔" کسی کی آواز آئی جو دروازے سے ہی لان کا جائزہ لے رہا تھا۔ آرائشی قمقموں کی لڑیوں سے سجے گھر کا اگلا حصہ خاصا روشن تھا۔

"فون لگاؤ اسے۔" پیچھے سے کسی نے کہا اور اس نے گھبرا کے فوراً فون سوئچ آف کر دیا۔ وہ دھیرے بات کر رہے تھے۔ ظاہر ہے گھر میں مہمان تھے اور انہیں خبر نہ ہو یہ اتنا ہی اہم تھا جتنا اس کا دوبارہ اس کمرے میں پہنچنا۔

"تم نے کیا کیا؟ کچھ کہا اس سے؟ یا اللہ یہ مت کہنا کہ۔ اوہ۔" یہ دولہا کی بڑی بہن تھی۔ وہ خدشہ بھی پورا بیان نہ کر سکی جو ان کا بھائی عملاً کر چکا تھا۔

وہ سب اس کے شناسا تھے۔ امی کی سہیلی کی اولاد۔ ہر ملاقات میں جن کے ساتھ اس نے اچھا وقت گزارا تھا مگر اس لمحے وہ سب اسے محض دھوکے باز لگے اور وہ ولید۔ جانے کس زعم میں تھا جو اسے پہلی شب ہی بڑی شان سے 'کوئی اور پسند ہے تم نہیں' کہہ کر رونمائی سامنے رکھ کے شیروانی تبدیل کرنے گیا تھا۔ اس کا انداز بھی یوں تھا کہ میرے آنے تک رو دھو لو۔

کسی بھی پل کوئی اسے ڈھونڈنے ادھر آ سکتا تھا۔ وہ مہمانوں کو خبر نہیں کرنا چاہتے تھے ورنہ تو سارا گھر مل کے اسے تلاش کرتا تو وہ فوراً اس گلی میں پکڑی جاتی۔ کامل یہاں پہنچ بھی گیا تو اس کے گیٹ سے اندر آنے کے بعد سب کا سامنا ہونا ہی تھا۔

"مجھے اس وقت تماشا نہیں چاہیے نہ ان میں سے کسی کو دیکھنا سننا ہے۔" اس نے سوچا۔

سامنے سے گزر کر جانا اب ناممکن تھا۔ اس نے احاطے کی دیوار کو قریب سے دیکھا۔ بازو والے بنگلے اور دیوار کے بیچ بھی تنگ سا راستہ تھا۔ کچھ سوچنے کے بعد وہ گھر کی پچھلی جانب بڑھی جہاں نسبتاً اندھیرا تھا۔ وہ چھوٹا سا غیر اہم دروازہ اس کے لیے بہترین مددگار ثابت ہوا تھا۔ وہ لباس سنبھالتی، تیز تیز چلتی پچھلی سڑک پر پہنچ کر رک گئی۔ اس نے فون آن کیا اور کامل کو فون لگایا۔

"آنٹی سے پہلے والی لین میں ٹرن لینا، میں ان کے گھر کے پیچھے ہوں۔" کامل کو بولنے کا موقع دیے بنا اس نے فون بند کر دیا۔

"سوٹ کیس دیکھ کر کوئی ادھر آ گیا تو؟ آ جائے میں کیوں اتنا سوچ رہی ہوں۔" اب اسے خود پر غصہ آ گیا۔

فون پر نوید اور اس کی بہن کی مسڈ کالز تھیں۔ اس نے فون کو گونگا کیا اور اس سمت چل پڑی جدھر سے کامل کی بائیک آنا تھی۔ وہ بھاری بھرکم جوڑے کے باوجود تیزی سے چل رہی تھی۔ وہاں سڑک پر بتیاں نہیں تھیں۔ کچھ مکانوں سے روشنیاں آ رہی تھیں جو سڑک کو مکمل روشن کرنے کے لیے ناکافی تھیں۔ شکر یہ تھا کہ عمارات کے اس پہر گلی سنسان تھی۔ وہ بار بار پلٹ کے دیکھ رہی تھی کہ کوئی اسے تلاش کرنے تو نہیں آ رہا ہے۔ ایک مکان کی دیوار کے پاس وہ ذرا دیر رک گئی مگر کچھ دیر بعد لگا کہ چلتے رہنا چاہیے۔ وہ چلتے چلتے اس گلی سے نکل کر بڑی عوامی سڑک پر آ گئی جو گلی کی طرح سنسان نہیں تھی۔ ابھی کچھ دور ہی چلی تھی کہ بائیک تو نہیں کار اس طرف آتی دکھائی دی۔

"اُف!" چھپنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ رات میں دلہن کو یوں تنہا دیکھ کر کار والا یا کار والے رک کے پوچھ تاچھ شروع کر دیتے تو۔ آس پاس والوں کو تو خبر ہی ہو گی کہ شادی کہاں تھی۔ وہ سر جھکائے دعا کرتی ہوں اور انہیں اس کی مدد کا خیال نہ آئے۔ شقی القلب اور خود غرض لوگ

کار کے بریک اس کے پاس ہی چرچرائے اور پہلی بار اس پر گھبراہٹ سوار ہوئی۔

"آپی!" کامل کی آواز پر اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ وہ اگلا دروازہ کھول کے باہر آ رہا تھا۔ وہ

شتابی سے پچھلا دروازہ کھول کے اندر بیٹھ گئی۔ کامل جو پیر باہر رکھ چکا تھا، واپس پیر اندر لے کر دروازہ بند کر کے پیچھے مڑا۔

"چلو۔" کامل نے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے ہاتھ سے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

"پہلے یہاں سے نکلو سب بتاؤں گی، کون سا راز ہے گا یہ سب۔" اس کا غصہ کہیں اور نکلا۔ اسے دیکھ کر کامل کی بچی کھچی نیند بھی اڑ گئی۔ تنا ہوا غصے سے سرخ چہرہ اور آنکھوں میں شرارے، وہ اسے اس حال میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

اسٹیئرنگ سنبھالے، رافع نے یوٹرن لے کر کار واپس اسی راستے پر ڈال دی جدھر سے آیا تھا۔

"یار آپی!" کامل اب بھی پیچھے اسے دیکھ رہا تھا۔

"امی جو میرا حال کریں گی وہ الگ لیکن میں اس وقت تجسس سے مر جاؤں گا۔ کیا انھوں نے ڈاوری کی ڈیمانڈ کی، نوید بھائی پہلے سے میرڈ ہیں؟ یا ورسٹ ان کے بچے ہیں؟ کیا۔ کیا ہوا ہے؟" اسی وقت اس کا فون روشن ہوا۔

"لو۔" اس نے فون کامل کے سامنے کیا جہاں امی کالنگ لکھا تھا۔

"انھوں نے امی کو فون کر دیا ہے۔" اس نے فون نشست پر پھینک دیا۔ کامل کا تحیر بڑھتا جا رہا تھا۔ اتنا غصہ اور فون پھینکنا، یہ اس کی بریرہ آپی نہیں کوئی اور تھا۔

کار غیر معمولی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔

تب ہی کامل کا فون بجنے لگا۔

"اٹھانا مت۔" اس نے کامل کے ہاتھ سے فون لے کر سوئچ آف کیا اور اسے بھی اپنے بازو میں بھینچ دیا۔

"آپ نے پہلے دن ہی لڑائی کر لی؟ اگر اب امی کچھ دیر بعد آپ کو وہاں ڈراپ کرنے کا کہیں گی تو میں نہیں کروں گا۔ یہ تو اس وقت رافع بھائی جاگ رہے تھے، آپ اب نوید بھائی۔"

"میں واپس جانے کے لیے نہیں نکلی ہوں۔" اس کی آواز مضبوط مگر جھلاہٹ بھری تھی۔ رافع نے نتھنے سے شیشے میں پہلی بار غور سے اسے دیکھا۔ وہ دلہن لگ رہی تھی مگر غضب ناک دلہن۔

"بہتر ہے آپ دونوں گھر پہنچ کر بات کریں۔" رافع نے مداخلت کی۔ کامل سیدھا ہو کر آگے دیکھنے لگا۔ اس کے انگ انگ سے بے قراری جھلک رہی تھی اور رافع کا خیال تھا وہ اس کے سامنے بتانے سے گریز کر رہی ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ اس نے تو تیسرے کی موجودگی کو اہمیت ہی نہیں دی تھی نہ غور کیا تھا۔

کامل نے کئی بار پھر پلٹ کے وہی سوال دہرانے کی کوشش کی، یہاں تک کہ کار گھر کے سامنے پہنچ گئی۔ ان کے حصے کا پھاٹک کھلا تھا اور دور سے ہی مہناز نظر آ رہی تھیں۔

کامل نے باہر آ کر پچھلا دروازہ کھولا۔

"کیا کیا تم نے۔ ہاں۔ کچھ عقل بھی ہے تمھیں۔ یہ کوئی شریفوں والی حرکت ہے۔" مہناز، تشویش، غصے اور خوف کے احساسات میں گھری، اسے اندر گھسیٹتے ہوئے دبی آواز میں کہہ رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ چٹکی میں اس سے سچ اگلوالیں۔ وہ ان سنی کرتی، اپنا لہنگا دونوں ہاتھوں سے پکڑے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ مہناز دبی آواز میں مسلسل بول رہی تھیں۔

ان کے اندر جانے کے بعد، رافع گاڑی اپنے گیٹ کے اندر لے گیا جو کامل نے جانے سے پہلے کھول دیا تھا۔ جب وہ کار کھڑی کر کے اپنے دروازے پر آیا تو اس طرف جھانک کر دیکھا۔ صحن میں کوئی نہیں تھا۔ وہ سب اندر چلے گئے تھے۔

دونوں مکانوں کا مالک بھی ایک ہی تھا اس لیے احاطے کی اونچی دیوار اور دو الگ پھاٹک ہونے کے باوجود اندر مکانوں کے درمیان دیوار نہیں تھی، بلکہ جھاڑیوں کی قطار سے صحن دو حصوں میں تقسیم تھے۔ جس کے درمیان آنے جانے کے لیے راستہ بنا تھا۔ وہ کرائے دار تھا جب کہ بغل والوں نے چند ماہ پہلے وہ حصہ خریدا تھا تاہم انھوں نے ابھی تک دیوار

digestlibrary.com

نہیں اٹھائی تھی۔

☆☆☆

"کہاں چلے گئے تھے اس وقت؟ عبداللہ جاگ گیا تھا۔ اس کے رونے کی آواز پر دیکھا تو تم نہیں تھے۔" اس کے کمرے سے نکل کر ہال میں آئی پروین نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

"سو گیا؟" وہ سوال کرتا کمرے کی طرف بڑھا۔ آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔

"تم کہاں گئے تھے؟" وہ سوئے عبداللہ کے پاس بیٹھ گیا۔

"کامل کو کوئی کام تھا۔ آپ سو جائیں امی میں عبداللہ کو دیکھ لوں گا۔" اس نے بیٹے کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

بغل میں کامل کے کمرے میں عدالت لگی تھی۔

اس کی بات سنتے ہی نانی اور مہناز نے سر پکڑ لیا تھا۔

"یا اللہ کیا بے عقل لڑکی ہے!" یہ ایک ہی رات میں دوسری دفعہ اس کے سر پر آسمان گرا تھا۔

"تم پہلے روبی کو فون کر کے معافی مانگو اور کہو ہم اسے لے کر آ رہے ہیں۔" نانی کی بات پر اسے اپنے کانوں پر شک گزرا۔

"کس بات کی معافی اور کسے لے کر آ رہے ہیں؟" ایسا نہ تھا کہ وہ سمجھی نہیں تھی مگر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ایک لفظ منہ سے مت نکالنا جب تک ہم نہ کہیں۔" نانی نے ہاتھ اٹھا کے تنبیہ کی۔ وہ اسے تھپڑ لگانے سے بمشکل خود کو روکے تھیں۔ اسے حکم دے کر وہ خود ہی فون ملانے لگیں۔

"میں کہیں جاؤں گی نہ کسی سے معافی مانگوں گی۔" ان کا مدعا جان کر اس کا لہجہ زندگی میں پہلی بار سرد ہوا۔

"انھیں معافی مانگنے آنا ہے تو شوق سے بلائیں۔" ایک تو اس کی حرکت اور دوسرے یہ انداز، وہ سب بے یقینی اور غصے سے اسے گھور رہے تھے۔

"کس جنم کا بدلہ لے رہی ہو بیٹا؟" مہناز کا لہجہ بے بسی اور طیش سے بھرا تھا۔ روبی انھیں اپنے طریقے سے وجہ بتا چکی تھیں۔

"یہ سکھایا ہے میں نے تمہیں؟ گھر ایسے نہیں بستے تم آج کل کی لڑکیوں نے ہر بات کو کھیل ڈرامہ سمجھ رکھا ہے، جیسی ذلت اور شرمندگی تم نے آج دی ہے کبھی نہیں سوچا تھا اپنی اولاد یہ دن دکھائے گی جسے۔" مہناز کی آواز رندھ گئی۔

بریرہ نے بھی نہیں سوچا تھا کہ جس سے وہ گزر کے آئی ہے اس سے کئی گنا بڑا جھٹکا گھر میں منتظر ہے۔ وہ جانتی تھی اس پیش قدمی پر خوش تو کوئی نہیں ہوگا لیکن اسے توقع تھی کہ نوید کی بات پر سب کو دکھ اور صدمہ ہوں گا، ان لوگوں پر غصہ آئے گا کہ انھوں نے دھوکے میں رکھا۔ پہلے ہی قدم پر مضبوط ہو کے فیصلہ کرنے پر سب اس کا ساتھ دیں گے۔ نوید نے جس وقت اور جس انداز میں بات کی تھی، وجہ وہ تھی اور اس نے اتنا ہی آسان سمجھ لیا تھا کہ سب کے لیے بھی یہ وجہ اتنے بڑے فیصلے کے لیے کافی ہو گی۔

"آپ فون لگانے یا کوئی یقین دلانے سے پہلے میرا فیصلہ سن لیں، میں اس گھر میں واپس نہیں جاؤں گی نہ مجھے یہ شادی آگے چلانی ہے۔" اس نے دوپٹا کھینچ کے دور پھینکا اور چوڑیاں اتارنے لگی۔ آج سب کچھ ہی نیا تھا وہ بھی اور گھر والے بھی۔

کامل نے نانی کے ہاتھ سے فون لے کر بند کیا۔ مہناز غصے میں اس کی طرف بڑھیں، اس سے پہلے کہ وہ اسے طمانچہ رسید کرتیں، کامل ان کے اور بریرہ کے درمیان آ گیا۔

"آپ سب کیوں زبردستی کر رہے ہیں؟"

"تم تو منہ بند ہی رکھو۔" مہناز نے وہی تھپڑ اس کی پیٹھ پر مارا جو بریرہ کے لیے تھا۔

"گھر میں کسی کو بتائے بغیر وہاں دوڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو تم؟ تمہاری وجہ سے یہ معاملہ بگڑا ہے۔ وہ تو ہے ہی بے وقوف، بلا سوچے سمجھے اتنا بڑا ایشو کھڑا کر دیا مگر تم نے اس سے بڑی حماقت کی ہے۔"

digest library.com

"امی!" اس نے دکھ سے انہیں دیکھا۔

"میں نے کب پہلے کوئی بے وقوفی کی یا مسئلہ کھڑا کیا؟"

"ہاں تو سب کی کسر ایک ساتھ ہی نکال لی۔"

نانی کا انداز جلا بھنا تھا۔

"کسی کو یہ نہیں لگ رہا کبھی کچھ نہ کرنے والی نے اتنا بڑا قدم اٹھایا تو کچھ دیر اسے سن لیں، سمجھنے کی کوشش ہی کرلیں؟"

"سناؤ۔" مہناز نے ضبط سے اسے دیکھا۔

"نوید نے مجھ سے پہلی بات یہ کی کہ اس کی مرضی اور خوشی کے بنا یہ شادی ہوئی ہے، میں صرف گھر والوں کی پسند ہوں۔ یہ کون سا طریقہ ہے شادی شدہ زندگی کی شروعات کا؟ وہ مجھے پہلے بتا دیتا، کچھ دن بعد بتاتا لیکن اس طرح کہنے کا مقصد کیا تھا۔؟ اس کا انداز یہ نہیں تھا کہ اسے میری ضرورت نہیں بلکہ وہ ازدواجی زندگی کے آغاز سے پہلے مجھے میری اوقات، میرا مقام باور کروا رہا تھا۔ جب میں اسے پسند ہی نہیں تو میں کیوں ایسے انسان کو اپنے قریب آنے دوں؟ اسی وقت وہ مجھے بھی ناپسند ہو گیا۔

مجھے پہلے کبھی اتنی انسلٹ محسوس نہیں ہوئی تھی جتنی اس کی بات سن کر۔ میرے احساس و جذبات کی، میری کوئی وقعت حیثیت نہیں؟ میں ایسے زبردستی کے رشتے میں کس لیے رہوں؟ جب اس میں اتنی بھی ہمدردی، مروت نہیں کہ وہ نکاح کے چند گھنٹوں بعد، کس نازک وقت میں میرا دل توڑ رہا ہے، مجھے بے وقعت کر رہا ہے تو میں کیوں ایسے انسان کے ساتھ آگے بڑھوں؟"

اس کی جذباتی تقریر اور دلی احساسات سب سپاٹ تاثر کے ساتھ سن رہے تھے۔

"اس لیے کہ تم اب اس کی بیوی ہو۔" نانی نے کہا اور اس نے باری باری سب کی شکل دیکھی، سوائے کامل کے سب کے چہرے پر نانی کے الفاظ لکھے تھے۔

"کیا یہ بات آپ سب کو پتا تھی؟" اس نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

"ایسی باتیں کوئی نہیں بتاتا نہ ان کی اہمیت ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے دس معاشقے بھی ہوں تو بیوی بیوی ہوتی ہے، کچھ دنوں میں سب بدل جاتا ہے۔ مگر تیری بے صبری چہ چہ۔" نانی کا بس نہیں چل رہا تھا ہر جملے کے ساتھ اسے ایک ایک تھپڑ رسید کرتی جائیں۔

"سارا معاملہ بگاڑ دیا۔"

"منکوحہ کا گھونگھٹ اٹھا کے اپنی پسند، ناپسند کا سچ کہنے والی بے حسی کی وجہ سے یہ معاملہ بگڑا ہے نانی۔" اس کا کاٹ دار اور طنزیہ لہجہ وہاں کامل کے علاوہ سب کو برا لگا تھا۔

"ساری دنیا کے سامنے بیاہ کر گھر لے آنے کے بعد اسے پہلی شب یہ سب کہنے والا وہ بہادر، گھر والوں کے سامنے نہ اپنی پسند کے لیے ڈٹ سکا نہ گھر والوں کی پسند پر راضی ہو سکا مگر ایسے منافق کو مجھ سے سچ کہنے کے بعد تابعداری، وفاداری اور رازداری کی توقع تھی۔ مجھے ایسے دوغلے، بزدل اور منافق کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں رکھنا۔ میں اس کی پہلی دوسری محبت پر سمجھوتہ، صبر کر سکتی تھی، رشتے کو موقع دے سکتی تھی اگر وہ میری عزت نفس مجروح نہ کرتا۔" چوڑیاں اتار کر بستر پر ڈھیر کرنے کے بعد اب وہ کان اور گلا خالی کر رہی تھی۔

"کاہے کی عزت نفس! ارے اس عمر میں مرد ایسے ہی بولتا ہے، یہ عورت کا کام ہے اسے اپنے پیار اور توجہ سے۔"

"پلیز نانی میں جو بھی کہوں گی وہ بدتمیزی اور بحث لگے گا اس لیے یہ بات ختم کریں۔ میں وہاں نہیں جاؤں گی نہ یہ شادی قائم رہے گی۔" ان سب کو تو اب بھی اس کی ہر بات بدتمیزی اور بحث ہی لگ رہی تھی۔

"یا اللہ کیسے منہ کھول کے اناپ شناپ بکے جا رہی ہے!" نانی غصے کی زیادتی پر بول ہی نہ سکیں جب کہ مہناز نے دل اور سر ایک ساتھ تھاما۔ اس سے

digest library.com

پہلے وہ سب کے لیے اللہ میاں کی گائے قسم کی بیریہ تھی اور اسے اس انداز میں دیکھنا کسی سے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

اتنی دیر سے چپ کھڑی، عندلیب دھپ کی آواز کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ابھی شادی کی تھکن نہیں اتری اور اب یہ نیا سیاپا!" گھر میں مہمان کے نام پر خالہ اور ان کے بچے تھے جو سب تھک کے چور سو رہے تھے۔

مہناز اسے کامل کے کمرے میں لے کر آئی تھیں۔ نوید کی والدہ کے فون کے بعد، انھوں نے عندلیب اور حفصہ کو جگایا تھا۔ نانی جاگ ہی رہی تھیں۔ جب وہ کامل کو جگانے آئیں تو دیکھا وہ غائب ہے۔

"ویسے یہ اتنا بڑا ایشو نہیں تھا۔ بعد میں سب سیٹ ہو جاتا ہے۔" وہ جو گھر والوں کے ردعمل کو اب تک شدید صدمہ سمجھ رہی تھی، حفصہ کی بات پر مارے حیرت کے کچھ پل کے لیے گنگ رہ گئی۔ وہ جین زی کہلانے والی کشادہ ذہنیت رکھنے والی نسل کی نمائندہ تھی، اسے اس سے یہ امید نہیں تھی۔

"میرے احساس اور جذبات کی فکر، نہ تکلیف اور سیلف ورتھ کا احساس، دنیا کے سامنے ایک چہرہ، چند گھنٹے پرانی دلہن کے آگے دوسرا اور ویڈنگ نائٹ میں ہی سچ کی سے اس امید پر کہ اس نے سن کے بھی کیا کر لینا ہے، میرے ساتھ ہی رہنا ہے۔ کوئی ایشو نہیں ہے؟" اس نے ایک سانس میں کہا اور حفصہ نے عادتاً شانے اچکا کے لب بھینچ لیے۔ جب اس کے پاس کوئی جواب نہ ہو تو وہ یہی کرتی تھی۔

"امی، آپ ہی سمجھائیں اسے۔" مہناز نڈھال سی پلنگ پر ٹک گئیں۔

"ارے سمجھانا کیا۔ ابھی نہیں تو صبح فجر میں چھوڑ ہی آنا ہے۔ تم ذرا روبی سے طریقے سے بات کر لو۔"

"کامل!" اس نے آنکھیں موند کے گہرا سانس لیا اور اس کی طرف پلٹی۔

"میرا بیگ وہیں رہ گیا ہے، وہ لے آنا کل۔" پھر اس نے مہناز کو دیکھا۔

"میری طرف سے یہ شادی ختم ہے امی۔ آپ کسی سے کوئی وعدہ کریں نہ انھیں جھوٹی آس تھمائیں۔ میں نوید جیسے مرد کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ وہ پہلے ہی کسی سے محبت کرتا ہے یا میں اس کی پسند نہیں، میں اس وجہ سے اسے چھوڑ کے نہیں آئی ہوں۔ اس نے نئے رشتے کے پہلے دن، پہلی بات میں جو مجھے میری حیثیت، وقعت اور مقام باور کرایا، میں نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا ہے اور یہ میرا حق ہے، میں جانتی ہوں میں یہ ڈیزرو نہیں کرتی۔" وہ دوپٹا اور زیور سب وہیں چھوڑ کے باہر نکل گئی۔ کامل بھی سب کو ملامت سے دیکھتا اس کے پیچھے تھا۔

ہال اور باورچی خانے کے علاوہ دو ہی کمرے تھے۔ ایک میں ان تینوں کا سامان تھا۔ اور دوسرے میں کامل اور مہناز کا جب کہ مہناز اور نانی ہال میں سوتی تھیں۔ اس وقت ان کے کمرے میں خالہ اور ان کے بچے سوئے تھے۔

"آپی، میرے کمرے میں سو جائیں آج۔ میں ہال میں سو جاؤں گا۔" کامل نے اسے پتلی سی راہداری میں روکا۔ اس وقت وہی کمرہ خالی تھا۔

"آپ وہیں چینج بھی کر لیں۔ حفصہ آپی سے کہیں یا میں ہی لے آتا ہوں آپ کے کپڑے۔" وہ اس کے کمرے کی طرف جانے لگا تھا کہ اس نے کامل کی آستین پکڑ لی۔

"تھینک یو۔" اسے رونا آ گیا۔ وہ گھر کا سب سے کم عمر فرد تھا۔ بڑوں نے تو ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔ وہ خود ہی بھائی سے لپٹ کے رو دی۔

"فکر نہ کریں آپی۔ میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔" اس نے بہن کو سہارا دیتے ہوئے تسلی بھی دی۔ اس کے آنسوؤں میں روانی آ گئی۔

☆☆☆

وہ معمول کی طرح چائے لینے باہر آیا تو اس طرف جھانکا۔ گزشتہ شب وہ دیر تک سو نہیں پایا تھا۔

digest.library.com

ایسی عام بات بھی نہیں تھی کہ رخصتی کے چند گھنٹے بعد دلہن کا فون اور پھر اس طرح واپسی۔ نا چاہتے ہوئے بھی ذہن بھٹک کے ادھر ہی جا رہا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اتنی بڑی کیا بات تھی کہ ایک بیوہ کی تین بیٹیوں میں سب سے بڑی بیٹی نے یہ فیصلہ کرلیا۔ ایسا کرنا آسان تھا یا وہ لڑکی اس قدر ضدی، خود پسند اور خود غرض ہے یا وہ سسرال اور لڑکا اتنے برے تھے، بے شمار ممکنات تھے۔

اس کی ان سے رسمی دعا سلام ہی تھی، وہ بھی مہناز اور نانی کے علاوہ کامل سے۔ ان تین لڑکیوں سے اس کی بھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اس کی زندگی اتنی مصروف اور تھکانے والی تھی کہ اسے ادھر ادھر دیکھنے کی فرصت ملتی تھی نہ توانائی بچتی تھی۔

شادی ہال میں ہوئی تھی، مہمان زیادہ نہیں تھے۔ ان کے مرحوم ابا کی طرف کے لوگ اور ماموں لوگ سیدھے ہال آئے تھے اور وہیں سے چلے بھی گئے تھے سوائے خالہ اور ان کے بچوں کے جو اس وقت صحن اور کمروں کے درمیان آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ اس وقت بھی حفصہ اور عندلیب کے ساتھ دو لڑکیاں سر جوڑے بیٹھی تھیں۔

”کیا واپس چلی گئی؟“ وہ سوچتا کپ لیے اندر گیا چلا آیا۔

کچھ دیر بعد وہ سب بھول کے دفتر جانے کی تیاری کررہا تھا۔

☆☆☆

وہ رات سے کامل کے کمرے میں ہی تھی۔ خالہ اور نبیلہ، بجیلہ کو بھی خبر ہوگئی تھی اور اسے یقین تھا انھوں نے سارے خاندان میں بھی مارننگ بلیٹن نشر کردیا ہوگا۔

اسے گھر میں امید کے برعکس مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ نانی کی زبان صبح سے مسلسل جاری تھی۔ ان کے نزدیک غلطی اس کی تھی اور معافی مانگ کے لوٹنا ہی اس کی تلافی۔ مہناز نے ابھی تک اس سے آکر کچھ نہیں کہا تھا۔ کامل نے کمرے میں اسے ناشتہ پہنچایا اور کھلایا بھی۔ اس خاموشی کا مقصد اس وقت واضح ہوا جب ہال سے روبی آنٹی کی آواز آئی۔ وہ باہر نکلتی اس سے پہلے کامل اندر آیا۔

”یہ کس لیے آئی ہیں؟“ کامل کے پیچھے مہناز تھیں۔

”روبی آئی ہے۔ تمہیں معافی نہیں مانگنی تو نہ مانگو لیکن اسے سلام کرو جاکے اور بتادو کہ تم یہیں سے پارلر جاؤ گی اور وہاں سے سیدھا ہال۔“ بریرہ کا سر گھوم گیا۔

وہ ولیمے کی تیاری کا منصوبہ بیان کررہی تھیں۔ ان کے لیے اس کی بات، اس کے جذبات کی اہمیت ہی نہیں تھی۔ وہ نوید کا گھر چھوڑ آئی تھی کہ اسے لگا تھا اپنی عزت نفس کچل کے وہ بھی خوش نہیں رہ سکے گی نہ خود سے نظر ملا سکے گی مگر اب اپنا گھر چھوڑ کے کہاں جائے؟

”دو منٹ کے لیے آجاؤ۔“ وہ رکی نہیں۔ رات مہناز اسی لیے خاموش ہوگئی تھیں کہ روبی نے کہا تھا اسے وہیں رکھو، ابھی نوید بھی غصے میں ہیں، مہمانوں کو علم نہیں، انھیں صبح کوئی بہانہ بنادیں گے کہ دلہن جلدی ماں کی طرف چلی گئی ہے۔

بریرہ کو ماں کی خاموشی کا راز اب سمجھ آیا۔ وہ پیچھے بگڑی بات بنارہی تھیں۔ بریرہ کو لگا وہ بے بسی اور غصے سے لرز رہی ہے۔ اس اجنبی نوید پر کیا غصہ کرنا، جب گھر والوں کی نظر میں اس کا یہ مقام تھا۔

اس نے کبھی ماں کی مرضی کے خلاف ایک قدم نہیں اٹھایا تھا۔ بڑی تھی اور ان کی نوکری کی وجہ سے اس نے گھر کے کتنے ہی کام سنبھال لیے تھے۔ کالج کے بعد انھوں نے کہا بی ایڈ بعد میں کرلینا کہ گھر میں ان کے اسکول جانے کے بعد، حفصہ عندلیب اور کامل کے کھانے کا مسئلہ ہوتا تھا، وہ مان گئی اور آگے پڑھائی آج تک ہو نہیں پائی تھی ورنہ وہ بھی استانی بن کے ان کا بوجھ بانٹنا چاہتی تھی۔ باورچی خانہ بلکہ سارا گھر اس کے کاندھوں پر ٹکا تھا۔ کامل کو بچپن سے اس نے ہی سنبھالا تھا۔ عندلیب اور حفصہ جڑواں

تھیں۔ وہ ہر معاملے میں، ہر جگہ ایک دوسرے کے لیے کافی اور ایک دوسرے کی حامی و مددگار تھیں۔ رشتہ بھی جس سے اور جہاں انھوں نے طے کر دیا، وہ مان گئی کہ اسے ان پر مکمل بھروسا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ اپنے لیے کھڑی ہوئی تھی، وہ بھی اس وقت جب اس کے ساتھ غلط ہوا تھا مگر باقی تو دور وہ بھی اس کے ساتھ نہیں تھیں۔ ہر دفعہ کی طرح سب توقع کر رہے تھے جو مہناز کہہ رہی ہیں، وہ وہی کرے گی۔ نہیں مانے گی تو کہاں جائے گی۔

"آپی!" کامل نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ چونکی۔

"آپ کو نہیں جانا تو مت جائیں۔" جس پر عندلیب اور حفصہ بھی رعب جماتی اور حکم چلاتی تھیں وہ اس کا حمایتی تھا۔ وہ بھیگی آنکھوں سے مسکرائی اور سر ہلایا۔

"میرا فون دینا۔" اس نے آنکھیں رگڑتے ہوئے اس سے کہا۔ بے وقعتی کا احساس وہاں سے ملا تھا تو یہاں بھی وہی تھا۔ ایسے زندہ رہنے کا کیا فائدہ جس زندگی میں خود سے نظریں ملاتے شرمندگی ہو۔ وہ پہلی بار اپنے لیے کھڑی ہوئی تھی تو اب قدم مضبوطی سے جمائے رکھنے تھے۔ جب کوئی اس کے ساتھ نہیں تھا تو اب لازم تھا وہ اپنا ساتھ نہ چھوڑتی۔

کامل نے بستر پر پڑا فون اٹھا کے اسے تھمایا۔ اس کی سیلفی لیتے ہوئے نوید کی آمد پر بڑبڑاہٹ، اس کے حق میں سب سے بڑا دفاع بن گئی تھی۔

"آؤ۔" کچھ دیر فون دیکھنے کے بعد اس نے کامل کا ہاتھ تھاما اور ہال میں آئی۔

"آؤ آؤ بریرہ!" سب سے پہلے نانی کی نظر اس پر پڑی۔ روبی نے اسے دیکھا۔ ان کا تنا ہوا چہرہ غصہ چھپانے کی کوشش میں عجیب انداز میں مسکرایا۔ انھیں کوئی ندامت نہیں تھی۔

"سلام کرو بیٹا۔" نانی نے سرزنشی انداز میں کہا۔ وہ انھیں ان سنا کرتی روبی کے سامنے پہنچ کر رکی اور اپنے فون میں ویڈیو شروع کی جس کی آواز کمرے میں گونجی۔ فون اس نے روبی کے سامنے کیا۔ پہلے وہ سمجھ نہیں پائیں کہ کیا ہو رہا ہے مگر جلد وہ بیٹے کی آواز پہچان گئیں۔

"میں پہلے ہی کلیئر کر رہا ہوں تم امی کی پسند ہو۔ مجھے تم میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے، میری محبت کوئی اور ہے۔ جتنا تمھیں دے دوں وہ میرا احسان ہوگا کیونکہ یہ شادی میری مرضی اور خوشی۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔" روبی کھڑی ہوئیں۔

"اس لیے مجھے گھر بلایا تھا بے عزت کرنے۔ مہناز!" انھوں نے پکارا تب تک مہناز بھی ہال میں آ گئی تھیں۔ نوید کی آواز اب بھی ہال میں پھیل رہی تھی۔

"مجھ سے کوئی امید مت رکھنا۔ تم گھر والوں کی بہو ہو اور۔"

"بند کرو۔" مہناز نے اس کے ہاتھ سے فون جھپٹ کے بند کیا۔

"آپ نے مجھے واپس بلانے کا اصرار جاری رکھا تو میں یہ ان سب کو فارورڈ کر دوں گی، جنھیں ہال کا ایڈریس واٹس ایپ کیا تھا۔ یہ شادی کل ہی آپ کے بیٹے کی بہادری نے ختم کر دی تھی اب مجھے اور میرے گھر والوں کو تنگ نہ کریں بلکہ شکر کریں میں خاموشی سے چلی آئی۔"

وہ سب کو ششدر چھوڑ کے کمرے میں آ گئی۔

"آپ نے ریکارڈ کیا تھا؟" کامل خوش تھا۔

"نہیں، ایکسیڈنٹلی ویڈیو ریکارڈنگ آن ہو گئی تھی۔" اس میں آواز ہی ٹھیک تھی۔ تصاویر کی جگہ اندھیرا تھا کہ اس نے فون الٹا رکھ دیا تھا۔

"اچھا ہوا ورنہ وہ تو مکر بھی سکتا تھا۔" کل تک نوید بھائی کہنے والا آج اس کا نام بھی نہیں لے رہا تھا۔

وہ بستر پر بیٹھی ہی تھی کہ تیر کی طرح اندر آتیں مہناز کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ انھوں نے پاس آتے ہی اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ وہ بستر پر گر گئی۔

"امی!" کامل نے انھیں دور کیا ورنہ وہ جھک

کے مزید دو چار لگانے والی تھیں۔

"ایسی اولاد سے تو اچھا تھا میرے تین ہی بچے ہوتے، پیدا ہوتے ہی مر جاتیں تم۔ یہ دن دیکھنے کے لیے تمھیں بڑا کیا تھا۔ میری زندگی بھر کی کمائی عزت خاک کردی تم نے۔" وہ غصے میں تھیں اور رو بھی رہی تھیں۔

"کس بات کا زعم ہے تمھیں۔ کون ہے تمھیں پوچھنے والا؟ مل بیٹھ کے، بات چیت سے مسئلے حل ہوتے ہیں اس طرح گھر آئے لوگوں کو بے عزت کر کے نہیں۔ کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں رکھا تم نے مجھے بریرہ! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی، ایسی ضدی تو نہیں تھیں تم۔" انھیں اب بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ ایسا کچھ کرسکتی ہے۔

بریرہ کو پہلی بار احساس ہوا کہ اس کی ماں اب بھی اس پر کیا گزر رہی ہے، وہ کیوں نوید کو چھوڑ کے واپس آئی تھی، سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کررہی ہے۔

یہ سچ تھا کہ وہ ضدی نہیں تھی، اس سے یہ امید نہیں کی جاسکتی تھی اور اسی لیے زیادہ ضروری تھا کہ اس کے فیصلے کو ضد کا نام دینے کے بجائے سمجھنے کی کوشش کی جاتی۔ وہ اس سے پہلے سلجھی، سمجھ دار، کم گو شہوری تھی۔ اسے اپنے حالات کا بھی احساس تھا اس لیے حفصہ، عندلیب کی طرح ماں کو تنگ بھی نہیں کرتی تھی اور اب اسے یقین تھا اس کی یہ ہی خوبیاں دیکھ کر روبی آنٹی نے اس کا انتخاب کیا تھا۔ اور یہ ہی خوبیاں گھر والے بھی اس سے ساری زندگی اور ہر معاملے میں چاہتے تھے۔ آپ دوسروں کی محبت میں قربانیاں دینے لگیں تو ایک وقت کے بعد، لوگ اسے حق سمجھ کے وصول کرنے لگتے ہیں اور آپ سے اس سے کچھ کم کی توقع بھی نہیں رکھی جاتی۔ اب بھی اس کی مرضی، پسند، دکھ کے باوجود، سب کو اس سے قربانی کی ہی امید تھی کہ کیا ہوا اگر ایسا ہے بھی تو تمھیں کرنا وہی ہے جو سب کے لیے ٹھیک ہو۔

وہ دن خاموش سا، نانی کی صلواتیں سنتے گزر گیا۔ مہناز جانے فون پر دھیمے دھیمے کس سے اور کیا بات کرتی رہی تھیں۔

نانی غصے سے تو کبھی پیار سے اسے سمجھاتی رہیں۔ خاندان کے بڑے بزرگ بھی اسے دنیاداری سکھانے آئے۔ عندلیب اور حفصہ نے طنز کیا، غصہ کیا اسے کیا ہوگیا ہے، تلاش کرنے کی کوشش کی اور مہناز نے اس سے بالکل بات بند کردی۔ اس نے ان سے بات کرنے کی کوشش کی تو انھوں نے جھڑک دیا۔

"امی! میری حرکت سے آپ کو تکلیف پہنچی ہے اس کے لیے مجھے معاف کردیں لیکن ایک بار تو۔" انھوں نے اسے بولنے تک نہ دیا۔

"میری ماں بننے کی کوشش نہ کرو، تم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے۔ اگر واپس جانا ہے تو بولو ورنہ رہنے دو، مجھے کچھ نہیں سننا۔"

جب کوئی اس کا موقف ہی نہیں سمجھ رہا تھا تو اس نے بھی چپ سادھ لی مگر فیصلہ نہیں بدلا۔

گھر میں ہمہ وقت کسی نہ کسی کا فون بجتا رہتا۔ جو آسکتے تھے وہ خود پہنچ رہے تھے۔ اسے یقین نہیں آتا تھا جب گھر والے دفاعی انداز میں اس کی ضد اور ہٹ دھرمی پر بات کرتے۔ لوگ تو شروع ہی اس جملے سے ہوتے تھے کہ "یہ اتنی بڑی بات تو نہیں۔ آج کل کے لڑکے تو کیا لڑکیاں بھی شادی سے پہلے دوستیاں رکھتی ہیں۔"

اسے اپنے ساتھ ہوئی زیادتی اور دھوکے کا نہ غم منانے کا موقع تھا نہ کوئی اس کے ساتھ تھا بلکہ اس کے سامنے ایک نیا محاذ تھا۔ ہر دن وہ ایک نئے انکشاف اور اپنوں کے حیران کن تجزیوں اور رویوں سے گزر رہی تھی۔ سوائے کامل کے کوئی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ کچھ دن بعد سب دھیمے پڑ گئے لیکن نانی کا طیش کم نہیں ہوا تھا۔ اس کے بارے میں بات کرتے ہوئے ان کا انداز جارحانہ ہی ہوتا تھا۔ کامل کے جانے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی۔ اس کا بیگ دوسرے دن ہی گھر پہنچا دیا گیا تھا۔

ایک بار پھر خالہ یتیم، غریب، بے حس رشتے دار، دو بہنیں اور اس کی واجبی صورت، انھوں نے

digest library.com

digest library.com

سارے کارڈ استعمال کیے۔ نانی بھی پیچھے نہیں تھیں۔

"تیری ماں کا کتنا پیسہ لگا ہے اس شادی میں وہ تو برباد نہ کر۔ ابھی دو اور بیٹھی ہیں۔ دوبارہ کہاں سے لائے گی شادی کے لیے۔" نانی کے پاس اب اس کے لیے مروت بھی نہیں بچی تھی۔ ان دونوں سے جب وہ اپنا موقف کہنے لگتی تو وہ اسے چپ کرا دیتیں۔ وہ اسے ایک بار سننے تک تیار نہیں تھیں۔ ان کے نزدیک اس کا فیصلہ بس ضد تھا۔ جب وہ کسی طرح نہ مانی تو سند یافتہ ہٹ دھرم اور خود غرض مشہور ہوگئی۔ اس نے دنیا کو ہی نہیں خود کو بھی حیران کیا تھا۔ اس نے بھی نہیں سوچا تھا ایسا کچھ کر گزرے گی یعنی کسی کی نہیں سنے گی۔

طلاق کے کاغذات بھی جلد مل گئے۔ نانی اور مہناز اس دن خوب روئیں اور وہ مجرموں کی طرح چھپتی رہی۔ سارا دن نانی اس کو سناتی رہیں۔ مہناز کا رویہ اسے سب سے زیادہ تکلیف دیتا تھا۔ اس نے ہمیشہ ماں کی بیوگی، تنہائی، مشقت کا احساس کیا تھا۔ انھیں آرام پہنچانے کی کوشش کرتی رہی تھی اور جب اسے سب سے زیادہ ماں کی ضرورت تھی، انھوں نے اس سے نظر پھیر لی۔ وہ تب تک ہی اچھی بیٹی تھی جب تک ان کی بات مان رہی تھی۔

چند دنوں میں زندگی اپنے معمول پر آگئی۔ پہلے سے زیادہ اب اسے کام کی ضرورت تھی تاکہ خود کو مصروف رکھے۔ پہلے بھی باورچی خانہ وہی سنبھالتی تھی۔ اب اس نے کام والی ماسی کی چھٹی کر کے جھاڑو پونچھا برتن بھی اپنے سر لے لیے۔ صبح سب کے گھر سے جانے کے بعد نانی اور وہ ہی گھر میں ہوتی تھیں۔ وہ کام کر کے خود کو تھکاتی رہتی، مصروف رکھتی۔ گھر والے سب اب بھی خفا ہی تھے اور ایک ضدی ہٹ دھرم لڑکی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ کال کے علاوہ بات گاہے گاہے اسے یاد دلاتے رہتے تھے کہ اس نے کیا بے وقوفی کی ہے، انھیں کتنا شرمندہ کیا ہے، کتنا نقصان ہوا ہے وغیرہ۔ اس نے اپنی کزنز اور سہیلیوں کے فون اٹھانا اور واٹس ایپ دیکھنا بھی بند کر دیا تھا کہ کسی کے پاس کوئی دوسری بات نہیں تھی۔

☆☆☆

کچھ دن سے وہ غور کر رہی تھی بازو والی آنٹی کچھ زیادہ ہی نانی کے پاس آنے لگی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کا ننھا پوتا بھی ہوتا تھا جو ان سے سنبھلتا نہیں تھا یا پھر انھیں بچوں کو سنبھالنے کی عادت نہیں تھی۔

"کیا ضرورت تھی بچے کو ماں سے دور کرنے کی۔ ماں کو ہی سونپ دیتے اتنا چھوٹا بچہ۔" وہ روتے رلتے معصوم کو دیکھ کر سوچتی۔

اسے اتنا ہی علم تھا کہ بہو بیٹے میں طلاق ہوگئی تھی اور اس کے بعد وہ پوتے کی وجہ سے بیٹے کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ وہ اس وقت بھی باورچی خانے کی کھڑکی سے اسے فرش پر بیٹھا دیکھ رہی تھی۔ اس کے پاس چند کھلونے تھے جن سے کھیلتے ہوئے وہ انھیں بار بار منہ میں ڈال رہا تھا۔ چہرہ، لباس سب گندے تھے۔ پاس اس کی دادی، نانی کے ساتھ باتوں میں مشغول تھیں۔ ان کا پسندیدہ بلکہ دونوں کا پسندیدہ موضوع بچے کی ماں اور ان کی سابقہ بہو تھی۔ اب بھی وہ اس کے کارنامے اور برائیاں ہی گنوا رہی تھیں۔

برتن دھونے کے بعد، وہ وہیں کھڑے کھڑے میتھی صاف کر رہی تھی تب دوسری طرف کا گیٹ کھلنے کی آواز آئی اور کچھ دیر بعد رافع کی آواز آئی جو ان دونوں کو سلام کر رہا تھا۔ اس نے نیچے جھک کے بیٹے کو گود میں اٹھایا اور چلا گیا۔ کچھ دیر بعد نانی کو خیال آیا۔

"تمھیں اسے چائے وائے دینا ہوگی۔"

"وہ اس وقت عبداللہ کو نہلا رہا ہوگا، یہ باپ بیٹے کا ٹائم ہوتا ہے۔ میں نہ دوں تو چائے بھی بنا لیتا ہے۔" ان کا ارادہ نہیں تھا جانے کا۔ وہ میتھی لیے ہال میں آگئی۔

رافع تھکا ہارا تھا مگر عبداللہ کو دیکھ کر اس سے رہا بھی نہیں جاتا تھا۔ وہ پروین سے شکایت بھی نہیں کرتا

تھا۔ وہ چار بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا اور امی کو اپنے گھر میں آرام اور اپنی مرضی سے دن گزارنے کی عادت تھی۔ ویسے بھی وہ زیادہ دن ایک جگہ نہیں رکتی تھیں۔ اتفاق سے دونوں بڑی بہنوں کے شوہر بیرون ملک ہوتے تھے۔ شوہر کی وفات کے بعد وہ باری باری اپنا وقت بیٹیوں اور بیٹوں کے گھر گزارتی تھیں مگر اب وہ اس کے ساتھ بندھ گئی تھیں۔ ان کے آبائی گھر میں بڑے بھیا اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ بھی ملازمت سے پہلے وہیں ہوتا تھا۔ وہ دن بھر عبداللہ کو دیکھنے، کھلانے اور سنبھالنے میں ہی بے حال ہو جاتی تھیں۔

عبداللہ کو نہلا کے صاف ستھرا لباس پہنانے کے بعد بھوک لگی تھی۔ اس نے میز پر بٹھا کے اسے ایپرن پہنایا تا کہ کپڑے خراب نہ ہوں اور پھر کیلا چھیل کر تھما دیا۔ اپنے لیے چائے رکھتے ہوئے اسے خیال آیا کہ اس نے کپڑے تبدیل نہیں کیے اور آج واشنگ مشین بھی لگانی ہے۔ عبداللہ کو گود میں اٹھا کر وہ ہال میں آیا اور اسے قالین پر چھوڑ کے خود واشنگ مشین لگانے لگا۔ عبداللہ ہال چھوڑ کر اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

پہلے وہ اپنی مشکلیں دفتر کے رفیقوں سے یا بھائی بہنوں سے بانٹتا تھا اور سب کا مشورہ ایک ہی ہوتا تھا کہ فوراً دوسری شادی کر لو جبکہ اس کا پہلا تجربہ اتنا تلخ تھا کہ اب اسے شادی اور بیوی سننا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

پروین آئیں تب واشنگ مشین چل رہی تھی، وہ صوفے پر چائے کا کپ لیے، نیچے قالین پر بیٹھے عبداللہ کو دیکھ رہا تھا جو پنسل سے بیاض پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہا تھا۔

☆☆☆

چھٹی کے دن، مہناز کبھی کبھار دل کرے یا بچوں کی فرمائش ہو تو پکا لیتی تھیں جیسے آج نانی کی فرمائش پر سوجی کا حلوہ بنا تھا۔

"یہ بازو میں دے آؤ۔" انھوں نے حلوے سے بھری طشتری ڈھانکتے ہوئے اس کی طرف بڑھائی۔

بڑے دن بعد، نانی کی فرمائش پر میٹھا بنا تھا ورنہ تو ہفتوں بلکہ مہینوں سے گھر میں سوگ چل رہا تھا، یہ کام اکثر کامل کرتا تھا وہ نہ ہو تو حفصہ یا عندلیب مگر وہ اتنا کم اسے مخاطب کر رہی تھیں کہ اس نے اس خوشی میں ہی طشتری لے لی۔

وہ پہلے گھر کے معاملات میں کبھی کبھار ہی سہی اختلاف کرتی تھی یا اپنی رائے دیا کرتی تھی، اب اس نے وہ بھی چھوڑ دیا تھا کیونکہ ایسی صورت حال میں بات کہیں سے بھی شروع ہوئی ہو، ختم اس کی ضد اور ہٹ دھرمی پر ہونے لگی تھی۔

"امی!" رافع کی تاسف اور تعجب بھری آواز نے اس کے قدم روک دیے۔

"یہ تو کسی کی مجبوری کو کیش کرنا ہوگا۔" وہ کچھ دن بعد اسے بھی بتا چکی تھیں کہ بریرہ اس رات کیوں واپس آئی تھی۔

"تمھاری اتنی عقل والی بات مجھے سمجھ میں نہیں آتی مگر اتنا یقین ہے وہ منع نہیں کریں گے۔ پیچھے دو بیٹیاں ہیں، بدصورت نہیں مگر شکل، تعلیم، گھرانہ، سب واجبی سا ہے، اس پہ جس طرح پہلی کی شادی ٹوٹی ہے، کوئی رشتہ آجائے غنیمت سمجھو۔"

"امی! امی!" اس نے انھیں آگے بولنے سے روکا۔

"پلیز۔ یہ سب نہ سوچیں۔ آپ میری دوسری شادی کے لیے رشتہ دیکھنا چاہتی ہیں، دیکھیں مگر اس طرح کسی کی مجبوری یا بے بسی کو یوز کر کے نہیں۔ جب کوئی دل سے اس پوزیشن کے لیے راضی نہیں تو شادی کا مقصد ہی پورا نہیں ہوگا۔"

"اس میں کیا برائی ہے؟"

"امی! شادی کی رات تن اس نے اتنا بڑا فیصلہ کیا تھا اور مجھے مسائل نہیں چاہئیں۔" سب کی اس کے متعلق رائے بن چکی تھی۔

"ارے وہ تو سمجھو نصیب میں نہیں تھا ورنہ وہ سیدھی لڑکی ہے۔ اتنے دنوں سے دیکھ کر ہی کہہ رہی

digest library.com

ہوں۔" پروین سوچ سمجھ کر ہی بات کر رہی تھیں۔ ان کے مطلب نے اس وقت انھیں بھیڑ سے ذرا الگ کر دیا تھا۔

"امی پلیز۔"

"دونوں کی ضرورت ہے، دونوں کا کام ہو جائے گا۔ کام کاج میں طاق لڑکی ہے، پھر بغل میں ہی میکہ ہوگا تو بار بار گھر چھوڑ کے جانے کا بھی مسئلہ نہیں۔" رافع دھیرے سے ہنسا۔

"امی! اتنی دور تک سوچ لیا آپ نے۔"

"ہاں تو سب مجھے ہی تو سوچنا ہے۔"

"آپ سوچیں لیکن یہ نہیں۔ یہاں ایسی بات بھی نہیں کہ رشتے نہیں آئیں گے کیونکہ اتنی ایج نہیں اور سب کو علم ہے وہ اسی وقت واپس آگئی تھی، کچھ وقت بعد ہو جائے گی اس کی شادی آپ کہیں اور نظر دوڑائیں۔ ویسے اب بھی میرا دل شادی کے لیے راضی نہیں ہے۔"

"ارے تو تمھارا رشتہ کیا برا ہے، لاکھوں میں ایک ہے اور تم اپنے دل کو بھول کے بیٹے کو دیکھو کیسے رل رہا ہے۔"

"امی۔!" وہ پھر کچھ کہہ رہا تھا مگر وہ دبے قدموں پلٹ گئی۔

باورچی خانے میں جانے کے بجائے وہ طشتری لیے کمرے میں آگئی۔

"تو اب یہ ہوگا!" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے طشتری میز پر رکھی۔

"شادی، رشتوں کے بازار میں، میں ایک ڈیمیجڈ پیس ہوں اور میرے نقص کا ڈسکاؤنٹ یہ ہے کہ مجھے دوسری تیسری بیوی یا سوتیلی ماں بننے کے لیے چنا جا سکتا ہے اور میں مسائل پیدا کرنے والی ہوں۔" جس انداز میں پروین نے کہا تھا، وہ یاد کر کے اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"آنٹی اور نانی کی یہ کھچڑی پک رہی ہے۔ وہ اس لیے ادھر آئی ہیں۔" اس نے اندر گھل رہی تلخی کم کرنے کے لیے حلوے کا لقمہ منہ میں ڈالا۔

وہ تصور میں ذہن بنی سب کی استہزا بھری نظریں اور تمسخرانہ جملے دیکھ اور سن رہی تھی۔

"تو اس کے لیے تم نے نوید کو ٹھکرایا تھا!" اس نے اب تک اپنا مستقبل یا دوسری شادی کا سوچا نہیں تھا مگر اب وہ ایک بھیانک سچ کی طرح خود سامنے تھی۔ خیالوں میں گم اس نے حلوہ ختم کر دیا۔ مہناز کو علم ہی نہیں ہو سکا کہ وہ حلوہ ادھر پہنچا ہی نہیں ہے۔

وہاں اس کے اترنے کے وقت رافع کہہ رہا تھا۔

"وہ جتنی صاف گو اور نڈر ہے، اس سے توقع نہ رکھیں کہ وہ بس مجبوری کی وجہ سے عبداللہ سے محبت کرے گی۔ اگر اس نے پہلے دن ہی مجھے یہ کہہ دیا کہ میں اس سے اس کی امید نہ رکھوں پھر؟"

"ایسا نہیں ہوتا۔ میں ہوں نا نظر رکھنے۔" ان کے اندر کی سخت قسم کی ساس نے کروٹ لی تھی۔ رافع نے سختی سے منہ بند کر لیا۔ وہ ان کا یہ رویہ اور بالکل ان کی ٹکر کی بیوی بھگت چکا تھا۔ اسے پھر وہی سب نہیں چاہیے تھا۔

وہ خاموش ہو گیا اور پروین اسے نیم رضامندی مان کر وہی گفتگو کرتی رہیں جب کہ وہ پچھتا رہا تھا کہ جذباتی ہو کر، انھیں رشتہ دیکھنے کی اجازت بھی کیوں دے دی۔

عبداللہ کے سونے کے بعد، وہ لیپ ٹاپ لیے ماہانہ بل کی ادائیگی کے لیے بیٹھا تو یکا یک ذہن میں پروین کی باتیں گونجنے لگیں، ساتھ ہی راستے پر سر جھکائے بھاری لہنگے میں تیز قدموں سے چلتی پریزہ یاد آگئی۔ دور سے ہی وہ ان دونوں کو نظر آگئی تھی۔ اس نے سر جھٹک کے براؤزر میں بینک پورٹل اوپن کیا۔

اگلے دن دوپہر میں اسے پروین نے گھبرا کے فون کیا۔

"عبداللہ کو بہت تیز بخار ہے۔" وہ سب چھوڑ کے گھر بھاگا۔

ڈاکٹر نے اسے بٹھا کے بیس منٹ تک سمجھایا کہ کیسے بچہ لاپروائی کا شکار ہو رہا ہے۔ اس پر توجہ دے کر کس طرح بار بار اسپتال کے چکروں سے بچا جا سکتا ہے۔ وہ اسے لیے گھر واپس آیا تو بے حد اداس اور دل گرفتہ تھا۔ اولاد اس کی ذمہ داری تھی۔ وہ پروین کیا کسی سے بھی شکوہ نہیں کر سکتا تھا، جب اسے پیدا کرنے والی ماں نے ہی چھوڑ دیا تھا۔ اتنے ننھے بچے کے ساتھ طلاق کے وقت سب سے بڑا مسئلہ اولاد ہی بن جاتی ہے مگر ان کے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا۔ مہوش اور اس کے گھر والوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ اپنا بچہ خود ہی پالو۔ اس بھری دنیا میں عبداللہ کے پاس محض باپ تھا، اس کی دیکھ بھال کرنے اسے پالنے کے لیے اور وہ بھی ناکام تھا۔ وہ اس کے لیے ملازمت چھوڑ کے گھر بھی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

آغاز میں عبداللہ کے لیے آیا رکھی تھی، مگر دو بار انہیں بدلنے کے بعد اس نے کان پکڑ لیے تھے اور اس کے بعد ہی اس نے پروین کو اپنے پاس بلایا تھا۔ پروین کو بھی احساس تھا، پوتے سے محبت تھی، اس کی فکر تھی لیکن ان کی عمر، عادت اور ایک لمبے عرصے سے بن چکا معمول بدلنا بڑا مشکل تھا۔ وہ اپنی سی کوشش کرتی تھیں۔

اگلے دن باری باری، دونوں بہنوں کے فون آئے جو عبداللہ کی طبیعت کا پوچھنے کے بعد دوسری شادی اور عبداللہ کے لیے ماں کی ضرورت پر ہی بولتی رہی تھیں۔ شام میں پروین پھر اسی سوال کے ساتھ کمرے میں موجود تھیں۔

"تم ہاں کہو تو میں بات کروں۔"

"مجھے کچھ دن دیں سوچنے کے لیے۔" اسے واقعی سوچنے کی ضرورت تھی۔

مثالی تو اس دنیا میں کچھ نہیں ملتا۔ نہ وہ خود ساری عمر تنہا رہ سکتا تھا، نہ جان بوجھ کر عبداللہ کو یوں رلنے دینا ٹھیک تھا۔ باجی کی بات بھی کہیں دل میں ٹھہر گئی تھی کہ اس عمر میں عبداللہ کے لیے جذباتی وابستگی قائم کرنا آسان ہے۔ دوسری ماں سے ابھی قائم ہوا تعلق مضبوط ہوگا بہ نسبت اس کے کہ تم اس کے سمجھ دار ہونے کے بعد دوسری شادی کرو۔

پہلی بار یہ سب سوچتے ہوئے ترجیحات بالکل الگ تھیں اور اب یکسر الگ۔ پہلے لڑکی میں خوب صورتی، تعلیم، اعتماد، شوق عادات، پسند ناپسند خاندان سب ہی اہم تھا۔ مہوش اور اس نے رشتہ طے ہونے سے پہلے ایک دوسرے سے فون پر بات اور ملاقات بھی کی تھی۔ ایک دوسرے سے پسند ناپسند توقعات بھی پوچھی تھیں۔ اس کے بعد بھی یہ رشتہ ناپائیدار ثابت ہوا تھا۔ اور اب۔ اس کی لاٹری نکل آئے گی اگر وہ اسے سگی ماں جیسا پیار دے اور ایسا نہ بھی کر سکے تو کم سے کم اس کا خیال رکھنے اور سنبھالنے والی ہو، اس میں انسانیت، نرمی اور ہمدردی ہو تو بھی وہ خوش قسمت ہوگا۔ وہ جتنا سوچ رہا تھا اتنا بے کل ہو رہا تھا۔ یہ جوا ہی تھا، جیت گئے یا لٹ گئے۔

digest library.com

پروین اس کے سوچنے پر ہی اس قدر پرجوش ہوگئیں کہ نانی کے کان پر بات ڈال دی اور نانی کو تو وہ کسی بھی طرح 'شادی شدہ' چاہیے تھی پھر یہ تو ایسی جگہ تھی جہاں مہناز کا خرچا بھی نہیں ہونا تھا۔ وہ ہال میں بیٹھی، باہر صحن میں ہو رہی ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔

"میں اب کوئی رسک نہیں لوں گی امی! جیسی وہ ہٹ دھرم ہے کچھ بعید نہیں پھر رسوا کروا دے ہمیں۔"

"عقل کے ناخن لو۔" نانی نے ڈانٹا۔

"گچی پکڑ کے نکاح پڑھواؤ اس کا اور بھیج بازو میں۔ شکر کا مقام ہے کہ گھر بیٹھے ایسا اچھا رشتہ مل گیا۔"

"میں زبردستی نہیں کروں گی۔ مجھے اس لڑکی پر بھروسا نہیں اب۔" مہناز کی آواز تھکی سی تھی۔ اسے ان پر ترس آیا اور دل دکھ گیا۔ ان سے اس کے شکوے اپنی جگہ مگر وہ جانتی تھی اس اقدام سے انہیں بہت تکلیف پہنچی ہے۔ کاش وہ اس کی سن لیتیں تو دونوں ایک دوسرے کا مداوا، مرہم بن سکتی تھیں!

"وہ مانتی ہے تو ٹھیک ورنہ منع کر دیں گے۔"

"کیسے نہیں مانے گی میں دیکھتی ہوں۔" نانی نے چمک کے کہا۔

"کتنا شرمندہ کیا ہے اس نے روبی کے سامنے۔ سالوں کی دوستی ختم ہو گئی اس کی وجہ سے۔ روبی نے ہر مشکل میں ہمیشہ میرا ساتھ دیا تھا۔ اس کے لیے پریشان تھی تو، کہاں وہ کہاں ہم پھر بھی اپنے اکلوتے بیٹے کا رشتہ دیا، سب کے دن بدل جاتے، زندگی سنور جاتی لیکن اس لڑکی نے۔" انھوں نے سر جھٹک کے لب بھینچے۔ بریرہ کو لگا اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا ہو۔ بے وقعتی کی شروعات تو بہت پہلے گھر سے ہوئی تھی۔

"تمہیں زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب تک وہ گھر میں رہے گی نہ لوگ بھولیں گے نہ باتیں ختم ہوں گی اور جب تک وہ نہیں نکلے گی پیچھے والی دو بھی لٹکی رہیں گی۔" اب وہ سوچتی تھی کیا نانی ہمیشہ سے ایسی ہی تھیں، بے مروت۔

"اچھا چھوڑیں، دیکھیں گے ابھی انھوں نے باقاعدہ کوئی رشتہ نہیں دیا ہے۔ کل الماس کی طرف منگنی میں جانا ہے۔ آپ کی آسمانی ساڑھی بھی دے دوں استری کو؟" مہناز کا دل بیٹی کی طرف سے اٹھ گیا تھا۔ انھیں اس سے یہ توقع نہیں تھی اور ان کے لیے اس کا یہ قدم ناقابل معافی تھا۔

وہ اٹھ کے کمرے میں آگئی۔ ماں بیٹے کی باتیں سن لینے کے بعد سے وہ مسلسل سوچتی رہی تھی کہ ساری دنیا ہی اب اس کے بارے میں منفی رائے رکھتی ہے۔

"تو وہ مان گئے۔" اسے اس دن کی گفتگو یاد آئی اور ساتھ یہ بھی کہ اس دن کامل کے ساتھ وہی اسے لینے آیا تھا۔ جو اس وقت غیر ضروری، غیر اہم، بے ضرر تھا وہ اچانک وہ سب نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن وہ سب کے ساتھ منگنی میں نہیں گئی تھی۔ نانی نہیں تھیں لہٰذا پروین بھی شام کو عبداللہ کے ساتھ ادھر نہیں آئیں۔ جب رافع گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا، وہ صحن میں رکھے دیوان پر بیٹھی تھی جسے نانی اپنے تخت کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔ آواز پر اس نے سر اٹھا کے دیکھا اور پھر فون پر جھک گئی۔ وہ دونوں پیر اوپر رکھے بیٹھی تھی۔ جب دو سیاہ جوتے اس کے سامنے آکر رکے تو اس نے سر نہیں اٹھایا بلکہ پیر فرش پر رکھے۔

"آپ کے پاس وقت ہو تو مجھے کچھ بات کرنی ہے۔" اس کے پچھلے کارنامے کی وجہ سے اسے یہ بھی توقع تھی کہ وہ تابڑ توڑ، دو باتیں سنا کر چلتا کر دے گی مگر ایسے حوصلہ شکن خیالات کے باوجود اس سے بات ضروری تھی۔ اسے کہاں علم تھا کہ اس کارنامے سے پہلے بریرہ نے کبھی کوئی ایسا دلیرانہ کام نہیں کیا تھا۔ وہ گھر میں رہنے والی عام سی لڑکی تھی۔ دنیا اس رات سے پہلے والی بریرہ کو یکسر فراموش کر کے بس دولہا کو چھوڑ کے سسرال سے بھاگ جانے والی لڑکی کے تناظر میں ہی دیکھنے لگی تھی، رافع بھی اسی دنیا میں شامل تھا۔

"جی" بریرہ نے سر اٹھایا۔ رافع نے گردن گھما کے اپنے پچھلے دروازے کو دیکھا۔ پروین بھی کبھی ادھر آسکتی تھیں یا اپنے دروازے سے انھیں دیکھ سکتی تھیں۔

"اندر ہال میں بات کریں۔" وہ خاموشی سے اندر آگئی۔ رافع اس کے پیچھے تھا۔ دونوں درمیان میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔

بریرہ کو اندازہ تھا اور ذہن اس کے آگے سوچنے سے انکاری تھا۔ رافع نے گلا صاف کیا۔

"آپ میری سچویشن جانتی ہیں اور امی چاہتی ہیں عبداللہ کے لیے مجھے دوسری شادی کر لینی چاہیے۔" بریرہ اسے دیکھنے لگی اور وہ رک گیا۔

"سوری اگر آپ کو اس طرح میرا ڈائریکٹ بات کرنا برا لگ رہا ہو۔ لیکن امی کو جواب دینے سے پہلے آپ کی منشا جاننا میرے لیے ضروری ہے۔" اس نے اصل بات کیے بنا ہی مدعا بیان کر دیا تھا۔

digestlibrary.com

"دوسری شادی میری خواہش یا ضرورت سے زیادہ عبداللہ کی وجہ سے میری مجبوری ہے۔ پہلی ناکامی کے بعد میں دوبارہ اتنی جلدی دوسرے رشتے کے لیے تیار نہیں ہوں مگر۔ عبداللہ کو ماں کی ضرورت ہے، گھر کو ایک مالکن کی۔ میں اس وقت خود غرض نہیں ہو سکتا نہ اپنے بیٹے کے لیے نہ اپنی زندگی میں آنے والی کے لیے۔" وہ پھر رک گیا اور بریرہ سوچ رہی تھی۔

"کیا یہ بھی نوید کی بات جیسا ہی نہیں ہے؟ کیا اس وجہ سے یہ احتیاطاً پہلے کہہ رہے ہیں تاکہ میں پھر تو کیا اب مجھے ہمیشہ ایسے ہی دیکھا جائے گا جو۔" سوچ آوارہ سی ادھر ادھر بھٹک رہی تھی۔

"میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں۔" اسے احساس ہوا وہ مناسب انداز میں اپنی بات کہنے میں ناکام ہو رہا ہے مگر یہ اتنا آسان بھی نہیں تھا جتنا اس نے سوچا تھا۔ وہ پھر رک گیا کہ اس سے بالکل دوٹوک اور کھلے انداز میں کہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ یہ بتانا چاہتا تھا پہلی شادی ٹوٹنے میں اس کا قصور بھی ہو سکتا ہے اور وہ یہ تاثر بھی نہیں دینا تھا کہ اسے بس بیٹے کی ماں چاہیے۔

"ظاہر ہے عبداللہ کی ماں میری وائف بھی ہوگی۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میری طلاق اس وجہ سے ہوئی کہ ہم ایڈجسٹ نہیں کر سکے۔" وہ پھر رکا اور اس بار اس نے ہار مان لی۔ سوچنا اور روبرو اس سوچ کو الفاظ کے قالب میں ڈھالنا، دو بڑے مختلف کام تھے اور دوسرے میں وہ اناڑی تھا یا کم از کم فی الحال تو اناڑی ثابت ہو رہا تھا۔

"یہ جاننے کے بعد بھی اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں امی سے ہاں کہوں ورنہ میں خود انہیں منع کر دوں گا۔ آپ سوچ لیں اور مجھے۔" اس نے رک کے نظر دوڑائی اور بریرہ کے پیچھے ٹی وی اسٹینڈ پر قلم اور چھوٹا سا پیڈ نظر آ گیا۔ وہ اس کے پاس سے گزر کر گیا۔ وہ حیرت سے مڑ کے اسے دیکھنے لگی جو ٹی وی کے قریب جھکا تھا۔ کچھ پل بعد وہ واپس آیا اور اس کی طرف وہ چوکور پرچہ بڑھایا۔

"میرا نمبر۔ آپ جواب اس پر میسج کر دیجیے گا۔" بریرہ نے کاغذ لے لیا۔

رافع ہال سے نکل گیا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ الٹا پلٹا، ٹوٹا پھوٹا، بے ربط سہی وہ جو چاہتا تھا، اس تک پہنچ گیا تھا۔

بریرہ وہ نمبر پڑھتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ دماغ ایک بار پھر سن تھا۔ کچھ مہینے پہلے تک وہ اپنی شادی شدہ زندگی اور مستقبل کے خواب دیکھ رہی تھی، منصوبے بنا رہی تھی۔ بڑے شوق سے اس نے تیاریاں کی تھیں، پورے جوش سے چھوٹی چھوٹی رسموں کا لطف اٹھایا تھا، دعائیں مانگی تھیں اور وہ سب چند جملوں کے بعد خوش نما مستقبل کے بجائے دل دکھانے والی یادوں میں بدل گیا تھا۔ ابھی اپنے فیصلے اور اس پر گھر والوں کے ردعمل کی حیرانی ختم نہیں ہوئی تھی کہ زندگی نے ایک اور گمان سے پرے کی بات حقیقت بنا کے مقابل کھڑی کر دی تھی۔

"دوسری بیوی، سوتیلی ماں۔" اس نے پہلے ان دونوں کو سنا تھا مگر اس وقت یہ الفاظ دہراتے ہوئے اسے احساس ہوا یہ اب اس کے ساتھ ہونے کا محض 'امکان' نہیں رہا تھا بلکہ ہو رہا تھا۔ اس نے پھر وہ دو الفاظ دہرائے اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اسے بھی نہیں علم تھا وہ کیوں رو رہی تھی۔

"بھولو مت تم بھی طلاق یافتہ ہو۔" اندر سے کسی نے یاد دلایا اور آنسو تھم گئے۔ وہ تو بھول ہی گئی تھی کہ اب جس سے اور جب ہوگی وہ اس کی بھی 'دوسری شادی' ہوگی۔ اس نے پھر پرچے پر درج نمبر پڑھا۔

وہ اٹھ کے کمرے میں آ گئی۔ کامل نے اپنے کمرے میں اسے بڑی سہولت سے جگہ دے دی تھی اور وہ خود ہال میں سونے لگا تھا۔

"تم نے اتنے دشمن اپنی عزت نفس اور خودداری کے لیے بنائے ہیں تو اب بھی اسی کا خیال کرو۔ اس فیصلے کے نتائج اچھے یا برے تمہیں ہی

digest library.com

بھٹکتے ہیں۔ اسی استقامت سے آگے کا سوچو۔"
آئینے میں اسے اپنا عکس بولتا محسوس ہوا۔

"دوسری شادی، دوسری بیوی اور شوہر کا پہلی شادی سے بچہ عام سی باتیں ہیں۔ بہت سوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ کم از کم نوید جیسا دھوکا نہیں ہے۔ تمہیں پتا ہے آگے تمہارے سامنے کیا ہے، سب واضح ہے اور جو واضح نہیں تھا، اس کی توضیح انہوں نے خود کردی ہے۔" وہ حقیقت پسندی سے سوچ رہی تھی مگر اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ یہ اس کے خواب تو نہیں تھے۔

کچھ دن پہلے تک وہ ست رنگی ارمان اور لطیف احساسات سے لبریز لڑکی تھی۔ خود کو اولیت دینے والے ایک فیصلے نے اس سے کتنی مراعات چھین لی تھیں۔ اب دوسرے کتنے ہی مقامات پر اسے 'اولیت' سے دستبردار ہونا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اول الذکر فیصلہ اس کا تھا اور اس کے بعد آگے کی راہ پر اس فیصلے کا سایہ تھا تو وہ کسی سے شکایت نہیں کرسکتی تھی۔ اپنے انتخاب کے نتائج جیسے بھی ہوتے اسی کے تھے۔

"شکر کرو انہوں نے پہلے ہی تم سے پوچھ لیا۔ اللہ نے ایک موقع دیا ہے تو اسے گنواؤ مت۔ تم بھی اس سے جو کہنا ہے، پوچھنا ہے پہلے ہی کرسکتی ہو اور اور اس کے بعد شاید امی کی ناراضی بھی ختم ہو جائے۔"

ایک موہوم سی امید نے اس کی بھیگی آنکھوں میں چمک پیدا کردی۔ وہ نانی اور ان کی باتیں سن چکی تھی۔ اس ساری صورت حال میں دل و دماغ اچھا محسوس کرنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ اس نے بہت ہی نمبر دیکھا۔ وہ بے خیالی سی اتنی دفعہ اسے دہرا چکی تھی کہ اب اسے زبانی یاد ہو گیا تھا۔

"جب تک میں یہاں رہوں گی کچھ نارمل نہیں ہوگا اور منزلیب حفصہ کا بھی یہ فائنل ایئر ہے، نانی ٹھیک کہہ رہی تھیں اور پھر اس شادی میں امی کا خرچا نہیں ہوگا۔ اور وہ منافق نہیں، شادی کی وجہ بیٹا ہے یہ بتا کر فیصلہ بھی مجھ پر چھوڑا ہے۔"

وہ سوچتی رہی کہ اس سے یہ پوچھے، فلاں بات پہلے ہی کہہ دے، یہ سوال کرے، اس کا جواب مانگے لیکن آخر اس نے طے کیا کہ وہ کوئی بات نہیں کرے گی۔ نوید اور اس کے گھر والوں کے بعد رافع کا پہلے ہی سچ کہہ کر اس کی رائے پوچھنا، کافی تھا۔ رافع نے اسے اہمیت دی تھی۔ نانی کی طرح نہیں سوچا کہ یہ تو اس کے لیے سنہری موقع ہوگا، وہ نہ کر ہی نہیں سکتی۔ جو کچھ اس نے کہا تھا اس کے بعد وہ تیار تھی تو پھر بات ہی ختم۔

اس نے سونے سے پہلے اسے لکھ بھیجا۔

"آپ اپنی امی سے ہاں کہہ دیجیے۔"

آنکھیں بند کر کے وہ سوچ رہی تھی، صبح آنکھ کھلے تو سب خواب ہو۔ نوید، شادی، اس کی واپسی، سب کے رویے اور رافع کچھ بھی حقیقت نہ ہو۔

☆☆☆

صبح رافع نے ایک نئے نمبر سے پیغام دیکھا تو چونکا اور پڑھنے کے بعد خوش ہونے کے بجائے ذہن سوچوں سے بھرنے لگا۔ اس نے سوئے عبداللہ کو دیکھا۔ شادی کے نام سے اسے مہوش کے ساتھ گزارا وقت یاد آجاتا تھا جو ان دونوں نے بحث کرتے اور لڑتے ہی گزارا تھا۔ جن خوابوں اور توقعات کے ساتھ اس نے شادی کی تھی، اب اسے ان سب سے ڈر لگتا تھا مگر عمر ایسے ہی نہیں گزاری جا سکتی اور عبداللہ کی تو بالکل نہیں۔ اپنے تحفظات اور وسوسوں کے ساتھ آگے بڑھنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ تھا۔

اس نے دفتر کے لیے نکلنے سے پہلے پروین کو اپنا فیصلہ سنا دیا۔ انہیں اتنی جلدی تھی کہ وہ کچھ دیر بعد ہی نانی کے پاس پہنچ گئیں اور اس بار صاف لفظوں میں اپنا مدعا بیان کیا۔

اس وقت نانی اور اس کے علاوہ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ اسکول میں مہناز شاذ ہی فون اٹھاتی تھیں پھر بھی انہوں نے پروین کے جاتے ہی فون ملایا اور ادھر مہناز کے اٹھاتے ہی خوش خبری سنائی۔

"انھیں کچھ نہیں چاہیے بس سادگی سے نکاح کا کہہ رہی ہیں۔ وہ اپنی بیٹیوں، بیٹے کو بلائیں گی اور قریب کے چند لوگ ہوں گے۔" نانی تو اپنی طرف سے سب طے کر چکی تھیں۔

رات میں مہناز نے سب کے سامنے اس سے پوچھا اور اس نے 'ٹھیک ہے۔' کہہ دیا۔

"ہا۔ا" عصمہ کے چہرے پر حیرت تھی۔

"نوید بھائی کو چھوڑ کے تم یہاں شادی کرو گی آپی؟"

"اب اگر وہ پچھتا رہی ہیں تو تم تو چپ رہو۔" عندلیب نے اسے ٹہوکا دیا۔

وہ اٹھ کے کامل کے کمرے میں آ گئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے آیا۔

"آپی اگر آپ کی مرضی نہیں ہے تو صاف کہیں میں رافع بھائی سے بات کروں گا، وہ خود ہی منع کر دیں گے۔"

"تمھارے رافع بھائی نے کل مجھ سے بات کی تھی اسی لیے میں نے ہاں کی ہے۔" ایک ہی تو اسے سمجھنے والا تھا، اس سے کیا چھپانا۔

"کیا بات؟" اس کا تعجب بجا تھا۔

"یہی کہ انھیں شادی خود سے زیادہ بیٹے کے لیے کرنی ہے اور میں چاہوں تو ابھی منع کر دوں تا کہ وہ اپنی امی کو بھی بات بڑھانے سے روک دیں۔"

کامل چپ رہا۔ کیا کہتا اس بارے میں اس کی کوئی رائے نہیں تھی سوائے اس کے کہ جو بھی ہو بریرہ کی خوشی سے ہو اور رافع تو اسے ویسے بھی پسند تھا۔

"آپ نانی اور امی کی وجہ سے تو۔"

"نہیں۔ جبر ہی کرنا ہوتا تو ان کی وجہ سے نوید کے ساتھ رہنا کیا مشکل تھا۔" یہ دلیل کامل کے دل کو لگی۔

اگلی صبح ایک بار پھر وقفے وقفے سے فون بجنے لگا۔ نانی کا یہ وقت گزاری کا پسندیدہ مشغلہ بھی تھا، سارے خاندان کی خبر رکھنا اور خبر دینا۔

☆☆☆

نکاح کی تاریخ طے ہو گئی۔ جن کزنوں سے وہ بچ رہی تھیں، وہ سب اپنی باتوں کے ساتھ موجود تھیں۔

"اب تمھیں افسوس ہو رہا ہوگا نا کہ ہر لحاظ سے نوید اور اس کی فیملی اچھی تھی!" نجیلہ بات کے اختتام پر خود ہی افسوس بھرے 'چچ' کے ساتھ اسے ترحم بھری نظروں سے دیکھنے لگی کہ اب تو وہ اپنے منہ سے یہ اعتراف بھی نہیں کر سکتی تھی۔

"مجھے کوئی افسوس نہیں ہے اور نہ کبھی ہوگا۔" اسے جواب دینا ضروری لگا۔

"ہاں اب تو تم یہی کہو گی ورنہ تو سب جانتے ہیں ایک بچے کے باپ کے ساتھ شادی پر کون خوش ہوتا ہے۔" علیزہ فون میں مہندی کے ڈیزائن دیکھ رہی تھی، اس نے درمیان میں سر اٹھا کے کہا۔ وہ سب اس لیے برملا اظہار کر رہی تھیں کہ ان کے نزدیک اس کا پہلا فیصلہ ضد، ہٹ دھرمی اور غلطی تھا۔

"ویسے بریرہ آپی اتنی پیاری تصویریں تھیں اس دن کی، ممانی نے منع کر دیا کہ انھیں کہیں شیئر مت کرو۔ ویسی تصویروں کا اب تو کوئی چانس ہی نہیں ہے۔" فری کا افسوس دوسرا تھا۔

"نوید کے دل میں پہلے سے کوئی تھی تو اب ان کی بھی تو پہلی بیوی ہوگی نا دل میں۔" کسی اور کو یاد آیا۔

"تمھاری قسمت میں ہی تھا یہ۔ وہاں نہیں تو یہاں سہی۔"

اس نے سب کو جواب دینے کی کوشش کی لیکن جلد ہی احساس ہو گیا کہ انھیں قائل کرنا، سمجھانا سب بے کار ہے کہ کوئی اب تک شادی ختم کرنے کی وجہ سمجھا ہی نہیں تھا اور جو سمجھ بھی گئے تھے ان کے نزدیک، وہ بڑی فضول بات تھی۔

اسے ان چند مہمانوں کے بیچ ہی اتنی گھبراہٹ ہونے لگی کہ وہ دعا کر رہی تھی جلد سے جلد نکاح ہو اور وہ ان سے دور جائے۔ مہناز کا رویہ اب بھی ہنوز تھا۔ ضرورت اتنی بات اور بس۔ کوئی اہتمام نہیں کیا گیا تھا

digest library.com

پھر بھی کبھی کوئی پوچھتا، زیور کیا اور کتنا دیا ہے انہوں نے تو کسی کو یاد آتا کہ جوڑا نہیں بھیجا۔ پھر ہر چیز کا موازنہ پہلی شادی کے انتظامات اور لوازمات سے شروع ہو جاتا۔ اسے اب ادراک ہو رہا تھا کہ اس کی اس امیر اور اکلوتے نوید سے شادی ان سب کے لیے بڑی اہم تھی اور اسی لیے افسوس بھی گہرا تھا۔

بس ایک کامل دل سے خوش تھا دوسری پروین۔

آئیوری اور سنہری جوڑے میں اس کا نکاح ہوا جو اس کے واپس آئے جوڑوں میں سے ایک تھا۔

رخصتی کے وقت اس نے کوشش کی کہ زیادہ نہ روئے ورنہ سب نے ان آنسوؤں کو بھی پچھتاوا بنا دینا تھا۔ اسے ہر ایک نظر میں اپنے لیے تاسف، تمسخر، ترحم ہی دکھائی دے رہا تھا۔

"خوش رہو، سدا سہاگن رہو۔" مہناز نے گلے لگا کر دعا دی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس نے ان آنسوؤں کے ساتھ خود سے عہد کیا وہ انہیں خوش رہ کے دکھائے گی۔ ان کے لیے ثابت کرے گی کہ اس کے دونوں فیصلے درست تھے۔

بغل والے حصے میں ادھر سے زیادہ شور تھا۔ رافع کے بھائی بہنوں کے علاوہ ماموں، پھپھو اور چاچا مع اہل و عیال موجود تھے۔ زیادہ تر کو کچھ دیر میں واپسی کے لیے نکلنا تھا۔

ہال میں صوفے پہ ایک دوسرے کے ساتھ بٹھا کے، بریرہ سے سب کا تعارف کرایا جا رہا تھا۔

"اور یہ عبداللہ آج سے تمہارا بیٹا۔" سب سے آخر میں پروین نے اچانک عبداللہ کو اس کی گود میں ڈال دیا۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔

"امی!" رافع جز بز ہوا۔ سب کے سامنے یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ عبداللہ بازو میں باپ کو دیکھ کر اس کے پاس جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ رافع نے اسے اپنے پاس لے لیا۔

"اس معصوم بے زبان کو اپنی اولاد ہی سمجھنا بیٹا۔" رافع کی پھپھو نے اسے سلامی دیتے ہوئے سر پر ہاتھ رکھا۔ اس کے بعد کم و بیش یہ ہی تبصرے تھے۔

اللہ اللہ کر کے سب کا کھانا ہوا اور وہ سب روانہ ہوئے۔ آخر میں سگے بھائی بھابھی اور دونوں بہنیں اور ان کے بچے ہی رہ گئی تھیں۔

اسے کمرے میں پہنچانے کے بعد بھابھی نے رافع کو دروازے میں روکا۔

"بخدا اب تم اس سے عبداللہ کے بارے میں کچھ مت کہنا۔ وہ بے چاری پہلے ہی سب کی باتوں پر گھبرا رہی ہوگی۔" اتنے افراد میں رافع کو وہ ایک ہی اپنی ہم خیال ملیں۔

"امی کو ہر بات کی جلدی ہوتی ہے مگر تم صبر سے چلو۔ دھیرے دھیرے ہی سب سیٹ ہوگا۔" اس نے مسکرا کے سر ہلایا۔

سب کی باتوں کے باوجود، بریرہ کو اب تک پچھلا کچھ یاد نہیں آیا تھا مگر اس وقت اچانک نوید کا کمرہ اور وہ شب یاد آ گئی۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ سینے میں سانس رکنے لگا تھا، جسے بحال کرنے اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کے فضا سے ہوا اپنے اندر اتار لی۔

رافع نے اندر آ کر پیچھے دروازہ بند کیا تو وہ پلٹی اور اسے دیکھ کر سینے سے ہاتھ ہٹایا۔ رافع کے چہرے پر دوستانہ تبسم تھا۔ وہ بھی سادہ سے سفید کرتے شلوار میں تھا۔

بریرہ دونوں ہاتھ کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر اپنا اضطراب چھپانے کی کوشش کرنے لگی، جو رافع کو صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کمرے میں پنکھا چلنے کی آواز سب سے نمایاں تھی۔

"بریرہ!" ذرا آگے آ کر رافع رک گیا۔ اس نے آواز پر سر اٹھایا۔

"اس وقت نروس ہونا نیچرل ہے۔ اگر کچھ کہنا چاہتی ہیں تو بلا جھجک کہیں۔" اسے اس کے علاوہ ا[illegible] اب کی کوئی اور وجہ ذہن میں نہیں آئی۔ وہ مثبت انداز میں آغاز کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ خود سے کہہ رہا تھا کہ اسے عبداللہ کی خاطر سب سے پہلے سب کچھ

ٹھیک رکھنا ہے۔ ایک برے تجربے کے بعد وہ اپنے لیے خوش گمانیاں پالنے اور دور کی سوچنے سے پرہیز کر رہا تھا۔

"نہیں۔" اس کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔"

وہ کچھ کہتی تو گفتگو کو بہانہ ملتا۔ اب رافع سوچ رہا تھا اگلی بات کیا کریں۔ بریرہ سوچ رہی تھی۔

"اچھا ہوا انھوں نے وہ سب پہلے کہہ دیا تھا ورنہ یہ تو بالکل ویسا ہی ہوتا کہ پہلی بات ہی۔ افف میں کیوں کمپیئر کر رہی ہوں۔ یہ سب کیوں سوچ رہی ہوں۔ اگر انھوں نے وہ سب پہلے نہ کہا ہوتا تو ہم بھی اس وقت آمنے سامنے نہ ہوتے۔ یا اللہ نہیں۔ میرا دماغ وہی سوچے جو سوچنا چاہیے۔ لیکن کیا۔؟" اس نے انگلیاں مروڑتے ہوئے ساری سوچیں جھٹکنے کے لیے اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ اس کا سانس رک گیا جب دفعتاً رافع نے اس کے متحرک ہاتھوں پر ہاتھ رکھا۔ بے اختیار ہی اس نے سر اٹھا کے دیکھا۔

"ایسا تو کچھ نہیں جس کی وجہ سے تم اتنی اینکشیس ہو رہی ہو، اور اگر کچھ ہے تو بتاؤ مجھے۔"

تب اسے احساس ہوا کہ وہ کس قدر تیزی اور بے چینی سے اپنے ہاتھوں کو، انگلیوں کو متحرک رکھے تھی۔

وہ کچھ کہتی اس سے پہلے ہی باہر سے بچے کے رونے کی آواز بلند ہوئی۔

"عبداللہ۔" رافع تیزی سے دروازہ کھول کے باہر نکلا۔ بلا ارادہ ہی وہ بھی اس کے پیچھے باہر آئی۔ عبداللہ اپنی پھپھو کی گود میں مچل مچل کر رو رہا تھا۔

"نظر لگ گئی ہے میرے بچے کو۔" پروین نے اسے اپنی گود میں لیا۔

"کیا ہوا؟" رافع نے اس کے گال پہ ہاتھ رکھا جو عبداللہ نے جھٹک دیا۔

"پتا نہیں، بس روئے جا رہا ہے۔" اسے پچکارنے کے درمیان پروین نے کہا۔

رافع نے اسے گود میں لیا اور عبداللہ اس کے شانے پر سر ڈال کے اور مچل کے رونے لگا۔

"اسے کوئی تکلیف ہے؟ کہیں گرا تو نہیں؟ شاید پیٹ درد ہو......" وہ اسے لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھا جہاں اس کی دوائیاں تھیں۔ سب اس کے پیچھے تھے۔ بریرہ سوچتی ہی رہی اسے بھی سب کے پیچھے جانا چاہیے یا نہیں۔ جب احساس ہوا کہ وہ ہال میں تنہا ہے تو وہ بھی خواب گاہ میں آ گئی جہاں رافع پلنگ پر روتے عبداللہ کو دوا پلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر اس کے ہاتھ پیر پکڑ کے دوا حلق کے نیچے اتاری گئی۔ رافع اسے لیے کھڑا ہوا، شانے سے لگا کر تھپکنے لگا۔

"مجھے دو۔ اب سو جائے گا جھولے میں ڈالتی ہوں اسے۔" بھابھی نے اسے لینا چاہا۔

"پہلے چپ ہو جانے دیں پھر میں ہی لٹا دوں گا۔" مگر عبداللہ کا رونا کچھ کم نہیں ہو رہا تھا۔

حاضرین چپ نہیں تھے۔ سب کے پاس اس کے رونے کی وجہ تھی۔

"گرمی لگ رہی ہے۔"

"اتنے لوگ دیکھ کے گھبرا گیا ہے۔"

"اسے سارا وقت میری توجہ کی عادت ہے اور آج دن بھر نظر انداز ہوا ہے، بچے تو حساس ہوتے ہیں۔"

"باپ کو غصہ دکھا رہا ہے۔" کسی نے کہا اور سب ہنسنے لگے۔

"ابھی کلینک کھلا ہوگا۔" رافع نے دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھا۔

"عبداللہ کا رونا بند نہیں ہوا تو مشکل ہو جائے گی۔"

"نظر اتار دو اس کی نازیہ۔" پروین نے اس کی بات نظر انداز کر کے بیٹی سے کہا۔

"امی، وہ سب بعد میں کیجیے گا۔ میں ڈاکٹر فرحان کو دکھا آتا ہوں اسے۔" اس نے عبداللہ کو سنبھالتے ہوئے چیسٹ سے پہلے فون اٹھا کے جیب میں رکھا پھر چابی اٹھائی۔ ایک بار پھر سارا قافلہ اس

digest library.com

کے پیچھے تھا۔ عبداللہ کا رونا سب کے اعصاب پر سوار ہو چکا تھا۔ صحن میں آتے ہی عبداللہ کی آواز بغل والے گھر تک بھی پہنچ گئی۔

"میں چلتی ہوں ساتھ۔" بھابی نے کہا۔

"ارے وہ۔" آخر کسی کو یاد آیا۔

"بریرہ کو جانا چاہیے نا ساتھ۔"

"نہیں۔" پروین نے حتمی انداز میں کہا۔

"وہ نئی دلہن، اسے کہاں باہر نکالیں ابھی!"

"بھائی آپ ڈرائیو کریں۔" رافع نے چابی انھیں تھمائی۔ اس نے سب کے پیچھے کھڑی بریرہ کو دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے افسوس ہوا کہ یہ سب اسی وقت ہو رہا تھا۔

سب کو منع کر کے وہ دونوں ہی عبداللہ کو لے کر چلے گئے جس کا رونا ہنوز جاری تھا۔

ادھر سے نانی، مہناز اور کزنز بھی ادھر آ گئے تھے۔ اکثریت کی رائے تھی عبداللہ کو نظر لگی ہے کہ وہ دن بھر سے اپنے آپ میں مگن کھیلتا کودتا رہا تھا۔

"بریرہ کے نصیب میں سہاگ رات ہے ہی نہیں۔" دبی دبی سی ہنسی کے ساتھ بجیلہ، حفصہ کے کان میں کہہ رہی تھی جو اس نے بھی سنا مگر انجان بنی رہی۔

"یہ نوید بھائی کی آہ اور ان کے گھر والوں کی بدعا ہے۔" وہ آپس میں کھسر پھسر کرنے لگی تھیں۔

"نوید کی کیسی آہ! وہ تو شکر گزار ہو گا کہ اس کی وجہ سے سب کو پتا چل گیا گھر والے زبردستی کر رہے تھے۔" جانے یہ کس کی سرگوشی تھی۔

"جو بھی ہو یہ کیا کہتے ہیں اسے۔ ہاں مکافات عمل ہے۔"

"کچھ بھی!"

"اب اگر اسے رافع بھائی اور ان کی فیملی بریرہ کے سبز قدم سے جوڑ دیں تو کہ آتے ہی بچہ بیمار ہو گیا۔"

سب کے تبصرے اور اپنی رائے تھی۔ وہ ان جان بنی بیٹھی رہی جب تک کہ رافع کی بھابی نے اسے کمرے میں جا کر آرام کرنے نہیں کہا۔ تب نانی نے بھی باقی سب کو جانے کہا۔

"جاؤ تم سب بھی سو جاؤ اب۔" مہناز اور نانی وہیں رہیں باقی وہ سب چلی گئیں۔

سب کی باتیں باہر تو اس نے نظر انداز کر دی مگر تنہائی ملتے ہی رونا آنے لگا۔ ایسا کیا غلط ہو گیا تھا اس سے کہ وہ کسی کو صحیح نہیں لگتی تھی۔

"کیا مجھے ساری عمر اس قسم کی باتیں سننی ہوں گی؟"

تب ہی فون نے روشن ہو کے اس کی توجہ کھینچ لی۔ کامل کی کال تھی۔

"ہیلو۔"

"کیا ہوا ہے آپی؟ مجھے نانی نے ادھر آنے سے منع کر دیا تھا۔ میں کب سے کال کر رہا ہوں۔"

"اوہ! ہال کے شور میں مجھے فون کا پتا ہی نہیں چلا۔ کچھ نہیں ہوا۔ عبداللہ بہت رو رہا تھا اسے کلینک لے گئے ہیں کچھ تکلیف ہے اسے۔" وہ اس کی پریشانی سمجھ رہی تھی۔

"اچھا۔ آپ ٹینشن نہ لیں۔ رافع بھائی ایسے نہیں ہیں۔" وہ اس کی بات پر مسکرا دی۔ یقیناً وہ سب ادھر بھی وہی باتیں کر رہی ہوں گی بلکہ کھل کر کر رہی ہوں گی۔

"میں نہیں لے رہی، تم بھی مت لو۔ کمرہ بند کر کے سو جاؤ۔ تھک گئے ہو، بہت کام کیا ہے آج۔"

"جگہ ہی ڈھونڈ رہا ہوں۔ کمرے میں خالو اور بابر بھائی سو گئے ہیں۔"

"تم وہیں فرش پہ کچھ بچھا کے سو جاؤ اور کہیں جگہ نہیں ملے گی۔"

"جی یہ ہی کرتا ہوں۔"

فون رکھنے کے بعد وہ کمرے کا جائزہ لینے لگی جو صاف کسی خاتون کی توجہ کو ترسا ہوا لگ رہا۔ صاف ستھرا تھا۔ بے ترتیب بھی نہیں تھا مگرا سے دیکھتے ہی لگا الماری کے بازو میں کرسی کی جگہ نہیں تھی۔ چیسٹ کی جگہ دروازے کے بازو والی تھی اور پلنگ بھی

کمرے کے درمیان سے زیادہ دیوار سے لگا بہتر ہوتا۔ نی الحال چیزوں کی ترتیب کی وجہ سے کمرہ تنگ محسوس ہو رہا تھا۔

باہر بیٹھے سب ہی تھکے ہوئے تھے، سب سونا چاہتے تھے۔ نانی اور مہناز بھی کچھ دیر بعد چلی گئیں۔

جب رافع واپس آیا تو صرف پروین، نازیہ اور بھابھی جاگ رہی تھیں۔ عبداللہ سو گیا تھا۔

''شکر ہے سویا تو۔ کیا کہا ڈاکٹر نے؟''

''آج سب نے اسے جانے کیا کیا کھلا دیا ہے اسی وجہ سے پیٹ گڑبڑ تھا۔'' جواب بھائی نے دیا۔ ہال میں ہی ایک طرف اس کا جھولا تھا۔ رافع نے احتیاط سے اسے لٹا دیا۔

''ذرا چائے پلا دو۔'' بھائی نے بھابھی کو دیکھا۔

''امی آپ سو جائیں۔ عبداللہ ٹھیک ہے اب۔'' وہ بھائی کے بازو میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

''چائے میرے لیے بھی پلیز۔''

نازیہ اور پروین ہدایتیں دیتی اندر چلی گئیں۔ مکان کا یہ حصہ بریرہ کے گھر سے بڑا تھا۔

وہ آواز پر باہر آئی تھی اور اب دروازے میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ کیا کرے۔ باورچی خانے میں جاتے ہوئے بھابھی کی نظر پڑی۔

''آؤ بیٹھو۔ تم بھی لوگی چائے؟'' رافع نے گردن موڑ کے دیکھا۔ وہ نفی میں سر ہلا کے ان کے ساتھ ہی باورچی خانے میں آ گئی۔

وہ چائے بناتے ہوئے اسے بتا رہی تھیں کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے، جس سے اس نے اندازہ لگایا کہ باورچی خانہ انھوں نے ہی سنبھالا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد چائے کی ٹرے لیے وہ آگے اور بریرہ پیچھے تھی۔

''آپ دونوں کہاں سوئیں گے؟'' وہ عبداللہ کو ہال میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

''یہ ادھر صوفے پر اور میں یہیں فرش پر بستر لگا رہی ہوں۔ عبداللہ کو ادھر ہی رہنے دو۔'' بریرہ کو اس کی بھابھی ہی سمجھ دار اور سلجھی ہوئی لگیں۔ اندر بستر لینے جاتے ہوئے وہ اس کے پاس رک کے دھیرے سے گویا ہوئیں۔

''تم بھی جاؤ بریرہ۔ رافع چائے پی کر آ ہی رہا ہے۔''

وہ پھر کمرے میں تھی۔ اسے رافع کے جانے سے پہلے والا منظر یاد آ گیا۔

''اب وہی گفتگو آگے بڑھے گی یا۔'' وہ تھکی سی پلنگ کے کنارے ٹک گئی۔

''کتنا بڑا دن ہے آج کا ختم ہی نہیں ہو رہا ہے۔'' اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ تب ہی آہٹ ہوئی اور وہ کھڑی ہوئی۔ ایک بار پھر رافع سامنے تھا۔ اس نے ہاتھ میں تھامی چابی چیسٹ پر رکھی پھر جیب سے فون اتار کر رکھا۔

''سوری۔'' وہ وہیں چیسٹ کے پاس کھڑا اس کی سمت مڑا۔ وہ کلائی سے گھڑی نکال رہا تھا۔

''عبداللہ بیمار ہو تو زیادہ ہی سست ہو جاتا ہے اور روتا تو بالکل نہیں۔ یہ غیر معمولی بات تھی اس لیے لے جانا ضروری تھا۔'' وہ شرمندہ ہو گئی کہ وہ کیوں اسے صفائی دے رہا ہے۔

''سوری کی تو کوئی بات نہیں۔ شکر ہے وہ اب ٹھیک ہے۔''

گھڑی رکھ کے وہ پاس آیا۔

''ہم دنیاداری کے تقاضے نبھاتے ہوئے ابتدا کریں یا اپنا آغاز خود لکھیں؟'' رافع کی بات پر بریرہ کے چہرے پر جو تاثر ابھرا اسے دیکھ کر ایک بار پھر وہ اسی احساس میں گھر گیا، جو اس سے پہلی بار بات کرتے ہوا تھا، وہ اب بھی اپنا مدعا ڈھنگ سے اسے سمجھا نہیں پایا تھا۔

''میں واقعی، دل سے تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے یہ پروپوزل ایکسیپٹ کیا۔'' بریرہ اور الجھ کے دیکھنے لگی۔ اس کی بے تکلفی پر ایک سنسنی الگ بدن میں دوڑ گئی تھی۔

''تمھیں میری بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے یا

digest library.com

بری لگ رہی ہے؟" وہ خود کو مزید کنفیوز نہیں رکھ سکتا تھا۔

"نہیں۔ مطلب میں سمجھ رہی ہوں اور بری بھی نہیں لگ رہی۔" وہ رکی۔

"لیکن میں آپ سے ان باتوں کی توقع نہیں کر رہی تھی۔" لاشعوری طور پر وہ اس سے عبداللہ کا ذکر اور اس معاملے میں رافع کی توقعات سننے کی منتظر تھی۔

"پھر کیا توقع تھی؟" رافع کی آنکھوں میں دلچسپی جھلکی۔

"یہ کہ آپ مجھ سے عبداللہ کی بات کریں گے۔" رافع کا چہرہ بدل گیا۔

وہ دونوں ہی اپنے ماضی اور حال کی صورت حال کے ان جانے سے بوجھ تلے دبے تھے۔ وہ کچھ کہنے جا رہا تھا کہ چونک گیا۔ غور سے سننے کی کوشش کی اور پھر 'ایک منٹ' کہہ کے دروازے کی طرف بڑھا۔ ہال میں ہلکی روشنی تھی۔ بھابھی جھولے کے پاس گدا ڈالے سو رہی تھیں اور بھائی صوفہ کھول کر سو چکے تھے۔ اسے دھوکا نہیں ہوا تھا۔ جھولے سے عبداللہ کی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ وہ دونوں اتنی جلدی اس قدر گہری نیند میں ڈوبے تھے کہ کوئی نہیں جاگا اور ان کی نیند کا خیال کرتے ہوئے وہ عبداللہ کو کمرے میں لے آیا۔

"بھائی بھابھی سو گئے ہیں اس کی آواز سے جاگ جائیں گے اس لیے۔" بریرہ نے 'کوئی بات نہیں' کے انداز میں سر ہلایا مگر وہ پھر اس کی وضاحت پر شرمندہ ہو گئی تھی۔

وہ اسے شانے پر لیے ٹہلتا رہا۔ عبداللہ بے چین تھا، بیچ میں کمزور سی رونے کی آواز آتی تھی۔ دواؤں کا اثر تھا یا اب وہ رو رو کر تھک گیا۔

"یہ نیچے ڈالتے ہی اٹھ جائے گا۔ تم اسے لے لو میں ہال سے جھولا لے آتا ہوں۔" اسٹینڈ والا جھولا بند کر کے لانا اس کے لیے مشکل تھا۔ اس نے بازو پھیلائے اور رافع نے عبداللہ اسے دے دیا۔ وہ کسمسایا اور اس نے اسے شانے پر لٹا لیا۔

رافع جھولا لیے آیا تو وہ ٹہل رہی تھی۔ اس نے اسے دوبارہ کھولا۔ اس نے قریب آ کر جھک کے اسے اندر لٹایا ابھی سیدھی ہوئی تھی کہ وہ پھر رونے لگا۔ اس نے جھولا ہلایا مگر بے سود۔ اس خوف سے کہ اس کی آواز بلند ہو گئی تو، رافع پھر اسے شانے پر ڈال کر تھپتھپانے لگا۔ اسے بھی اسی میں سکون مل رہا تھا۔ دھیمی ہوتے ہوتے اس کی آواز بند ہو گئی۔

"یہ پتا نہیں کب تک اس طرح جگائے، تم چینج کر کے ریلیکس کرو۔" وہ ٹہل رہا تھا اور بریرہ ایک طرف کھڑی تھی۔ ایسے میں اسے یہ ہی حل نظر آیا۔

وہ خاموشی سے کپڑے بدلنے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد آرام دہ لباس میں باہر آئی تو وہ ہنوز ٹہل رہا تھا۔

"اسے مجھے دیں اور آپ بھی چینج کر لیں۔"

جب تک وہ ٹی شرٹ پاجامہ پہن کے آیا وہ اسے لیے ٹہلتی رہی۔ وہ پہلی بار بڑے غور سے سوچ رہی تھی کہ اتنے چھوٹے بچے کو کوئی ماں اپنی مرضی سے کیسے چھوڑ سکتی ہے۔ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ عبداللہ بمشکل ڈیڑھ یا پونے دو سال کا ہو گا۔

"تو کیا انھوں نے زبردستی اس سے بچہ چھین لیا تھا؟"

"شاید اب نہ اٹھے۔" رافع نے کہا اور اسے جھولے میں ڈالنے کا اشارہ کیا۔ بریرہ نے وہی کیا۔

وہ دونوں دیکھتے رہے کہ کہیں وہ پھر بے چین ہو کے آواز نہ نکالے۔

"اتنے چھوٹے بچے کو ماں کے پاس ہی ہونا چاہیے۔" وہ جو ذرا دیر پہلے سوچ رہی تھی، اسے دیکھتے ہوئے بے اختیار ہی منہ سے پھسل گیا۔ رافع نے چونک کے اسے دیکھا۔

"تو کیا وہ ابھی سے اس ذمہ داری سے انکار کر رہی ہے؟ تو پہلے منع کیوں نہیں کیا؟ کیا اسے بھی محض شادی سے غرض تھی؟" کچھ دیر پہلے کے لطیف جذبات بھک سے اڑ کے فضا میں تحلیل ہو گئے۔

"میرا مطلب ہے۔" وہ عبداللہ کو ہی دیکھ رہی

تھی۔ اس نے رافع کا بدلا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔

''کوئی کیسے اتنے چھوٹے بچے کو خود سے دور کر سکتا ہے یا ماں سے الگ کر سکتا ہے؟'' اب اس نے سر اٹھا کے رافع کو دیکھا۔

''طلاق سے پہلے دو مہینے عبداللہ مہوش کے ساتھ ہی تھا۔ اسے میرے پاس چھوڑتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ میں نے بہت کوشش کی مگر تمہاری اولاد سے مجھے نہ محبت محسوس ہوتی ہے نہ کوئی اٹیچمنٹ۔'' اس کا لہجہ تلخ تھا۔

بریرہ کی آنکھوں میں حیرانی اتر آئی۔ اس نے بے اختیار عبداللہ کو دیکھا۔ کون اس معصوم کے بارے میں ایسا کہہ سکتا ہے جب کہ وہ تو ماں تھی، اتنی شقی القلب ماں؟ اس نے بے اختیار عبداللہ کے گال کو چھوا۔

''اتنے پیارے بچے سے کون محبت نہیں کرے گا بھلا!''

اسے دیکھتے ہوئے رافع کے اندر کچھ دیر پہلے ٹھہرا تاثر زائل ہوا۔ بریرہ نے نظر اٹھائی۔ رافع اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ کئی پل دل تھامے سے آگے بڑھ گئے۔ عبداللہ کو صرف شانے پر سکون تھا اس نے پھر چھل شروع کر دی۔

دونوں نے ایک ساتھ جھولا ہلایا مگر عبداللہ کو ہر ہی آنا تھا۔ ایک بار پھر رافع اسے شانے پر تھپکتے ئے ٹہل رہا تھا۔

''تم بیٹھ جاؤ۔'' وہ اب تک وہیں جمی تھی۔ فع نے کہا اور وہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔

جانے کتنی دیر بعد اسے احساس ہوا تو وہ پلنگ ٹی تھی اور رافع اس کے سر کے نیچے تکیہ رکھ رہا تھا۔ نے اٹھنے کی کوشش کی۔

''ٹھیک سے سو جاؤ۔'' رافع نے اس کے بازو اتھ رکھ کے اٹھنے سے روکا۔ بیٹھے بیٹھے کب اس کی ھ لگی اور بستر پر لڑھکی یا خود ہی آڑی ترچھی لیٹ ، اسے خبر نہیں تھی۔ اب بھی آنکھیں بمشکل کھلی ں۔ رافع نے اس کے اوپر ہلکا سا لحاف ڈالا اور

اس نے لحاف کا کونہ پکڑ کے پھر آنکھ بند کر لی۔

☆☆☆

عبداللہ نے تقریباً ساری رات ہی اسے جگایا تھا۔ جب وہ جھولے میں ڈالنے کے بڑی دیر بعد بھی سویا رہا تو اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ اس کے پاس سے ہٹا تو پلنگ پر بریرہ بیٹھے بیٹھے ہی ایک طرف لڑھک کر سو رہی تھی۔ اس کے پیر اسی انداز میں مڑے ہوئے تھے جیسے وہ بیٹھی تھی۔ وہ کتنی دیر اس کے سرہانے کھڑا سوچتا رہا اسے جگائے یا نہیں۔ آخر اس نے اس کے پیر سیدھے کیے اور سر اٹھا کے نیچے تکیہ رکھا۔ بریرہ نے ذرا سی آنکھیں کھول کے اسے دیکھا تھا۔ پل بھر کو اسے لگا وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھے گی لیکن وہ لحاف پکڑ کے پھر سو گئی۔

تھکا تو وہ سب سے زیادہ تھا۔ اس نے بھی بازو والا تکیہ درست کیا اور سر رکھنے کے چند منٹ بعد ہی سو گیا تھا۔

بریرہ کی آنکھ پہلے کھلی تھی، وہ بھی عبداللہ کی آواز پر۔ اس نے نیند میں ڈوبے رافع کو دیکھا اور پھر احتیاط مگر تیزی سے اٹھ کے جھولے کے پاس آئی۔ عبداللہ کی آنکھیں چوپٹ کھلی تھیں اور وہ کھیل رہا تھا۔ بریرہ نے پلٹ کے دیکھا۔

''پتا نہیں کب سوئے ہوں گے۔''

اس نے عبداللہ کو اٹھایا اور بنا آواز پیدا کیے دروازہ بند کر کے باہر نکل گئی۔ گھر میں سناٹا تھا۔ صوفے پر بھائی سو رہے تھے مگر بھابھی وہاں نہیں تھیں۔ باورچی خانے سے آوازیں آئیں تو وہ ادھر ہی آ گئی۔

اندر بھابھی اور ان کی چھوٹی بیٹی تھی۔

''ارے یہ اٹھ گیا! اسے دے دو ہانی سنبھال لے گی، تم کچھ دیر سو جاؤ۔'' اسے دیکھ کر بھابھی نے مشورہ دیا۔

''جاگ گئی ہوں تو اب دوبارہ نیند نہیں آئے گی۔'' وہ کیا کہتی کہ نیند پوری کر چکی ہے۔

انھوں نے اپنے لیے چائے نکالی اور اسے بھی

digest library.com

دی۔

"ہم چائے پی لیں تب تک اسے باہر لے جاؤ پھر اسے بھی ناشتہ دیتے ہیں۔" انھوں عبداللہ کو بنی کے ساتھ باہر بھیج دیا۔

چائے کے دوران وہ بنا واعظ بنے، ایک بڑی بہن کی طرح بچوں کے ساتھ اپنا تجربہ سناتی رہیں۔ ان کا مقصد اسے ذمہ داری اور کام سمجھانا ہی تھا مگر ان کا انداز ایسا تھا کہ اس پر بوجھ اور گھبراہٹ سوار ہوئی نہ برا لگا کہ ایک دن بھی صبر نہیں کرسکتا کوئی۔ جیسا گود میں عبداللہ کو دیتے ہوئے پروین اور دوسروں کے جملے پر محسوس ہوا تھا۔

آج باقی سب کی واپسی تھی اور پروین ان کے ساتھ جائیں یا نہیں یہ بحث چل رہی تھی۔

"امی، کچھ دن تک رکیں۔ عبداللہ کو بریرہ کے ساتھ ایڈجسٹ ہونے دیں پھر چلی جایئے گا۔" ان سب کی ہاں ہاں نہ نہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ رہی تھی، آخر رافع نے فیصلہ سنا دیا۔

"ٹھیک ہے۔"

بازو میں ہی گھر تھا لہٰذا وہ سب بھی جانے سے پہلے ملنے آئے تھے۔

"منہ دکھائی میں کیا ملا؟" نبیلہ کی آواز اتنی تھی کہ جو دور اور الگ بیٹھے تھے انھوں نے بھی سن لیا۔ وہ لاجواب سی ان سنی کر گئی۔ رافع نے اسے دیکھا اور افسوس نے گھیرا۔ اسے خیال بھی نہیں آیا تھا نہ کسی نے یاد دلایا تھا۔

"کل عبداللہ میں ہی سب اتنے پریشان تھے کہ بس۔ رافع تو سب سے زیادہ! وہ ہی اسے اسپتال لے گیا تھا پھر رات بھی عبداللہ نے جگایا، ایسے میں وہ بھول ہی گیا ہوگا دینا۔" بھابھی نے ایک بار پھر معاملہ سنبھالنا چاہا مگر یہ ایک اور معاملہ بن گیا۔

"جی۔ ایسا ہی ہے۔" نازیہ بھی مسکرائیں۔

"ملی تو ہے سب سے یونیک منہ دکھائی۔" فری نے نبیلہ کے کان میں گھس کر کہا تھا جو اس نے بھی سنا۔ وہ دونوں منہ پر ہاتھ رکھ کے ہنس رہی تھیں۔

"یہ کون سا اتنا اہم ایشو ہے۔" رافع کو یاد تھا مہوش نے اسے تین آپشن دیے تھے رونمائی کے لیے اور اس نے بڑے شوق سے ان ہی میں سے ایک خریدا تھا جو اسے پسند بھی آیا تھا۔ اس نے دیکھا تھا وہ بڑے ناز سے سب کو پس منظر کی کہانی کے ساتھ دکھا رہی تھی اور یہ رسم ہی اب اس کے لیے فضول تھی۔

"مگر بریرہ کے لیے تو نہیں!" اس نے پھر اسے دیکھا جو چپ بیٹھی تھی۔

رات تک سارا گھر خالی ہوگیا کہ اگلے دن چھٹی نہیں تھی۔ سب ویک اینڈ پر آئے تھے۔

اگلے دن اس کی چھٹی نہیں تھی۔ عبداللہ کی وجہ سے پہلے ہی اس کی اتنی چھٹیاں ہو چکی تھی کہ وہ اب ناگزیر ہو تب ہی چھٹی کرسکتا تھا۔

عبداللہ اسی کے کمرے میں سوتا تھا۔ کل تو اس کی طبیعت اور رونے کی وجہ سے وہ ساری رات جھولے میں رہا تھا ورنہ وہ اسے رات بھر جھولے میں نہیں رکھتا تھا۔

"اسے بستر پر ڈال دو۔" پروین نے اسے تھپک کے سلا دیا تھا۔

رافع ہال میں کامل کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا جو کچھ دیر پہلے آیا تھا۔ وہ خود ہی پروین کے ساتھ اس کمرے میں بکھرا سامان سمیٹ رہی تھی۔ اسے ہر وقت چیزیں جگہ پر رکھنے اور صفائی کرنے کی عادت جو تھی۔

وہ عبداللہ کو لے کر خواب گاہ میں آئی اور اسے پلنگ کے درمیان لٹا دیا۔ کل کے مقابلے وہ آج شانت تھا۔ سارا دن رافع سب کو ٹوکتا رہا تھا کہ اسے یہ نہ کھلائیں وہ نہ کھلائیں۔

اسے کامل اور رافع کے بیچ بیٹھنا بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا اس لیے وہیں عبداللہ کے بازو میں پلنگ سے پشت لگا کے بیٹھ گئی۔

کل رات اپنے سو جانے پر اس نے کچھ کہا تھا

نہ رافع نے۔ اب بھی وہ قصداً آنے والے لمحات سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے عبداللہ پر نظریں جمائیں۔ وہ بالکل باپ کا ہم شکل تھا۔ رنگ بھی اسی کی طرح گندمی تھا۔ مناسب صحت والا وہ پیارا بچہ تھا۔ اس کی وجہ سے دوسروں کی زندگیاں کیسے بدل رہی ہے، اس امر سے بے خبر وہ کھیلتا مسکراتا رہتا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا پروین اسے سنبھالتے ہوئے تھک جاتی تھیں۔ رافع کی دونوں بہنیں دور سے اور لفظوں سے ہی سارا پیار لٹاتی رہی تھیں۔ اسے پروین اور بھابھی ہی سنبھال رہی تھیں یا پھر بچوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔

رافع دھیرے سے دروازہ کھول کے دبے پاؤں اندر آیا اور اسے دیکھتے ہی بے ساختہ اس کی زبان سے پھسلا کہ اس کا اندازہ تھا اتنی دیر ہوگئی ہے کہ وہ سوچکی ہوگی۔

"تم سوئیں نہیں؟"

"اوہ تو یہ چاہتے تھے میں سوجاؤں اس لیے ہال میں بیٹھے تھے۔" اس نے اپنی مرضی کا مطلب نکال لیا۔

"بس سو ہی رہی تھی۔" جھٹ تکیہ سیدھا کیا، اس کی طرف پشت کی اور لیٹ گئی۔

رافع کا دل کیا سر پیٹ لے۔ کچھ دیر بعد وہ دوسری طرف لیٹ گیا تھا۔

☆☆☆☆

وہ دفتر جانے سے پہلے اسے عبداللہ کے کھانے کا وقت، کھانا، دوائیں، اس کے کپڑوں، کھلونے اور ڈائپر رکھنے کی جگہ سمجھا اور بتا چکا تھا۔

"کچھ نہ سمجھے یا کوئی چیز نہ ملے تو امی سے پوچھ لینا یا مجھے کال کرلینا۔" اسے یقین تھا اس کی ضرورت نہیں پڑے گی پھر بھی اس نے سر ہلایا۔ پروین اپنے کمرے میں ہی تھیں۔ ناشتہ بھی اس نے ہی بنایا تھا۔ انہیں نازیہ شازیہ سمجھا کر گئی تھیں کہ پہلی بہو کے ناز نخرے اٹھا کے دیکھ لیے ہیں، کوئی قدر نہیں کرتا اس لیے اب سب بہو کو کرنے دیں۔ اس کا گھر، اس کا بچہ، وہ جانے وہ سنبھالے۔ آپ آرام کریں۔ اتنے دنوں بعد اب آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ جب کہ مہوش کے وقت یہ ہی خیال الٹا تھا کہ امی یہ آپ کا گھر آپ کا بیٹا ہے، اسے یہ بھولنے مت دیجیے۔

عبداللہ اس کی گود میں تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے دروازے تک آئی۔ باہر نکلنے سے پہلے وہ پلٹا اور عبداللہ کے گال پر پیار کیا۔

"سوری! تمہیں پہلے دن ہی اتنی ذمہ داریاں اور کام ہیں۔"

اس کا دل کیا کہے جب میں آئی ہی اس مقصد کے لیے ہوں تو سوری کیسی، لیکن اسے رافع کا متین ملائم انداز ہر بار سچا محسوس ہوا تھا اور اپنا اس طرح اظہار کرنا برا۔

"آپ بار بار سوری نہ کریں۔ آپ نے ہی کہا تھا گھر کو مالکن کی ضرورت ہے تو یہ سب اور کون کرے گا۔"

وہ کچھ دیر رک کے اسے دیکھتا رہا پھر عبداللہ کی پیٹھ پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"تھینک یو۔" کل سے اب تک دوسروں کی باتیں اور حرکتیں جو دل میں جاگزیں ہوئی تھیں یکا یک وہاں سے غائب ہوگئیں۔ جو اہم تھا اسے احساس تھا اور یہ ہی بات معنی رکھتی تھی۔ وہ مسکرائی۔

"اللہ حافظ۔" وہ باہر نکل گیا۔

وہ بھی دروازے سے باہر آئی۔ وہ کار نہیں لے جاتا تھا۔ اس نے پھاٹک بند کیا اور اندر جانے کے بجائے دوسرے حصے کی طرف دیکھا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی اس وقت نانی ہی گھر میں ہوں گی۔ اس کا دل کیا ادھر جائے لیکن وہ اندر آ گئی۔

گھر کے کام کے لیے ملازمہ آتی تھی۔ پروین ہی اس سے کام کروا رہی تھیں۔ اس نے ان سے پوچھ کر دوپہر کا کھانا بنایا اور پھر پروین سے اجازت لے کر گھر آئی۔ نانی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔

"تم کیوں آگئیں میرا مطلب ہے پروین سے پوچھا؟"

digest.library.com

"ان سے اجازت لے کر آئی ہوں۔ کھانا بنا ہے؟ امی کو تو وقت نہیں ہوگا۔" وہ کہتی خود ہی باورچی خانے میں آئی۔ مٹر پلاؤ بنا ہوا تھا۔ ظاہر ہے مہناز کے لیے روٹی سبزی سے آسان پلاؤ تھا۔

حفصہ اور عندلیب ان کا ہاتھ ہی مشکل سے بٹاتی تھیں۔ ویسے شادی سے پہلے انھیں عادت ڈالنے کی کوشش میں مہناز نے رات کا کھانا ان کے ذمہ لگا دیا تھا جو اس کے واپس آنے کے بعد پھر اس کے سر آ گیا تھا بلکہ اسی نے لے لیا تھا۔

نانی کی ہدایتیں اور سبق شروع ہوئے تو وہ عبداللہ کا بہانہ بنا کر واپس آ گئی جو نہا دھو کر سو گیا تھا۔

اس نے پروین کے ساتھ کھانا کھایا۔ برتن اٹھا کے میز صاف کر کے وہ کمرے میں آئی ہی تھی کہ رافع کا فون آ گیا۔ اس نے عبداللہ کا پوچھا، کھانا کھایا، کیا پکایا تھا، عبداللہ تنگ تو نہیں کر رہا جیسے سوال کے بعد وہ شام چھ بجے تک آ جائے گا، کہہ کر فون رکھ دیا۔

پروین دوپہر میں سو گئی تھیں۔ عصر کے بعد وہ روز ہی عبداللہ کو لے کر نانی کی طرف جاتی تھیں۔ یہ ہی سوچ کر اس نے عبداللہ کو تیار کر دیا تھا۔ اس نے رات کے کھانے کا پوچھا اور وہ اسے کیا اور کیسے بنانا ہے بتا کر پوتے کو لیے بازو میں چلی گئیں۔

باورچی خانے میں کام کرتے ہوئے اسے لگا مانو وہ برسوں سے یہیں تھی اور یہ ہی سب کر رہی تھی۔

وہ رونا نہیں چاہتی تھی لیکن اسے اپنا آپ بہت تنہا لگ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ میں مگن رہنے والی لڑکی تھی مگر دنیا سے کٹی نہیں تھی لیکن اب، رویوں نے اسے اپنے اکیلے پن کا احساس کرایا تھا۔ خاص طور پر مہناز کا رویہ۔

وہ ماں کے بہت قریب نہیں تھی۔ ان کی اپنی مصروف زندگی اور چار بچوں کی ذمہ داریاں تھیں لیکن اسے یقین تھا کہ وہ اس سے پیار کرتی ہیں اور یہ یقین ہی کافی تھا مگر آج انھوں نے نہ اسے فون کیا تھا نہ آ کر اکیلے میں کوئی تسلی دی، نہ اپنی ممتا بھری نظروں سے دیکھا تھا کہ کیسا گزرا اس کا پہلا دن۔ اپنے لیے کھڑے ہونا، فیصلہ کرنا ایسا سنگین گناہ ہو گیا تھا کہ انھوں نے اس کی پروا ہی چھوڑ دی تھی۔

مغرب تک اس نے کھانا بھی بنا لیا۔ رافع آیا تو اس کے ساتھ ہی پروین بھی آ گئیں۔ رافع کو صاف ستھرا عبداللہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی اور تشکر بھری نگاہ اس پر ٹھہر گئی جو اس کی جانب متوجہ نہیں تھی۔

اس کے ہاتھوں میں مہندی تھی اور حلیہ عام سا تھا۔ نا چاہتے ہوئے بھی اسے مہوش یاد آ ہی جاتی تھی جو مہینہ بھر تک 'نئی دلہن' ہی نظر آتی تھی۔ اس کے اندر اس کی یاد سے کوئی ہوک نہیں اٹھتی تھی، کوئی پچھتاوا کروٹ نہیں لیتا تھا بلکہ اسے وہ سب کچھ بے معنی لگتا تھا کہ ان کے بنا وہ اب زیادہ سکون محسوس کر رہا تھا۔ خوش تھا اور کسی سجاوٹ بناوٹ کے بنا بھی بریرہ اسے بھلی ہی لگ رہی تھی۔ تب ہی ایک سرگوشی پر وہ ٹھٹھک گیا۔

"کیا وہ بھی مطمئن پرسکون اور خوش ہے؟"

"آپ چائے لیں گے؟" اس کے پیچھے کمرے میں آ کر بریرہ نے پوچھا۔

"پلیز!" کل تک وہ خود ہی اپنے لیے چائے بناتا تھا اس وقت بریرہ کا سوال، بڑے دنوں بعد جیسے عیاشی کا موقع تھا۔

وہ لباس تبدیل کر کے مغرب کی نماز پڑھ رہا تھا تب وہ چائے لیے اندر آئی تھی۔ کچھ دیر رک کے وہ واپس چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آیا۔ وہ جو عبداللہ کے پاس بیٹھی تھی، باورچی خانے میں چلی گئی۔ چائے لے کر آئی تو پروین بھی وہاں موجود تھیں۔ وہ صوفے پر رافع کے پاس بیٹھی تھیں۔ اسے کپ تھما کے وہ ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ عبداللہ کھلونوں کے ساتھ قالین پر بیٹھا تھا۔

پروین بیٹے، بیٹیوں کے بخیر پہنچنے کی خبر دے رہی تھیں۔ وہ دونوں ان کے بارے میں ہی باتیں کرتے رہے۔ پروین کا فون بجا تو وہ اٹھ کر اندر چلی گئیں۔

"تم دن بھر بور تو نہیں ہوئیں؟" رافع کا دل کر

رہا تھا اٹھ کے اس کے پاس جائے یا اسے اپنے صوفے پر بلائے لیکن اس نے وہیں سے پوچھا۔

"بور تو نہیں لیکن کام ہی نہیں کچھ۔ گھر میں کام کرتے ہوئے وقت گزر جاتا تھا۔ عبداللہ بھی بہت دیر سوتا رہا ہے۔" اس نے سادہ انداز میں کہا۔ رافع کے دل میں 'وقت گزر جاتا تھا' اٹک گیا۔ تو کیا یہاں بھی اسے محض وقت گزارنا ہے؟

"ایسا ہے تو تم جو کام وہاں کرتی تھیں یہاں بھی کرو۔"

"یہاں ماسی ہے۔" ابھی دو دن بھی پورے نہیں ہوئے تھے اور ان کی باتیں۔ رافع کو عجیب سے احساس نے گھیرا اور وہ اس کے صوفے پر آبیٹھا۔ بریرہ کے چہرے پر حیرت پھیلی لیکن نہ اس نے خود کو سمیٹا نہ کوئی ناگوار تاثر ابھرا تھا۔

"صبح تم نے خود کو مالکن کہا تھا، تمہیں ماسی نہیں چاہیے تو چھٹی کر دو اور۔" اس نے ہاتھ پکڑ کے بریرہ کی ہتھیلی کھولی۔

"اس کے علاوہ کچھ نہیں جو تمہیں دلہن بنائے، باقی آرائش تمہاری پسند اور مرضی لیکن تم چہرے کا ٹینشن کم کر کے مسکرا تو سکتی ہو۔" بریرہ پہلے حیرت کے جھٹکے سے سنبھل گئی تھی مگر یہ شدید تھا۔ اس نے دوسرا ہاتھ اپنے گال پر رکھا۔

"میں۔ ٹینشن میں تو نہیں۔" اسے خود احساس نہیں تھا کہ اس کے ذہن پر سب کی باتیں سوار تھیں۔ وہ مسلسل سوچ رہی تھی کہ اس سے غلطی نہ ہو۔ سب کچھ ٹھیک رکھنے کی کوشش اور اپنوں کے رویوں کی اداسی ایک تناؤ، الجھن اور اداسی کا ملا جلا تاثر بنی چہرے پر بکھری تھی جو رافع کو محسوس ہو رہا تھا۔

"تو مسکراؤ تاکہ اس کے علاوہ بھی کوئی ثبوت ہو۔" اس نے اس کی ہتھیلی پر دباؤ ڈالا۔ وہ مسکرا دی۔ رافع بھی مسکرا رہا تھا۔ تب ہی عبداللہ آواز دے کر انھیں متوجہ کرنے لگا۔

"کیا چاہیے میرے بیٹے کو؟" وہ اٹھ کے اس کے پاس نیچے بیٹھ گیا۔

اس رات بھی کھانے کے بعد کال آ گیا۔ اسے نصاب کا کچھ سمجھنا ہوتا تھا۔ وہ کتاب لے کر آتا تھا اور رافع لیپ ٹاپ کھول لیتا تھا۔ وہ کچھ دیر ان دونوں کے ساتھ بیٹھی رہی پھر پروین نے اسے بلا لیا۔ وہ اسے عبداللہ کو گود میں کیسے سلایا جائے کا 'ڈیمو' دے رہی تھیں یعنی کل سے عبداللہ کو اسے ہی سلانا تھا۔

رافع کمرے میں آیا تو آج عبداللہ پلنگ کے بیچ سو رہا تھا اور اس طرف بریرہ۔

☆☆☆

اگلے دن اس کا جوڑا تو نئی دلہن والا تھا ہی اس نے کان میں بھی اس کی مناسبت سے چاند بالیاں پہنی تھیں۔ دوسری شادی، بچہ، سمجھوتہ، ماں، ذمہ داری جیسے لفظ اس نے اتنی بار بلکہ مسلسل سنے تھے کہ لاشعوری طور پر اس نے خود کو نئی دلہن کے طور پر دیکھا نہ سوچا۔ اس نے غیر محسوس طریقے سے مان لیا تھا کہ یہ سارے اہتمام اب اس کے لیے نہیں، اب وہ یہ سب کرتے اچھی نہیں لگے گی، مذاق بن جائے گی۔ اس نے نہ سرخ شوخ جوڑا پہنا جو اس کے پاس موجود تھا نہ بہت بھاری زیور۔ میک اپ بھی ہلکا کیا تھا۔ وہ خود ہی ہر معاملے میں 'دوسری' سوچ رہی تھی۔ اس کے بعد جو خیال ذہن میں بیٹھا تھا وہ یہ کہ رافع بیٹے کی خاطر سب کر رہا ہے سو اسے کیا غرض وہ کیا پہن رہی ہے، کیسی لگ رہی ہے۔ اس کی فکر یہ ہوگی کہ وہ عبداللہ کے ساتھ کیسا رویہ رکھتی ہے لیکن اب اسی نے احساس دلایا تھا کہ اسے 'غرض' تھی۔

اسے دیکھ کر رافع کھل کے مسکرایا تھا۔ پورا ہفتہ اسی معمول سے گزر گیا۔ وہ عبداللہ کو لے کر ادھر گئی مگر اس میں کسی کو دلچسپی نہیں تھی سوائے کال کے۔ اب وہ اس کی زندگی کا حصہ تھا مگر ان کا برتاؤ اب بھی بڑوں کے بچے والا تھا۔ عبداللہ نے رو دھو کے جو پہلا ٹریلر دکھایا تھا شکر کہ وہ گمراہ کن تھا، فلم ویسی نہیں تھی۔ اسے اس پر بڑا ترس آتا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے سوچتی کہ سمجھ آنے کے بعد جب علم ہوگا کہ اس ننھی عمر

میں ماں چھوڑ گئی تھی، تو اس پر کیا بیتے گی اور وہ تصور ہی اسے دکھی اور بے چین کر دیتا تھا۔

پروین کے انداز دوستانہ نہیں 'ساسانہ' ہی تھے۔ اس نے اپنے ہی گھر والوں کے وہ رویے دیکھے تھے کہ پروین تو اسے بڑی نیک لگتی تھیں۔

رات میں وہ کامل کے ساتھ ہوتا یا دفتر کا کوئی کام لے کے بیٹھا ہوتا اور وہ عبداللہ کے ساتھ ہی سو جاتی۔

"بریرہ!" ملگجے اندھیرے میں رافع کی آواز ابھری۔

"اگر تمہیں نیند نہیں آرہی ہے تو مت سوؤ۔"

"سوری۔" وہ بار بار کروٹیں بدل کے اس کی نیند بھی خراب کر رہی تھی۔

"نیند نہیں آرہی یا کوئی اور بات ہے؟" اس نے اس کی طرف رخ کیا۔

"مجھے بھوک لگی ہے۔" وہ منمنائی۔ رافع اٹھ بیٹھا۔

"تم نے کھانا نہیں کھایا؟" وہ میز پر ساتھ تھے لیکن وہ زیادہ وقت ضروری کال میں مصروف رہا تھا۔

"مجھے فش نہیں پسند۔"

"تو کچھ اور کھالیا ہوتا۔" وہ چپ رہی۔

"آؤ" وہ بستر سے اترا اور اپنی جگہ تکیہ رکھا۔

"کہاں؟" اسے لگا وہ اتنی رات میں کھانا لینے جائے گا۔

"باہر۔ ادھر بھی تکیہ رکھ دو۔"

ان حفاظتی دیواروں کے علاوہ اس نے خواب گاہ کا دروازہ بھی کھلا رکھا۔

"پہلے ایسی سچویشن میں کیا کرتی تھیں؟" ہال میں آکر اس نے پوچھا۔

"انسٹنٹ نوڈلز۔" اس نے یہاں بھی وہی ڈھونڈے تھے مگر ناکام رہی تھی۔ رافع کو بھی علم تھا اس کے گھر میں نوڈلز نہیں ہیں۔ وہ فون لگانے لگا۔ بریرہ کو لگا کسی چوبیس گھنٹے کھلی رہنے والی فارمیسی کو کال کر رہا ہوگا۔

"ہیلو۔ سوری یار اس وقت ڈسٹرب کیا۔ نوڈلز چاہیے جو تمہارے کچن میں ہوں گے۔"

بریرہ جان گئی وہ کامل سے بات کر رہا ہے۔

"کہاں رکھے ہوں گے وہ۔ اوہ گڈ!" اس نے فون رکھ دیا۔

"کامل لا رہا ہے۔" وہ اسے کہہ کے دروازہ کھول کے باہر نکلا۔ وہ بھی اس کے پیچھے آئی۔ کچھ دیر بعد بکھرے بال اور نیند کے نشے میں جھومتا کامل، ہاتھ میں چار پانچ پیکٹ لیے حاضر تھا۔

digest library.com

"بہار کے لیے لایا ہوں۔" وہ بریرہ کو تھما رہا تھا مگر رافع نے لے لیے۔

"نانی نے بلی سمجھ کے بڑی زور سے چپل ماری ہے۔" اس نے جھک کے پنڈلی سہلائی اور پلٹ گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ہنس دیے۔

اندر آکر بریرہ نے دروازہ بند کیا۔

"تم بیٹھو، میں بناتا ہوں۔" وہ چلا گیا اور اس کا بھوک سے اتنا برا حال تھا کہ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

صبح اس نے سنا تھا پروین، رافع سے شازیہ کی طرف جانے کی بات کر رہی تھیں۔

"آنٹی چلی جائیں گی تو بس میں اور عبداللہ ہوں گے دن بھر۔ وہ تھیں تو نانی کو بھی کمپنی دیتی تھیں۔" وہ اب عبداللہ کو اس کے حوالے کر کے شام کے علاوہ بھی نانی کے پاس چلی جاتی تھیں۔ وہ ان ہی سوچوں میں گم تھی کہ رافع بھاپ اڑاتا پیالہ لیے چلا آیا۔

"تھینک یو۔" اس نے گرم پیالے کے نیچے پلیٹ رکھی تھی۔

"اب مجھے چائے کی طلب ہو رہی ہے، تم کھاؤ، تب تک میں چائے بنا لیتا ہوں۔" وہ پھر چلا گیا۔ اگلا دن سنیچر تھا اس لیے اسے بھی نیند کی پروا نہیں تھی۔

وہ چائے کے دو کپ اور پانی کا گلاس ٹرے میں لیے آیا تب تک وہ نوڈلز ختم کر چکی تھی۔ خود ہی

گھر سنبھالنا پڑے تو عورت ہو یا مرد سلیقہ آ ہی جاتا ہے۔"

"آئندہ کھانا بناتے وقت ہی اپنا انتظام بھی کر لیا کرو۔" وہ اپنا کپ لیے فاصلے پر بیٹھ گیا۔

"ویسے فش کے ساتھ ساتھ مزید کیا نہیں پسند؟"

"

"بس سی فوڈ۔"

"امی جانے کا کہہ رہی ہیں، ان کے بعد تمہیں پریشانی تو نہیں ہوگی؟" کچھ دیر بعد رافع نے پوچھا۔

"پریشانی تو نہیں لیکن عبداللہ انھیں مس کرے گا۔"

"ہمم۔ عبداللہ زیادہ ان ہی کے ساتھ رہا ہے۔ ویسے وہ اب تم سے بھی مانوس ہو رہا ہے۔"

وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

"تمہیں برا نہ لگے تو کچھ پوچھوں؟" چائے کا خالی کپ میز پر دھری ٹرے میں رکھنے کے بعد اس نے بریرہ کو دیکھا۔

"جی۔" اس کی دھڑکنوں کی رفتار بڑھ گئی۔

بریرہ نے کپ کے کنارے پر انگلی پھیری۔

"مجھے بھی نہیں پتا۔" اس کے اندر اتنا کچھ تھا لیکن کوئی ایسا سامع ملا ہی نہیں تھا جس سے وہ کہتی یا کوئی پوچھتا۔

"عام طور پر لڑکیاں اتنی جلدی اور گھر والوں کے بغیر اتنا بڑا فیصلہ نہیں کرتیں۔ تمہیں ڈر نہیں لگا کہ گھر والے کیا کہیں گے یا یقین تھا کہ وہ تمہارا ساتھ دیں گے؟"

"آپ کو یقین نہیں آئے گا مگر مجھے لوگ اور گھر والوں کا خیال آیا ہی نہیں یا یہ کہ مجھے کسی سے مشورہ کرنا چاہیے۔ شادی کے لیے ہاں کہتے ہوئے بھی میں نے امی سے کہا تھا آپ کو پسند ہیں، آپ کی مرضی ہے تو ہاں کہہ دیں۔" وہ خود بھی ان باتوں پر اب غور کر رہی تھی کہ اب کسی نے اس سے پوچھا تھا۔

"پھر؟"

"اس وقت کے دو ہی احساس مجھے یاد ہیں۔

پہلا تو یہ کہ بہت انسلٹ فیل ہوئی تھی اور پھر نوید کے انداز، اس کے ایٹیٹیوڈ پر شدید غصہ آیا تھا۔ اس کی ٹائمنگ، لہجہ اور توقع کہ اب میں کچھ کر ہی نہیں سکتی، ان تینوں نے مجھ سے وہ فیصلہ سیکنڈز میں کروا لیا تھا۔ اس سے پہلے تو مجھے بھی علم نہیں تھا کہ میں ایسا کچھ کر سکتی ہوں، خود کو اتنی اہمیت دوں گی، کسی کا مجھے بے وقعت سمجھنا ایسا گراں گزرے گا۔ یہ سب میں نے بھی تب ہی جانا، ہاں لیکن کہیں ذہن میں یہ ضرور تھا کہ ایسا ہی گھر والے بھی سوچیں گے انھیں بھی نوید کی بات بری ہی لگے گی۔ مجھے نوید کی بات سے جتنا بڑا جھٹکا لگا تھا، گھر والوں کے رویے سے بھی ویسا ہی صدمہ پہنچا تھا۔"

"سب کا اتنا پریشر تھا تب بھی خیال نہیں آیا کہ ری کنسیڈر کیا جائے؟"

"نہیں۔ مجھے سب نے اسپیشلی خالہ نے بہت سمجھایا کہ میں اس وقت غصے میں تھی، ٹھنڈے دماغ سے سوچوں گی تو خود ہی غلطی کا احساس ہوگا مگر مجھے ایک پل کو بھی تامل نہیں ہوا کہ کہیں میں نے غلط تو نہیں کیا۔ میں زندگی میں کبھی کسی معاملے میں اتنی کلیئر نہیں تھی جتنی اس بار۔ مجھے معلوم تھا مجھے کیا چاہیے۔ میں کمرے میں کچھ دنیا کے سامنے کچھ، ایسے منافق کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔ قربانی اور کمپرومائز بھی وہیں ہوتے ہیں جہاں باہمی احترام ہو یا کم از کم تعلق میں دونوں فریق ایک سطح پر ہوں۔ ساتھ چلنے والے کا پہلا ہی قدم آپ کے احساس پر ہو تو آگے بڑھنا اپنے ساتھ زیادتی ہے۔" بریرہ نے سر اٹھا کے اسے دیکھا۔

وہ بھی سب کی طرح یہ ہی سمجھتا رہا تھا کہ اس نے دوسری لڑکی کی وجہ سے رشتہ ختم کیا ہے۔ اسے شور شرابے اور ڈرامے کے بنا اس کی ثابت قدمی اچھی لگی تھی۔ پروین اسے سناتی تھیں کہ ادھر کیا چل رہا ہے۔ سب اسے واپس جانے کے لیے راضی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اس کا ایک ہی جواب ہے کہ اس کی طرف سے یہ رشتہ ختم ہے۔ تب

digest library.com

وہ بھی یہ آج کل کی لڑکیاں ! کہا کرتی تھیں ، جب تک اس میں انھیں سیدھی ، کام کاج میں طاق ، خاموش طبع اور حالات کی ماری ، بے بس لڑکی نظر نہیں آئی تھی۔

"جب پہلی بار امی نے تمہارا نام لیا تو مجھے حیرت ہوئی تھی کہ وہ ایسا کیسے سوچ رہی ہیں۔" پریہ نے سوچا کیا اسے بتائے وہ ان کی باتیں سن چکی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"ان کے لیے تمہاری طلاق ہی ریزن تھا کہ انکار نہیں ہوگا اور میں اسی ریزن سے نہیں چاہتا تھا۔ آنسٹلی میں تمہیں نہیں جانتا تھا اور مجھے پہلے ہی مشکل زندگی میں مزید پیچیدگیاں نہیں چاہیے تھیں۔" اسے اچھا لگا کہ اس نے دل دکھانے والا سچ شائستگی سے کہا۔ اس سے کہتے ہوئے اپنی بات بدلی نہیں تھی۔

"پھر کیوں مان گئے؟"

"میرے پاس صرف اپنے بارے میں سوچنے کی لگژری نہیں تھی نہ میں ساری عمر یونہی گزار سکتا تھا۔ پھر عبداللہ کا اس عمر میں ہی کسی کے ساتھ اٹیچڈ ہونا ایزی ہے۔ میں نے سوچا جتنی دیر کروں گا، جتنا سوچوں گا، جتنے آپشن ہوں گے، فیصلہ اتنا مشکل ہوگا اس لیے اگر تمہیں اعتراض نہیں تو کیا برا ہے۔"

اس نے مہوش سے ابتدائی دنوں میں بہت دل نشین ، حسین ، کتابی باتیں کی تھیں۔ وہ سوچ کر جملے بناتا تھا، خوب صورت شاعرانہ سے الفاظ چنتا تھا لیکن ان باتوں میں احساس کم اور اسے خوش کرنے کی شعوری کوشش زیادہ ہوتی تھی۔ شادی کے آغاز کو یادگار بنانے کی سعی ہوتی تھی۔ اسے وہ کرنا بھی بوجھ نہیں بلکہ اچھا لگتا تھا لیکن وہ اب وہی سب نہیں دہرا سکتا تھا کہ ان کے بے معنی اور کھوکھلے ہونے کو اس سے بڑا کوئی شاہد نہ تھا۔ اس لیے اب وہ دل سے، سچی باتیں ہی کر رہا تھا۔

"میں شادی کے دن تک بھی شیور نہیں تھا کہ یہ فیصلہ درست ہے یا نہیں اور ہم انسان ان باتوں میں کبھی شیور ہو بھی نہیں سکتے ہاں امید دعا کر سکتے ہیں جو میں نے بھی کی۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"اور اب مجھے لگ رہا ہے میں نے ٹھیک فیصلہ کیا تھا۔"

"ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا ہے۔" اس نے یاد دلایا۔

"تمہیں ٹھیک نہیں لگتا؟"

"وہ تو مجھے آپ کو میسج کرتے وقت ہی پتا تھا۔" وہ پھر کپ کے کنارے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"کیسے؟"

"آپ نے اپنی ضرورت واضح کرتے ہوئے مجھے بھی اہمیت دی تھی۔" اس نے پھر رافع کو دیکھا۔

"آپ نے صرف اپنا نہیں سوچا میرے احساسات کو بھی قابل قدر جانا تھا۔"

وہ جو سوچ رہا تھا اس کے ہاتھ سے کپ لے کر میز پر رکھے گا اور اس کا ہاتھ تھام کے اسے وہاں سے اٹھائے گا، اسی پل ارادہ بدل دیا۔

"تھینک یو۔" پریہ نے کہا اور وہ مسکرا دیا۔

"ویسے امی چلی گئیں تو روز کے چھوٹے موٹے کام تمہیں کرنا پڑیں گے۔" معمول کا سودا سلف پروین ہی کرتی تھیں۔

"یا پھر پورے ویک کے کئی کام ہمیں ویک اینڈز پر کرنا ہوں گے۔"

ان کا موضوع بدل گیا تھا۔

☆☆☆

جمعہ کو شازیہ کا بیٹا نانی کو لینے آرہا تھا۔ ان کی اسی رات تو اسے کے ساتھ ٹرین سے واپسی کی ٹکٹیں تھیں۔

ہفتہ بھر ان کی تیاریاں چلتی رہیں۔ نانی کے ساتھ وہ بازار کے دو چکر بھی لگا آئی تھیں۔

اسے ابھی تک کسی نے ادھر رہنے یا رکنے نہیں کہا تھا۔ آتے جاتے سب نظر آتے تھے اور تب ہی دعا سلام اور بات ہو جاتی تھی۔ جیسے پروین اب بھی ادھر پابندی سے جاتی تھیں ویسے کامل روز ادھر آتا تھا۔ اب وہ اور عبداللہ بھی ان کی محفل میں شامل ہو جاتے تھے۔ اسی طرح کامل نے بھی عبداللہ کو

اپنے خاندان کا حصہ تسلیم کر لیا تھا۔ اسے خود کو ماموں کہلوانا بھی اچھا لگ رہا تھا۔

رات دیر کی ٹرین تھی۔ پروین نے اسے بہت دعائیں دیں۔ عبداللہ کو بھینچ کے پیار کیا۔ ان کی آنکھیں اسے پیار کرتے ہوئے بھیگ گئی تھیں مگر انہیں جانے کی بہت خوشی بھی تھی۔

رات ڈیڑھ بجے، رافع انہیں چھوڑ کر واپس آیا تو عبداللہ سو گیا تھا۔ وہ جاگ رہی تھی۔

"چائے کافی کچھ بھی چلے گا پلیز۔" اس نے فون اور چابی رکھتے ہوئے بریرہ سے کہا جو اپنے کپڑے الماری میں رکھ رہی تھی۔

"اتنی گرمی میں بھی انہیں چائے چاہیے ہوتی ہے۔" وہ الماری بند کر کے باورچی خانے میں جب کہ وہ کپڑے لیے نہانے چلا گیا۔

وہ تروتازہ ہال میں آیا اور دو منٹ بعد وہ کافی مگ لیے حاضر تھی۔

"مجھے تو عادت ہے لیکن کیا تمہاری نیند ڈسٹرب نہیں ہوگی؟"

"اب غور کروں گی۔" وہ مسکرائی۔ وہ چائے کی شوقین نہیں تھی مگر رافع کو کسی بھی وقت چائے کی طلب ہوتی تھی۔ کئی بار وہ خود ہی بنا لیتا تھا۔

"عبداللہ نے زیادہ تنگ تو نہیں کیا؟" اسے گویا پتا چل گیا تھا کہ دادی چھوڑ کے جا رہی ہے اس لیے ان کی گود سے اترنے کے بعد رونے لگا تھا۔ ان کے جانے تک وہ روہی رہا تھا۔

"کامل اسے باہر لے گیا تھا۔ واپس آیا تو بہل چکا تھا۔"

"پہلے تو عبداللہ اتنا روتا تھا کہ میں سوچتا تھا کیسے سنبھالوں گا اسے۔ تب وہ نیا نیا ماں سے دور ہوا تھا۔ نہ مجھ سے سنبھلتا تھا نہ امی سے نہ نازیہ باجی سے۔ وہ ان دنوں عبداللہ کی وجہ سے ہمارے ساتھ تھیں۔"

"آپ کو ناگوار نہ گزرے تو کچھ پوچھوں؟" اس بار بریرہ نے پوچھا۔ رافع نے سر ہلا کے اجازت دی۔

"آپ دونوں نے عبداللہ کی وجہ سے بھی اپنے ڈفرنسز مٹانے کا نہیں سوچا؟" رافع کئی لمحے خاموش رہا۔

"اب یہ جملہ بڑا آئیڈیلسٹک لگ رہا ہے۔ ڈفرنس دور کرنا۔ ہم میں کیا اختلافی تھا اور کس بات پر ہم سیم پیج پر تھے مجھے یہ بھی نہیں معلوم۔ دونوں فیملیز قدامت پسند نہیں تھیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا ملے، باتیں کیں، انگیجمنٹ کے بعد فون بھی کرتے رہے۔ فنکشن کے ڈریسز، لکس، فوٹو گرافی، ہال ہنی مون ہم نے سب ڈسکس کر کے طے کیا تھا۔ اس کے بعد کا پیریڈ بھی بڑا اچھا گزرا لیکن جب روٹین لائف شروع ہوئی تو جیسے کوئی خواب ٹوٹا۔ ہم دونوں ہی شاید توقع کر رہے تھے کہ میں نے اب تک سب اتنا پرفیکٹ اور جیسا اس نے چاہا ویسا دیا ہے تو آگے جو میں کہوں وہی ہوگا لیکن ایسا کچھ نہیں تھا کیونکہ وہ سب کر کے ہم نے بس ایک دوسرے کو امپریس کرنے کی کوشش کی تھی، سمجھنے یا ایڈجسٹ ہونے کی نہیں۔ ہمیں ہر معاملے میں ایک دوسرے سے اختلاف ہوتا تھا اور کوئی بھی پیچھے ہٹتا تھا نہ چپ ہوتا تھا۔ پھر امی باجیوں اور مہوش کا رشتہ تو مشکل تھا۔ انہیں ایک دوسرے کے ہر عمل میں سازش اور ہر بات میں طنز نظر آتا تھا۔ چپ کوئی نہیں رہتا تھا۔" وہ رک گیا۔

"آپ تب جوائنٹ فیملی تھے؟"

"نہیں۔ میری جاب اسی شہر میں تھی جہاں دونوں باجیاں ہیں۔ نازیہ باجی اور میرا مکان قریب تھا۔"

"اچھا۔"

"ویسے میں جو بھی کہوں وہ میری سائیڈ ہوگی اور میں جانب دار بھی ہو سکتا ہوں۔ ان شارٹ اور سچ یہ ہے کہ شروع کے ڈیڑھ دو ماہ سکون سے گزرے اس کے بعد ہم دونوں بس لڑتے رہے۔ اسی بیچ وہ پریگننٹ ہوگئی۔ پریگننسی ایزی بھی نہیں تھی۔ وہ مزید

digest library.com

نازک مزاج اور چڑچڑی ہوئی تھی۔ اس لڑائی کو اس کی حالت ذرا مہ لگتی۔ میں نے تب بحث، اختلاف، لڑائی سب بند کر دی تھی۔ غصہ ضبط کیا، ایڈجسٹ کیا کہ اس کی کنڈیشن ہی ایسی تھی مگر وہ پھر بھی زیادہ اپنی امی کی طرف رہنے لگی۔ وہ وقت ساتھ گزرتا تو ہم شاید کچھ سمجھ پاتے یا قریب ہوتے لیکن خیر اس کے بعد وہ اپنے مزاج میں مزید پکی ہو گئی، لچک بالکل نہیں رہی تھی اور میں بھی تب اتنا سمجھ دار نہیں تھا۔" وہ مسکرا کے خاموش ہو گیا۔

"یہ تو عبداللہ کو ہاتھوں میں لیتے ہی میرے اندر جیسے کچھ پگھل گیا یا بدل گیا تھا۔ میں اس کی خاطر بہت کچھ کرنے کو تیار تھا لیکن اس کے برعکس مہوش ڈلیوری کے بعد دوسری انتہا پر چلی گئی تھی، وہ بھی بدل گئی۔ سال بھر ہم نے سب اسی طرح گھسیٹا۔ اس کی پہلی سالگرہ بھی ہماری لڑائی کی نذر ہو گئی تھی۔ پھر وہ ایک دن کسی بات پر الجھ کے میکے چلی گئی۔ اس کے بعد ہم نے فون پر ہی بات کی۔ اس نے کہا ہم اس طرح ساتھ نہیں رہ سکتے، ابھی دیر نہیں ہوئی ہمیں الگ ہو جانا چاہیے۔ میں نے عبداللہ کی دہائی دی، گھر والوں نے آپس میں بات کی، کوئی درمیان کا راستہ نکالنا چاہا کیونکہ بچے کے بعد کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ طلاق تک نوبت جائے مگر سب بے سود رہا۔" وہ خاموش ہو گیا۔ بریرہ بھی چپ اسے دیکھ رہی تھی۔

"جب وہ عبداللہ کو میرے پاس چھوڑ گئی اس دن میں نے فیصلہ کیا کہ یہی بہتر ہے۔ وہ اس کے لیے بس میری اولاد تھا۔ پتا نہیں کیا وجہ تھی مگر وہ اس سے اٹیچ ہو ہی نہیں سکی۔ تب عبداللہ کی خاطر ہی مجھے اس رشتے کو کھینچنا یا چلانا منظور نہیں تھا۔ اگر امید ہوتی تو میں اسی کی خاطر مزید کوشش ضرور کرتا تھا۔" اسے پہلی بار رافع کی بیٹے سے محبت کی شدت کا احساس ہوا۔ اس نے وہ شادی اس کے لیے ختم کی تھی اور دوسری بھی اسی کے لیے کی تھی۔

"کچھ تعلق ایسے ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔ کوئی بڑی وجہ، بڑے ایشو، سیریس تنازع نہیں ہوتے، سوچیں تو معاملات سدھارنے کے کئی طریقے بھی نظر آتے ہیں، ایک ساتھ رہنے کا جواز بھی ہوتا ہے مگر کچھ کام نہیں کرتا کہ وہ دو لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے قابل ہی نہیں ہوتے۔" اس نے آگے جھک کر خالی مگ میز پر رکھا۔

"اور اب ہم۔" وہ سیدھا ہوا۔

"چند دنوں میں اتنے عجیب و غریب حالات سے گزر کے یوں آمنے سامنے ہیں۔ یہاں شفٹ ہوتے وقت کس نے سوچا تھا کہ ہاز والا گھر اتنا اہم ہوگا!" اس نے فضا کا بوجھل پن دور کرنا چاہا۔

"مجھے تو اب بھی کبھی کبھی لگتا ہے یہ سب خواب ہے، آنکھ کھلتے ہی سب پہلے سا ہوگا۔" وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف رخ کیے تھے اور بریرہ نے ایک ہاتھ صوفے کی پشت پھیلاتے ہوئے کہا۔

"یہ خواب نہیں۔" رافع نے اس کے پھیلے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

"اور اگر ہے تو ہم سوئے ہی رہیں۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔

بریرہ نے بغور اسے دیکھا۔ اس کا ذہن ایک ہی نہج پر لگا تھا کہ اس نے عبداللہ کے لیے شادی کی ہے اور اب پہلی بار اس نے رافع میں رافع کو دیکھا، باپ کو نہیں۔ اپنے ہاتھ پر دھرا اس کا لمس پہلی بار اس کے اندر ایک نئی سنسنی خیز لہر بن کے دوڑا تھا۔ وہ بھی مسکرائی اور اس کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچ کے کھڑی ہو گئی۔

"بہت دیر ہو گئی ہے۔" اس نے دونوں مگ اٹھائے۔

"انہیں دھو کے رکھ دوں۔" اس نے خوامخواہ اپنے جانے کی صفائی دی اور باورچی خانے میں آ گئی۔ پانچ منٹ لگا کے وہ مگ دھو کے ہال میں آئی تو وہ ٹی وی لگا کے بیٹھا تھا۔

"تم سو جاؤ۔ بہت دنوں سے کچھ دیکھا نہیں، آج کوئی مووی دیکھ لیتا ہوں۔" وہ معروف سا اسکرین پر نیٹ فلکس کی 'مائی لسٹ' اسکرول کر رہا۔

تھا۔ "تمہیں بھی دیکھنی ہے؟" اس نے گردن موڑ کے دیکھا۔

"نہیں۔ آپ دیکھیں، مجھے نیند آرہی ہے۔" وہ خواب گاہ میں آ گئی۔

☆☆☆

وہ دن میں جب کوئی نہیں ہوتا نانی کے لیے ایک چکر ادھر کا لگاتی تھی۔ ان کا گھر بازار سے قریب تھا اور شادیوں کے موسم کی وجہ سے، ادھر چکر لگانے والے بھی گھر آتے ہی تھے۔ اب ان سب کا اس سے ملنا بھی ضروری ہو گیا تھا۔ سب کی نظریں جانچتی تولتی ہوتی تھیں۔ بطور خاص جب عبداللہ اس کے پاس، اس کی گود میں ہوتا، وہ اسے کچھ بولتی یا وہ اس کی طرف لپک کے آتا، لایعنی آواز سے اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا، چڑ جاتا یا رونے لگتا، ان صورتوں میں اس کے اعصاب بھی تن جاتے تھے۔ وہ شعوری کوشش کرتی تھی ان دونوں کا رشتہ اور ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ سوال اٹھانے والا نہ ہو۔ وہ تنہائی میں یا پھر صرف رافع کے سامنے ہی فطری انداز میں رہ پاتی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی اور دیکھ رہا ہو تو اس کی ساری حسیات اور حرکات کوئی غلط تاثر پیدا نہ ہو، اسی کوشش میں ہوتی تھیں اور یہ بڑا تھکانے والا کام بنتا جا رہا تھا۔ پروین بھی فون پر کرید کرید کر عبداللہ کی ایک ایک بات پوچھتیں اور بار بار وہی سب یاد دلاتیں، جو وہ بھولی بھی نہیں تھی۔

رافع کمرے سے نکلا تو وہ بھی عبداللہ کو اٹھا کے اسے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ شکر تھا کہ وہ روز باپ کو جاتے دیکھ کر، جیسے دادی کے جانے پر ادھم مچاتا تھا، ویسا دھمال نہیں کرتا تھا۔

"اگر تم برا نہ مانو تو کچھ کہوں؟" اچانک دروازے سے پہلے ہی اس کی طرف پلٹ کے رافع نے پوچھا۔

"ہمیں ہر دفعہ یہ پوچھنے کے بجائے وہی بولنا اور کرنا چاہیے جو دل کریں کیونکہ ہمیں ایک دوسرے کی بات بری نہیں لگتی ہے۔" اس نے ٹھہر کے بات مکمل کی۔

"ہم۔" وہ گہری نظروں سے دیکھتا معنی خیزی سے مسکرایا۔

"اللہ حافظ بیٹا۔" اس نے معمول کی طرح جھک کے عبداللہ کا گال چوما۔

"مما کو تنگ نہیں کرنا۔" اس کے دوسرے گال پر پیار کر کے وہ سیدھا ہوا۔

بریرہ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ پہلی بار اپنے لیے 'مما' سنا تھا۔ ایک حدت بھرے احساس سے اس کا سینہ بھرنے لگا۔ اس کی بدلی کیفیت چہرے پر بکھری تھی۔ گود میں دھرے عبداللہ کا لمس کچھ نیا محسوس ہونے لگا تھا۔

رافع کا 'سرپرائز' اتنا ہی نہیں تھا۔ اس نے بیٹے کی طرح جھک کے نئی مما کے گال پر بھی بوسہ ثبت کیا۔

"کچھ سیکنڈز پہلے تم نے ہی مجھے سب کی اجازت دی ہے۔" رافع نے اس کا گلابی ہوتا چہرہ دلچسپی سے دیکھا۔

"اللہ حافظ۔" وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ وہیں کھڑی رہی۔ جب پھاٹک بند ہونے کی آواز آئی تو وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے عبداللہ کو دیکھا جو اس کی گود سے اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے بے اختیار اسے چوم کے نیچے چھوڑنے کے بجائے خود سے لپٹا لیا۔

اگلے دن اس نے عبداللہ کو گود میں لینے کی غلطی نہیں کی۔ وہ ہال میں قالین پر بیٹھا تھا اور وہ مصروف بنی اس کے آگے کھلونے رکھنے لگی۔ رافع نے بھی اسے نہیں اٹھایا بلکہ خود ہی جھک کے بیٹے کو پیار کر لیا۔ وہ بھی کھلونا رکھ کے سیدھی ہوئی اور پلٹی، رافع پاس کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ کسی کے کچھ کہے بنا اس پل بڑا واضح تھا کہ وہ کیا سوچ کر کیا کر رہی تھی۔ وہ یوں بوکھلائی جیسے کوئی وہاں اس کے خیالات بلند آواز میں پڑھ رہا ہو۔ مسکراہٹ ضبط کرتے کرتے

digest library.com

آخر وہ ہنس پڑا۔ اس نے سرخ چہرہ جھکا لیا۔

"اللہ حافظ۔ عبداللہ کی مما!" اسے اب کون روک سکتا تھا جب وہ اعلانیہ اجازت دے چکی تھی۔

☆☆☆

مہناز سے پہلے کامل نے اسے بتایا کہ حفصہ کے لیے کچھ لوگ آ رہے ہیں۔ وہ خود ہی رات میں ادھر چلی گئی۔ وہاں اگلے دن کے لیے مہمانوں کی تیاریاں جاری تھیں۔ اس نے مہناز سے پوچھا کون لوگ ہیں۔

"حفصہ کا سینئر ہے۔" انھوں نے مختصر جواب دیا باقی کامل نے بتایا کہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ وہ انتظار ہی کرتی رہی کہ مہناز کل مہمانوں کے وقت رافع کو بلانے کے لیے خود آئیں گی یا فون کریں گی۔ بڑا داماد اور قریب ہی ہونے کی وجہ سے اسے بلایا جانا چاہیے تھا مگر کامل نے ہی اسے بتایا کہ نانی نے خاص طور پر اسے منع کیا تھا کہ تم رافع کو نہ بلا لینا۔ اسے غصہ آیا اور وہ بھی اگلے دن اس وقت گھر میں ہی رہی تاہم کان دروازے اور فون پر لگے تھے کہ کوئی تو اسے آواز دے گا، بلانے آئے گا۔

رات کامل نے ہی فون کیا۔ حفصہ کی ہونے والی دادی ساس کی خاص ہدایت تھی کہ اسے اور رافع کو نہ بلایا جائے کہ ان کے نزدیک اس نیک موقعے پر ان کی موجودگی جوڑے کے لیے برا سایہ تھی۔ وہ بھی جلا بھنا تھا کہ گھر میں اس کی بھی کوئی نہیں سنتا تھا۔

"تو کیا حفصہ عندلیب اس وجہ سے میرے فیصلے کے خلاف تھیں؟ حفصہ اس وقت بھی صرف اپنے بارے میں سوچ رہی تھی؟"

اس کے ذہن میں وہی سب چلتا رہا اور اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ آنسو بہنے لگے ہیں۔ رافع اسے کل ادھر سے آنے کے بعد سے چپ دیکھ رہا تھا پھر کامل سے اس کی باتیں بھی کانوں میں پڑی تھیں۔ اس لیے اسے کھڑکی کے پاس روتے دیکھ کر اسے تعجب نہیں ہوا تھا۔ وہ سامنے آیا تو بریرہ چونکی۔

رافع نے آنسو پونچھے اور وہ ٹھٹکی کہ وہ تو رو رہی ہے۔ رافع نے کچھ نہیں پوچھا اور وہ ضبط کرنے لگی لیکن جب رافع نے سنبھالا تو وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ اس نے دامادوں والے شکوے نہیں کیے تھے مگر بریرہ کو برا لگا تھا۔

☆☆☆

فاریہ کی شادی تھی اور حفصہ کا بھی میاں بیوی راضی والا معاملہ تھا، لہٰذا وہ لوگ شادی کی تاریخ طے کر کے گئے تھے۔ اس نے رو کے دل ہلکا کر لیا تھا تو پھر کسی سے شکایت بھی نہیں کی۔ وہ اب بھی ان سب کو اپنی خوش حال، زندگی کے ثبوت دینے میں لگی تھی اسی لیے ان سب کے باوجود عبداللہ کے ساتھ وہاں موجود رہتی تھی۔ حفصہ ساتویں آسمان پر تھی۔ اخراجات پر بات چل رہی تب مہناز نے کہا۔

"تم دونوں فاریہ کے فنکشن میں بریرہ کی شادی والے ڈریسز ہی پہن لینا۔"

"میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میری کوئی شاپنگ نہیں کرنی وہی پہنوں گا۔" کامل نے اندر آ کر اس کی گود سے عبداللہ کو لیا اور صحن میں چلا گیا۔

"ارے کاہے اس کی یاد دلا دیتی ہوں۔" نانی نے اسے ناگواری سے دیکھا۔

"امی سب نے دیکھے ہیں وہ کپڑے۔" عندلیب ٹھنکی۔

"ولیمے والے کس نے نہیں دیکھے۔" مہناز کاپی میں کچھ لکھتی جا رہی تھیں۔ وہ اتنے بھاری کام والے تھے جو ان دونوں کو، اس کے اور رافع کے نکاح کی تقریب کے لیے 'اوور' لگ رہے تھے لہٰذا انھوں اس دن عید والے جوڑے پہنے تھے۔

"اونہہ ولیمہ!" نانی اس موضوع پر چپ رہ ہی نہیں سکتی تھیں۔

"اب میں سیٹ ہوں، اپنی زندگی اپنے گھر میں خوش ہوں تو آپ بھول کیوں نہیں جاتیں نانی؟" اس سے رہا نہیں گیا۔

"خوش؟ پرائی اولاد پال کے کون خوش ہوتا

ہے؟ یہاں آیا بنی ہے وہاں راج کرتی راج۔ سیٹ اونہہ!" وہ حیرت اور صدمے سے گنگ رہ گئی۔

"سارا وقت وہ بچہ دم کی طرح پیچھے ہے، دادی اور باپ تیرے حوالے کر کے مست بے فکر ہو گئے ہیں۔ اپنی ناک اونچی رکھنے کو تو یہی کہے گی مگر کیا ہم اندھے ہیں!" اس نے مہناز کو دیکھا۔ وہ کاپی پر جھک گئیں۔ عندلیب اور حفصہ نے نظر ملتے ہی شانے اچکائے کہ ایسا ہی تو ہے۔

"حق ہا!" ادراک کا نیا در وا ہوا تھا۔

ان سب کے لیے مسئلہ اب بھی یہ تھا کہ اس نے سب کی نفی کر کے خود کو چنا تھا۔ زندگی میں ایک ہی فیصلہ اس نے صرف اپنے لیے کیا تھا اور وہ سب اسے اس پر پچھتاتے دیکھنا چاہتے تھے۔ اس سے سننا چاہتے تھے کہ میں نے آپ سب کی نہ سن کر غلط کیا، مجھے آپ کی بات مان لینا چاہیے تھی۔ یہ ہمیشہ دوسروں کا سوچنے کا مضر اثر ہی تھا کہ جب اس نے اپنے لیے سوچا تو دوسروں کے لیے اس کا یہ اقدام قبول کرنا مشکل ہو گیا، انھوں نے اسے ناقابل معافی گناہ بنا ڈالا۔ وہ تو انھیں مطمئن کرنا چاہ رہی تھی کہ وہ خوش ہے لیکن انھیں اس کی خوشی سے سروکار ہی کہاں تھا۔ ان کا اطمینان اس کی ندامت اور پچھتاوے میں تھا۔ جب وہ کہہ دیتی، ہاں میں نے بے جا ضد کی، میں غلط اور آپ صحیح تھے۔ وہ بے کار ہی ان سب کے مقابل اپنی آسودہ زندگی ثابت کرنے ہلکان ہو رہی تھی۔

"میرا وہ فیصلہ زندگی کا پہلا درست فیصلہ تھا اور دوسرا رافع سے شادی کا۔ میری ضرورت ہو تو بلا لیجیے گا۔" وہ باہر آ گئی جہاں کامل عبداللہ کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

"چلو ادھر۔ میں کچن میں ہو تب تک تم اس کے ساتھ ہال میں کھیلو۔"

کامل اس کا ہاتھ پکڑ کے اس کے پیچھے چل پڑا۔

"آپ اسے گود میں اٹھانا بند کریں۔ کتنا پیارا چلتا ہے عبداللہ۔ ہے نا عبداللہ؟"

اور عبداللہ اپنی زبان میں اسے جواب دینے لگا۔

☆☆☆

اس نے اب دوسروں کی پروا چھوڑ دی تھی۔ وہ جان گئی تھی کچھ چیزیں اس کی زندگی میں کبھی نہیں بدلیں گی۔ کچھ نظریں، مخصوص تاثر، چبھتا تمیں اسے ہمیشہ جھیلنی پڑیں گی۔

اتوار کا دن تھا اور رافع دفتر کی کسی تقریب میں گیا تھا۔ دوپہر میں عبداللہ کے سونے کے بعد وہ فون لیے بیٹھی تھی۔ پرانی چیٹس دیکھتے ہوئے نوید کے نمبر پر 'ان ریڈ' پیغام دیکھ کر وہ رک گئی۔ نوید کا وائس میسج کافی پرانا تھا۔ وہ اس نے رافع اور اس کے نکاح کے بعد کسی دن بھیجا تھا۔

"مبارک ہو! بہت بہت مبارک ہو! تم جیسی عورتوں کا یہی انجام ہوتا ہے، اپنی ناک اونچی رکھنے کا ڈراما کرنے والے یونہی منہ کے بل گرتے ہیں۔ میری کم سے کم پہلی بیوی تھی اور گود میں ریڈی بچہ بھی نہیں ڈالا تھا۔" اس نے مکمل سنے بنا ہی وہ وائس نوٹ چیٹ سے مٹائی اور اس کا نمبر بلاک کر دیا مگر غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔ مسلسل سوچتے ہوئے غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔

"ذلیل انسان! وہ عورت کی عزت کرنا جانتا ہی نہیں ہے کسی نے سکھایا ہی نہیں اسے۔ مائیں بھی تو عورت ہوتی ہیں وہ اپنے بیٹوں کو کیوں نہیں بتائیں کہ......" سوچتے ہوئے اس نے گردن موڑی اور سوئے عبداللہ کو دیکھ کر اس کے خیال کی بہتی رو جیسے جم گئی۔ معصوم پیارا عبداللہ، گہری نیند میں اور دلکش لگ رہا تھا۔

"میں سکھاؤں گی۔" وہ ٹیکا چھوڑ کے جھکی۔ عبداللہ کے نرم گلابی ہتھیلی میں اپنی انگلی رکھی اور پھر اس کا ہاتھ اٹھا کے لبوں سے لگایا۔ اس سے ہمدردی کرتے، اس پر ترس کھاتے، جانے کب وہ بچہ اسے اتنا پیارا ہو گیا تھا۔

digest library.com

"میں عبداللہ کو بتاؤں گی ہر عورت قابل تکریم ہوتی ہے اس کے جذبات اور احساسات کو نازک آبگینے کسی عام انسان نے نہیں کہا تھا کہ اس بیان اور حقیقت کو معمولی سمجھ کے نظر انداز کیا جائے۔ میں بتاؤں گی عبداللہ کو ایسا مرد جسے بھی کوئی عورت یہ نہ کہہ سکے کہ تمھاری ماں نے یہ نہیں سکھایا، وہ نہیں سکھایا۔" بریرہ کے اندر اس پل ماں کا جنم ہوا تھا۔

اس کا دل ممتا سے یوں لبریز ہوا کہ اس نے جھک کے عبداللہ کا ماتھا چوم لیا۔ اس نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں لیا۔ اسی وقت نظر اٹھی۔ دروازے میں رافع کھڑا تھا۔ اس نے آہستہ سے عبداللہ کے ہاتھ اس کے پیٹ پر رکھے اور پلنگ سے اتر گئی۔

"آپ کب آئے؟"

"یہ کیا ہو رہا تھا؟" وہ اندر آیا۔

"ایسے ہی سوئے عبداللہ پر پیار آ گیا تھا۔"

اس نے ذرا سا سر گھما کے عبداللہ کو دیکھا۔ جب سر سیدھا کیا تو رافع سامنے تھا۔

"کسی جاگتے انسان پر پیار آ جائے تب بھی یوں اظہار کر سکتے ہیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

اس کا دل شور کرنے لگا۔ وہ چپ رہی۔ رافع نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

"بیٹے کو پیار کرتی بیوی پر مجھے بھی پیار آ گیا ہے۔" اس نے بھی وہی کیا جو بریرہ نے عبداللہ کے ہاتھ کے ساتھ کیا تھا۔

اسے یاد تھا اس کے بعد اس نے عبداللہ کی پیشانی چومی تھی۔ وہ سانس روکے، سینے میں اچھلتی کودتی دھڑکنوں کے ساتھ منتظر تھی۔ جب کئی لمحے یونہی گزر گئے کہ نہ وہ آگے آیا، نہ اس کا ہاتھ چھوڑا تو اس نے جھجکتے ہوئے نظر اٹھائی۔ رافع کی گہری توجہ سے بھری آنکھیں اسی پر ٹکی تھیں۔ وہ اس کے انتظار کا لطف لے رہا تھا۔ نظریں ملتے ہی اس نے دھیرے سے ہنستے ہوئے اس کی گردن پر دوسرا ہاتھ رکھ کے چہرہ قریب کرتے ہوئے اس کے انتظار کا ثمر ماتھے پر ثبت کیا۔

"تمھیں روز عبداللہ پر پیار آتا ہے یا کبھی کبھی؟" اب وہ چھیڑ رہا تھا۔

"جب بھی آتا ہو، اب آپ کے سامنے آنے سے پہلے دس بار سوچے گا۔"

اس کے جواب پر رافع کا قہقہہ جتنا بے ساختہ تھا اتنی ہی تیزی سے بریرہ نے پلنگ سے دور کرتے ہوئے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا تھا۔

"ششش! عبداللہ اٹھ جائے گا۔" تب ہی اس کا فون بجنے لگا۔ اس نے جلدی سے اٹھایا کہ اس آواز پر عبداللہ نہ جاگ جائے۔

"ہیلو۔"

خلاف امید دوسری طرف فاریہ تھی جو اس کی فرصت کا وقت اور دن پوچھ رہی تھی تاکہ وہ ملنے آ سکے۔

"ویک ڈیز میں کسی بھی دوپہر آ جاؤ۔" اس نے کیوں پوچھا جو وہ ٹال گئی کہ ملنے پر بتاؤں گی تو اس نے بھی جواب دے دیا۔

"فاریہ میری کزن ملنا چاہتی ہے اکیلے میں، کچھ بات کرنی ہے، کہہ رہی تھی۔" فون رکھنے کے بعد رافع کی سوالیہ نظر کے جواب میں اس نے کہا۔

"اسے ایسی کیا بات کرنی ہے؟" اس نے رافع سے پوچھا۔

"آئے گی تو پوچھ لینا۔"

اور دو دن بعد ہی وہ اپنی سہیلی حمیرا کے ساتھ چلی آئی جس سے وہ پہلی بار مل رہی تھی۔ وہ سیدھی اس کی طرف آئی تھی۔

کافی اور لوازمات ان کے سامنے رکھ کے وہ بھی صوفے پر بیٹھ گئی۔ عبداللہ قریب بیٹھا کھیل رہا تھا۔ اس کی آواز اور کھلونوں کا شور تھا جس کی اب اسے عادت ہو گئی تھی۔

"فاریہ نہیں مان رہی تھی لیکن مجھے سب سے مناسب یہی لگا کہ اسے تم سے بات کرنی چاہیے۔" ادھر ادھر کی رسمی باتوں کے بعد حمیرا نے ہی آغاز کیا۔ اس نے استفہامیہ نظر سے فاریہ کو دیکھا جواب بھی

چپ تھی۔
''میں بتاتی ہوں۔'' حمیرا نے کہا۔
''سب سے پہلے مجھے میرے کزن نے بتایا تھا کہ وقار کا کسی کے ساتھ افیئر تھا پھر پتا چلا کہ ایک نہیں اس کے ایسے ایک سے زیادہ افیئرز رہے ہیں۔'' اسے امید نہیں تھی کہ فاریہ ایسا کچھ ان کے ساتھ بانٹے گی۔ عمار اس کا منگیتر تھا۔ اس نے حیرت پر قابو پا کے فاریہ کو دیکھا۔

''حمیرا کو لگتا ہے میرے پاس وقت ہے مجھے ابھی کوئی فیصلہ کر لینا چاہیے اور تم ایسی سچویشن فیس کر چکی ہو تو مجھے مشورہ دے سکتی ہو۔''

''میں کیا مشورہ دے سکتی ہوں بھلا اور یہ تو تمہیں طے کرنا ہے۔'' اس کی بات پر فاریہ نے حمیرا کو دیکھا۔

''مشورہ یعنی اس کے بعد، تم نے سب کیسے ہینڈل کیا۔'' حمیرا نے توضیح کی۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کر کہنا شروع کیا۔

''ہم اپنے لیے آواز بلند کریں، ڈٹ جائیں تو سب سے پہلے ہمارے اپنے ہی حیرت سے گنگ رہ جاتے ہیں اور ہمیں جاننے والے ہی جب اجنبی بن کے دیکھیں تو پیروں تلے زمین کھسکنے لگتی ہے۔ ان کے بعد دنیا سے کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔ میرے ساتھ یہی ہوا تھا۔ جو میرے لیے سمجھوتا ہو وہ دنیا کے لیے عقل مندی تھی اور جہاں میں مطمئن ہوں وہ ان کے لیے سمجھوتا۔ تو دنیا کی باتوں اور لوگوں کے رویے دیکھ کر تمہیں زندگی گزارنا ہے تو وہی کرو جو انہیں ٹھیک لگتا ہے ورنہ بہتر ہے ادھر سے آنکھیں، کان بند کر لو۔ اگر تمہیں دنیا کا سرٹیفکیٹ پا کر ہی خوشی ملتی ہے تو پھر بھول جاؤ کیونکہ سب اتفاق کریں یہ ناممکن ہے۔ ویسے کیا تم نے ڈیسائیڈ کر لیا ہے؟''

''ابھی نہیں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

''تم گھر میں بات کرو۔ تمہارے پاس وقت ہے میرے پاس نہیں تھا۔ پہلے ہی سب کو اپنا موقف سمجھا سکو تو وہ ہی فیصلہ کر لیں گے۔''

''اس نے اپنی باجی سے کہا جنہوں نے اسے ڈانٹ پلا کے سختی سے منع کر دیا کہ کسی سے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ شادی سے پہلے کے معاشقے ہیں بعد میں سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ وہ ان کے ریلیٹو بھی ہیں نا۔ مجھے تو حیرت ہے، وہ عورت اور بیوی ہو کے سمجھ نہیں رہی ہیں۔'' اس کی بات پر وہ ہلکے سے ہنسی۔

''واحد انسان جو اس وقت میرے ساتھ تھا وہ کامل تھا اور اس کے بعد مجھے کسی نے سمجھا تو رافع نے۔ جب کہ نوید کے اس فریب میں اس کی ماں بہنیں سب شامل تھیں، بعد میں ان کے ساتھ میرے گھر کی ساری خواتین بھی میرے اگینسٹ تھیں اس لیے سمجھنے اور نا سمجھنے والوں میں مرد یا عورت ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔'' حمیرا کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

''اسی لیے مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' فاریہ بھی تھی۔ اس نے بھی بریرہ کی مخالفت دیکھی تھی بلکہ وہ بھی دوسروں میں شامل تھی۔

''اس کے لیے ضروری یہ ہے کہ تمہیں پتا ہو تم کیا چاہتی ہو۔ تمہارے لیے کیا ریڈ لائن ہے، کہاں تم کمپرومائز کر سکتی ہو اور کیا بالکل قبول نہیں کر سکتیں۔''

''مجھے وہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

''تو پہلے وہی سمجھو۔ میں نے مشکل فیصلہ کیا اور قائم رہی اس لیے کہ مجھے پتا تھا مجھے کیا چاہیے اور کیا نہیں۔ رافع سے شادی کرتے وقت بھی میری سوچ کلیئر تھی۔'' اس نے رک کر سوچا کہ اتنی ذاتی باتیں اسے کہے یا نہیں لیکن وہ اس سے فیصلے کے لیے رہنمائی کی خاطر آئی تھی جو وہ یونہی نہیں دی جا سکتی تھی۔

''میرا شوہر میری عزت کرتا ہے، میری پسند میری خوشی کا احترام کرتا ہے، میرا سوتیلا بیٹا۔ مجھے اس سے بھی پیار ہے۔ وہ پہلا بچہ ہے جس نے میرے اندر ممتا جگائی اور یہ اعزاز میری کوکھ سے جنمی اولاد کو بھی حاصل نہیں ہوگا۔ میں پہلے عبداللہ کی ماں بنی ہوں یہ سچ کوئی نہیں بدل سکتا۔ یہ سب میری

digest library.com

سچائیاں، میرا سکون، میری خوشیاں ہیں لیکن لوگوں کے لیے تو میں ایک سمجھوتے والی، قابل رحم زندگی گزار رہی ہوں۔ میں کسی کی سوچ نہیں بدل سکتی نہ میں ہر ایک کو پکڑ کے ان کی غلط فہمی دور کر سکتی ہوں۔ ہوسکتا ہے دنیا کی نظر میں میرے لیے ہمیشہ تمسخر اور ترس ہی رہے، مجھے ہمیشہ جج مینٹل لگا ہیں، جملے سہنا پڑیں اور یہ میرے اس فیصلے کی قیمت ہے جو میں عمر بھر ادا کرتی رہوں گی جس کا مجھے افسوس بھی نہیں۔ میں اپنے فیصلے کو پوری طرح اون کرتی ہوں، جہاں میرے لیے کمپرومائز ممکن نہیں تھا، نہیں کیا لیکن پھر زندگی نے اس کے بعد میرے آگے جو رکھا اسے بھی میں نے دل سے قبول کیا، ریلیسٹکلی سوچا، ان ریز جبل اور آفاقی توقعات نہیں رکھیں۔ کسی سے شکوہ نہیں کیا، قسمت سے بھی نہیں کہ وہ سب میرے فیصلے کے نتائج اور اثرات تھے۔ تو اگر تم میں بھی اتنا حوصلہ اور کلیئرٹی ہے، تب ہی کوئی انتہائی ڈسیژن لو۔ اگر تمہیں گلیمرس لائف، رشتے دار، دوست، سوشل میڈیا کی ویلیڈیشن اور آسائشیں چاہئیں تو اسے چھوڑنے کا خیال دل سے نکال دو لیکن اگر تم رشتے میں وفاداری اور اپنے مقام کو اہمیت دیتی ہو، اس کے بعد ورسٹ کیس سنیریو میں اکیلے ہی سب جھیلنے اور جو بھی زندگی دکھائے، قبول کرنے کو تیار ہو تو انکار کر دو۔"

"باجی بھی یہ کہہ رہی تھیں کہ ہر جگہ سب نہیں ملتا، کچھ نہ کچھ کمی تو سب میں ہوگی جب کہ ایسا رشتہ نصیب سے ملتا ہے۔ وہ لوگ امیر، انجلش اور ماڈرن ہیں۔"

"وہی تو کہہ رہی ہوں، سب جگہ سب نہیں ملتا۔ اسی لیے تمہیں کیا چاہیے اور اس کے لیے تم میں اکیلے کہاں تک چلنے اور ڈٹے رہنا کا حوصلہ ہے، یہ جانو۔"

"باجی نے مجھے تمہاری ہی مثال دی کہ پھر اس طرح کہیں شادی ہوگی تمہاری بھی۔" قاریہ کی بات پر وہ بے آرام ہوئے بنا مسکرا دی۔

"میں سب کی مان کر ان چاہی بیوی اور بہو بن جاتی، کچھ دن بعد سب ٹھیک بھی ہو جاتا لیکن میں کبھی ٹھیک نہیں رہ سکتی تھی۔ خود کو ڈی گریڈ کرنے کا پروانہ تھما دینا اور پھر اسی بندے سے اچھی امید رکھنا جس نے پہلے مقام پر ہی اپنی اوقات دکھا دی ہو، حماقت ہے۔ سب نارمل ہو جانے کے بعد بھی مجھے کبھی وہ خوشی نہیں مل سکتی تھی جو اس وقت میرے پاس ہے۔ اپنی محبت، بزدلی کے ہاتھوں کھو کے اس کا غم مٹانے مجبوراً بیوی کے پاس آئے، میرڈ لائف کے عیش لوٹنے والا نوید بھی رافع کی برابری نہیں کر سکتا۔" وہ سانس لینے رکی۔

"دیکھنے والوں کو لگتا ہے شادی ہوتے ہی میری گود میں پرائی اولاد آئی، شادی کے اولین دنوں کا حسن میرے نصیب میں نہیں تھا، پہلے سے ایک عورت کی محبت دل میں رکھنے والا مرد ملا مگر مجھے یہ باتیں بری نہیں لگتیں، مجھے کسی بات کا دکھ یا افسوس نہیں ہوتا، میں نے کوئی حسرت نہیں پالی، کسی محرومی کو پنپنے نہیں دیا۔ میری اس زندگی کو سمجھوتہ سمجھ کر مجھ پر ترس کھانے والے میری زندگی کو جانتے ہی کہاں ہیں۔ اس رات سے پہلے میں بھی نہیں جانتی تھی میرے لیے اپنی حیثیت، اپنی عزت نفس اتنی اہم اور بے وقعتی کا احساس ناقابل برداشت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میں جانتی تھی نہ اب نہ بعد میں، میں اس پر کمپرومائز کروں گی۔ میرے لیے سر اٹھا کے سانس لینا، پارٹنر کی آنکھوں میں، اس کے چہرے کو فخر اور اعتماد سے دیکھ پانا زیادہ اہم ہے۔ وہ بعد میں کتنا کچھ کرتا لیکن میں اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے خود پر جبر کرتی، نادم ہوتی، دل سے اس کی عزت نہیں کر سکتی، اس کی قربت میں ہر بار اس کے ہاتھوں جھیلی ذلت یاد آتی تو میں کیسے خوش رہتی۔ رافع کی پرائرٹی عبداللہ تھا، ہے اور اس وقت میری ترجیح اپنی ذات، اپنے احساسات، اپنی قدر تھی پھر بھی مجھے رافع سے محبت ہو گئی ایسی محبت میں اس سچویشن میں بھی کر رہی نہیں سکتی تھی۔"

تبھی آہٹ ہوئی اور تینوں نے ادھر دیکھا۔
دروازے میں رافع کھڑا تھا۔
ان دونوں نے اسے سلام کیا۔ وہ بھی سنبھل گئی۔

"کیسے ہیں آپ؟" تمیرا نے پوچھا۔

"اللہ کا کرم ہے۔" اسے جواب دے کر اس نے بریرہ کو دیکھا۔

"نانی تمھیں پوچھ رہی تھیں۔"

"میں دیکھتی ہوں۔" وہ اٹھی۔

"مجھے۔" رافع نے بولنا شروع کیا اور وہ رک گئی۔

"آپ لوگوں کی بات کا کانٹیکسٹ نہیں پتہ لیکن میری نادان بیوی کو ہی نہیں، مجھے بھی اس سے محبت ہے۔" رافع نے اسے دیکھا۔

"بہت محبت۔" اس نے جھک کے عبداللہ کو اٹھایا جو اس کی ٹانگ پکڑ کے کھڑا تھا اور اس سے بات کرتا خواب گاہ میں چلا گیا جیسے کوئی بڑی بات نہیں ہوئی ہو اور وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"واؤ!" تمیرا نے پہلے اسے پھر فاریہ کو دیکھا۔

"تمھاری تو بڑی یونیک لو اسٹوری چل رہی ہے۔" تمیرا کے خوش گوار لہجے پر اس نے مسکرا کے اسے دیکھا مگر دل میں سوچ رہی تھی۔

"لو اسٹوری اور ہماری؟" کبھی کبھی ہم، ہمیں دیکھنے والے کیا کہہ رہے ہیں، کیا سوچ رہے ہیں، کیا سمجھ رہے ہیں، کو اتنی اہمیت اور توجہ دیتے ہیں کہ خود اپنی کہانی سے غافل ہو جاتے ہیں۔

"ویسے ضروری نہیں تم انکار کر دو تو میرے جیسے حالات سے گزرو۔ تمھیں عمار سے بہتر انسان بھی مل سکتا ہے۔ جب تک تم خود کیا چاہتی ہو، تمھارے لیے سب سے اہم کیا ہے، یہ کلیئر نہیں ہوتا کوئی فیصلہ نہ کرو۔" اس نے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

"ویسے بریرہ! تم نے یہ بھی ثابت کیا کہ جب سچویشن ناقابل قبول ہو تو کبھی دیر نہیں ہوتی ورنہ تو یہ ہی کہا جاتا کہ شادی ہو گئی، اب کیا کر سکتے ہیں۔ اسے لڑکیوں کے لیے دی اینڈ مان لیا جاتا ہے۔ حالاں کہ ایک غلط شروعات کو روکنے کا موقع جب بھی ملے، گنوانا نہیں چاہیے۔" تمیرا اس سے کچھ زیادہ کی متاثر تھی۔ وہ بس مسکرا دی۔

"میں نانی کو دیکھتی ہوں امی بھی آ گئی ہوں گی۔ تم ادھر جاؤ گی نا؟" وہ پھر کھڑی ہوئی۔

"ہاں۔" فاریہ بھی کھڑی ہوئی۔

"چلو مل لیتے ہیں۔"

وہ ان دونوں کو ادھر چھوڑ کے آئی تو عبداللہ پھر ہال میں تھا اور باورچی خانے سے آواز آ رہی تھی۔ وہ میز سے ٹرے اٹھا کے وہیں آ گئی۔ رافع چائے بنا رہا تھا۔

"آپ بیٹھیں میں بناتی ہوں۔"

"پہلے مجھے یہ بتاؤ۔" وہ اس کی طرف پلٹا مگر سلیب سے ٹک کے اس کا چولھے تک پہنچنے کا راستہ روکے تھا۔

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ جب تک میں کہوں گا نہیں تمھیں یقین نہیں آئے گا نہ تم مانو گی؟"

"کیونکہ مجھے سب کے رویوں اور باتوں سے لگا تھا میں نے 'چاہے جانے' والی لگژری کو اپنے پیروں سے ٹھوکر مار کے راستے سے ہٹا دیا ہے، میرے ساتھ ضرورت کے تحت ایڈجسٹمنٹ ہی ہو سکتی ہے۔" وہ سر جھکائے آہستہ آواز میں بول رہی تھی۔

"کیوں؟" رافع کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"تم صحت مند، با اخلاق، ذمہ دار، ینگ لڑکی ہو اور بہت پیاری بھی، چاہا جانا تمھارا حق ہے۔ دنیا میں بہت سوں کی طلاق اور دوسری شادی ہوتی ہے اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ بعد میں انھیں محبت نہیں ملتی یا وہ اس کا حق کھو دیتی ہیں۔ لوگوں کی چھوڑو، تمھیں تو یقین ہونا چاہیے۔"

"اب ہے۔" اس نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"گڈ!" رافع نے اسے ساتھ لگاتے ہوئے

پھر یقین دلایا تھا۔

☆☆☆

کامل نے اسے بتایا کہ نوید کی اسی لڑکی سے شادی ہو رہی ہے اور پہلے سے زیادہ دھوم دھام سے تیاریاں چل رہی ہیں۔ گھر میں بھی حفصہ کی شادی کی تیاریاں شروع تھیں۔ اسی دوران فاریہ کی شادی کا کارڈ ملا۔ دولہے کی جگہ عمار کا نام ہی درج تھا۔

ان دنوں پروین بڑے بیٹے کے پاس تھیں تو شازیہ نازیہ دونوں ان کے پاس آگئیں۔ اور چند دنوں میں ہی اسے احساس ہوا کہ شادی کے بعد ان دونوں کا تنہا ہونا کتنی بڑی نعمت تھا۔ کسی کی مداخلت نہیں تھی اسی لیے ان کا سفر ست گامی کے باوجود خوب صورت تھا کہ انھوں نے یہ اپنی مرضی، خوشی اور سہولت سے طے کیا تھا۔ وہ دونوں بھی اوروں کی طرح جانچتیں اور ٹٹولتیں رہتی تھیں۔ عبداللہ کے معاملے میں ان کا انداز سخت اور یہ جتانے والا ہوتا تھا کہ وہ اس سے زیادہ عبداللہ پر حق رکھتی ہیں اور بریرہ اس کے معاملے میں انھیں جواب دہ ہے۔ وہ عبداللہ کے معاملے میں خود کو اس کی حفاظت کے لیے تعینات نگراں گردانتی تھیں۔ کبھی کبھی ان دونوں کو ساتھ اور بے تکلف دیکھ کر وہ ایک دوسرے کو اشارے بھی کرتیں مگر اب وہ سب نظر انداز کرنا سیکھ گئی تھی۔ ان کی مصروفیت میں وہ چاہ کر بھی حمیرا یا فاریہ کو فون نہیں کر سکی۔ اس کی شادی والے دن ہی وہ دونوں صبح واپس چلی گئیں۔

فاریہ کی تقریب کے لیے، وہ اپنی شادی والے دن سے زیادہ دل اور محنت سے تیار ہوئی تھی۔ وہ سیاہ جھلمل کرتی ساڑھی اور کنگن رافع کی طرف سے پہلا تحفہ بھی تھے۔

"تم ساڑھی میں بچے کو کیسے سنبھالو گی؟" نانی نے دیکھتے ہی اعتراض کیا۔

"اسے میں سنبھالوں گا۔" سیاہ سوٹ پہنے پیارے عبداللہ کو کامل نے اپنے قریب کھینچ لیا۔

وہ سب ایک ساتھ جا رہے تھے۔ رافع دفتر سے آنے کے بعد تیار ہو کے ہال پہنچنے والا تھا۔

"تھینک یو۔" فاریہ نے تنہائی ملتے ہی اس کا ہاتھ تھاما۔

"تم سے بات کرنے کے بعد ہی میں نے سوچا کہ مجھے کیا چاہیے۔ تم چاہے مجھے جج کرو لیکن مجھ میں لوگوں کی نظریں، باتیں جھیلنے کا حوصلہ نہیں، نہ میں تمھارے جیسی سچویشن یعنی دوسری بیوی یا ماں کا ایک پرسنٹ چانس لینا چاہتی تھی۔ میرے لیے اسٹیٹس اور پیسے والا شوہر زیادہ ضروری ہے جو میرے سارے شوق ارمان پورے کرنے لائق ہو۔ مجھے امید ہے تم کسی سے نہیں کہو گی۔" فاریہ وہی فاریہ تھی جسے وہ جانتی تھی۔

"ٹینشن نہ لو میں سب بھول گئی ہوں۔ خوش رہو۔" اس نے مسکرا کے اسے دعا دی۔

"اور بے فکر بھی، میں کسی کو جج نہیں کرتی۔"

جمیلہ آئی تو دونوں چپ ہو گئیں۔

"یہ اصلی تو نہیں ہوں گے؟" اس نے اس کے ہاتھ میں کنگن دیکھ کے پوچھا۔

"رافع کو آرٹیفیشل جیولری نہیں پسند۔" وہ پلو سنبھالتی کھڑی ہو گئی کہ اسے سامنے کامل اور عبداللہ کے ساتھ رافع نظر آیا تھا۔

"یہ منہ دکھائی تھی؟ تو ہمیں بتایا کیوں نہیں؟" جمیلہ نے خود ہی عادتاً قیاس لگایا۔

"منہ دکھائی دلہن کے لیے ہوتی ہے، دنیا کے لیے تھوڑی۔ مجھے رافع بلا رہے ہیں۔" اس نے بھی صفائی نہیں دی اور رافع کو ہاتھ دکھاتی اسٹیج سے اتر گئی۔

درمیان میں ہی اسے حمیرا مل گئی۔

"میں کب سے تمھیں ڈھونڈ رہی تھی۔ تھینک یو۔" اس نے بھی شکریہ ادا کیا۔

"بھلا برا جیسا بھی ہو، فاریہ نے کا نفوذ علی فیصلہ کیا ہے گو میں متفق نہیں لیکن وہ بھی بچی نہیں، جانتی ہے کس آگ سے روشنی کی تمنا کر رہی ہے۔ سب میں تمھاری طرح دشوار راستہ چننے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ویسے میں نے شکریہ اس لیے ادا کیا کہ میں

digest library.com

نے بھی ایک پروپوزل پر یہ ہی سوچا کہ میں کیا چاہتی ہوں، کیا نہیں۔"

"اچھا۔" دور کھڑا رافع منہ بنا کے اسے جلدی آنے کہہ رہا تھا۔

"دراصل لڑکا ابراڈ ہے اور ان لوگوں کی شرط تھی کہ میں اس وقت تک یہیں سسرال میں رہوں جب تک اس کی دو بہنوں کی شادی نہیں ہو جاتی۔ مجھے فیملی کو سپورٹ کرنے پر آبجیکشن نہیں لیکن میں شادی کر کے شوہر کے بغیر نہیں رہنا چاہتی۔ یہ ہی امی سے کہا کہ اگر میں بھی اس کے ساتھ وہیں جا سکتی ہوں تو ٹھیک ورنہ منع کر دیں۔ جب کہ سب کا کہنا تھا بعد میں لڑکے سے ڈسکس کر لینا، منا لینا، کوئی راستہ نکل آئے گا مگر میں نے کہا پہلے ہی صاف بات کریں کہ میں شوہر کے بنا دو سال سسرال نہیں رہوں گی۔"

اس کی نظروں کے تعاقب میں اس نے مڑ کے دیکھا۔

"اوہ سوری!" وہ نادم ہوئی۔

"اللہ تم دونوں کو بری نظر سے محفوظ رکھے۔" اس نے دعا کی۔

وہ رافع کے پاس آئی جسے اب جانا تھا۔

"اتنی جلدی؟" اس نے آس پاس نظر دوڑائی۔ وہ بھی سوالوں اور نگاہوں سے بے زار ہو گئی تھی۔ خاندان کے لوگ جو اس واقعے کے بعد اب ملے تھے، وہ سب اسے اور عبداللہ کو کسی عجوبے کی طرح دیکھ رہے تھے۔

"چلیں۔" وہ مان گئی۔

"میں امی سے کہہ دیتی ہوں کہ ہم جا رہے ہیں۔" اس نے مہناز کو ڈھونڈ کے اپنے جانے کا کہا۔

"رخصتی تک تو رکو۔"

"عبداللہ کے سونے کا وقت ہو گیا ہے، دیر ہوئی تو وہ تنگ کرے گا۔" وہ سب کے اصرار کے باوجود اللہ حافظ کہہ کے آ گئی۔

کامل بھی ان کے ساتھ تھا۔ عبداللہ راستے میں ہی سو گیا تھا۔

کان کے آویزے رکھتے ہوئے اس کے ہاتھ وہ پرچی لگی، جس پر رافع نے اپنا فون نمبر لکھ کر دیا تھا۔ جو پھینکنے کے بجائے اس نے زیور والے ڈبے میں رکھ دی تھی۔

"یہ تم نے اب تک سنبھال رکھی ہے؟" اس کے کاندھے کے اوپر سے دیکھتے ہوئے رافع کو تعجب ہوا۔

"مجھے فون نمبرز زیادہ یاد نہیں ہوتے لیکن یہ نمبر اسی دن یاد ہو گیا تھا۔" وہ اس کی طرف پلٹی۔

"پھر تو اسے فریم کرنے کی ضرورت ہے۔" اس نے پرچی اپنے ہاتھ میں لی۔ وہ ہنس دی۔

"کیا کریں گے فریم کر کے، یہ نمبر مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔" رافع کو بھی بہت کچھ یاد آ گیا۔

"اس دن تمہیں میری باتیں سمجھ میں آ گئی تھیں؟ اتنی بے ربط اور الجھی بات میں نے زندگی میں شاید پہلی دفعہ ہی کی ہوں گی۔"

"الفاظ یا جملوں پر میں نے دھیان ہی نہیں دیا، اب تو یاد بھی نہیں۔ اس وقت جو دل کو لگی وہ آپ کی نیک نیتی اور ایمان داری تھی۔ ویسے۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔

"اس سے پہلے میں آنٹی اور آپ کی باتیں سن چکی تھی، جب وہ آپ کو میرے لیے کنونس کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔"

"کب؟ تم تو ادھر آتی ہی نہیں تھیں؟"

"ایک بار آئی تھی۔ امی نے کچھ بھیجا تھا جو آپ کے بدلے میں نے ہی کھا لیا تھا۔"

"سوری۔ اگر اس وقت میں نے ایسا کچھ کہا تھا جس سے تم ہرٹ ہوئی ہو۔" اس نے بریرہ کے ہاتھ تھامے۔

"آپ یہ سوری، اجازت، اور برا نہ لگے تو، ایک بار میں ہی بھول کیوں نہیں جاتے؟" بریرہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

وہ خوش دلی سے مسکرایا اور سب بھول کے کام کی بات یاد رکھی۔

"اوکے عبداللہ کی مما!" اور یہ جملہ تو 'ایکشن' کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا تھا۔

☆☆

منشا محسن علی

Digest Novels Lovers Group ❤❤

پگلم

تیسری منزل کے اکلوتے کمرے کی مسہری پر براجمان نئی نویلی دلہن حیران پریشان سی نظر آتی تھی۔ پہلے پہل تو اپنے پہناوے نے اسے جی بھر کر زچ کیا تھا کہ جو شرارہ اس نے زیب تن کیا ہوا تھا وہ کئی صدیوں پرانا تھا جس کی کچی سلائیاں ادھڑنے کا خدشہ دل کو الگ ہولائے دے رہا تھا۔

جان بچی سو لاکھوں پائے کے مصداق، وہ تیسری منزل کے اس خستہ حال کمرے تک پہنچی تھی جہاں کونوں کھدروں میں کہیں کہیں جالے سجے ہوئے تھے۔ تھوڑی بہت سیلن کی مہک بھی حواسوں پر عجب انداز میں طاری ہو رہی تھی۔

چھینک چھینک کر برا حال ہو رہا تھا، کچھ فضا میں ایسا گرد و باراں جما تھا کہ کھانسی کے دورے الگ پڑ رہے تھے۔ یہ محلہ تو شاید بابائے آدم کے زمانے سے بھی کہیں بڑھ کر پرانا تھا۔ سرخ اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی تھیں۔ اور ڈھیروں کی تعداد میں آدم بو آدم بو کرتے شیطان کے بچے، جو کسی صورت چین لینے کو تیار نظر نہ آتے تھے۔ ماؤں کی گھوریوں اور دھموکا پٹی کو نظر انداز کیے بس کسی بور ترین کھیل کے میچ جیسی کمنٹری کیے جاتے تھے۔

دلہن بے چاری تو اس چڑیا گھر جیسی جگہ پر پہنچ کر سخت کبیدہ خاطر دکھائی دیتی تھی۔ بڑے بھیا نے تو کیا کیا نقشہ نہیں کھینچا تھا۔ سرخ اینٹوں والی خالص بھٹے کی اینٹوں والی حویلی۔ جس میں غلام گردشیں تھیں۔

کوئی سو کے قریب سیڑھیاں تھیں جنہیں تھم تھم کر بچ بچ چڑھنا اترنا پڑتا تھا۔

بڑے بھیا بڑے حسابی کتابی تھے کہ اپنی محبت کو پانے کے واسطے، اس کی ساری حیاتی کو روگ لگا گئے تھے۔ مسہری ہر کروٹ چیں چیں کی آوازیں بلند کرتی تھی۔

وہ سارے ماحول کا جائزہ لے چکی تھی اور اب گھٹنوں میں سر دیے اپنے حنا سے رنگے ہوئے ہاتھوں کو گھورے جاتی تھی۔ جانے کہاں کہاں سے آنکھوں میں آنسو نما پانی امڈ امڈ کر باہر آ رہا تھا۔

نیچے والی کسی منزل سے کسی "پگلم" نامی بندے کو مسلسل آوازیں پڑ رہی تھیں۔

"پگلم! پانی بھر دو۔ ٹنکی میں ایک بوند بھی پانی کی نہیں ہے۔"

"ارے پگلم...... باہر نکڑ والے ہوٹل سے چار پانچ نان اور کوئی شوربے والا سالن پکڑ لا۔ میرے بچے بے چارے کب سے بھوکے ہیں۔"

"پگلم صحن کو جھٹ پٹ صاف کر دو۔ مہمانوں کے سونے کی جگہ بن جائے گی۔"

"قسم سے اتنی خواری والی شادی تھی کہ کمر ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ ایسے میں پگلم کے ہاتھ کی کڑک چائے ہو جائے تو قسم سے مزہ آ جائے۔"

پتا نہیں کون تھا یہ نمونہ انسان جو بھاگ بھاگ کر سب کی جی حضوریوں پر لگا ہوا تھا۔ وہ ڈیڑھ گھنٹے سے یہ نام سن سن کر جیسے اکتا گئی تھی۔

"جو بھی ہو میری بلا سے۔ ہو گا گھر کا کوئی ملازم۔ ایک تو میری نیند اور بھوک سے جان نکل رہی ہے۔ گھر میں تو عادت تھی سویرے سویرے کھانے پینے اور پھر لمبی تان کر سو جانے کی۔ مگر شہروں کے تو

ناولٹ

رواج ہی نرالے ہیں۔"

جلتی کڑھتی دلہن نے جیسے ہی مسہری سے ٹیک لگا کر پاسا بدلا تھا۔

دھڑام سے مسہری کا ایک حصہ فرش بوس ہو گیا تھا۔

باہر رنگ رنگیلی رات تھی۔ ہر طرف غل غپاڑہ تھا۔ دلہن اپنی نازک کمر تھامے دہری ہو گئی تھی۔ زرد بلب کی روشنی میں دو تین پھولوں کی لڑیوں سے سجائی گئی سیج بھی ایک طرف بیٹھ گئی تھی۔

اسے زور کا رونا آیا تھا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو رونے دیا تھا۔ آنکھوں کا کاجل رات کی سیاہی سے جا ملا۔ اور دھیرے دھیرے آس پاس کے ہنگامے سرد ہو گئے تھے۔ وقفے وقفے سے گھر کے ملازم عرف کرتا دھرتا پکلم کو آوازیں دینے اور کام

digest library.com

سوچنے کا سلسلہ جاری رہا تھا۔

خستہ سی کھڑکی کے باہر کوئی چمگادڑ منڈلاتا ہوا ایک پھیرا کمرے کا لگا کر باہر نکل گیا تھا۔

وہ ڈر گئی تھی۔ مگر صد شکر کہ مرنے سے بال بال بچ گئی تھی۔

بازگشت کی طرح سکھی سہیلیوں کے قہقہے اور باتیں سنائی دینے لگیں۔

"تو تو اب پکی پکی شہرن کہلائی جاوے گی۔

بڑے بھیا کہتے ہیں تمہارے سسرالی تو بہت پرانے رئیس ہیں۔ تین منزلہ تو ان کی حویلی ہے اور وہ بھی بھرے شہر کے مرکز میں۔ سو سے زیادہ سیڑھیاں ہیں۔ آس پاس نان روٹی کے تندور ہیں۔ اور تو اور سلمہ ستارے اور جارجٹ کی دکانیں بھی بالکل پاس ہیں۔ خوب رونق میں رہو گی۔"

گاؤں کی الھڑ مٹیارنیں ایسی ہی تھیں۔ خواب دیکھنے والی۔ پھول بوٹے کاڑھنے والی۔

جمع تفریق کرنے والی۔ موازنے کرنے والی۔

شہرن کہلائے جانے کی چاہ رکھنے والی۔

نئی نویلی دلہن کے چہرے پر غازے کے رنگ مدھم پڑنے لگے۔

رات پر جوبن طاری ہونے لگا تھا۔ وہ فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے بیٹھے اونگھ گئی تھی۔ گھٹنوں کے بل بیٹھنے سے غرارے کی کوئی کچی سلائی کھل بھی گئی تھی۔ دھیرے دھیرے تیسری منزل کے اکلوتے کمرے کے اکلوتے ہی دروازے سے کوئی اندر داخل ہوا تھا۔

زرد بلب کی روشنی میں اونچے قد بت کا وہ انسان دلہن کو صحیح طرح نظر بھی نہیں آیا تھا۔

وہ ابھی بھی غنودگی میں جھول رہی تھی۔ آنے والے کے ہاتھ میں تام چینی کی ٹرے تھی۔ کلچن اور کڑک چائے کا کپ بھی رکھا ہوا تھا۔

ٹوٹی ہوئی مسہری۔ بکھری ہوئی سیج۔ اونگھتی ہوئی دلہن۔

نو وارد جیسے تمام جائزہ لے چکا تھا۔ وہ بھی فرش پر بیٹھ گیا تھا جیسے اسے فرش پر بیٹھنے کی عادت ہو۔

"پرانی لکڑی تھی مسہری کی۔ مجھے خطرہ تھا کہ کسی دن ٹوٹ جائے گی مگر یہ اندازہ ہرگز بھی نہیں تھا کہ آج کے دن ہی ٹوٹے گی۔ معافی چاہتا ہوں۔" دھیمن دھیمن لہجہ۔ وہ مٹی مٹی لفظ۔ دلہن ساکت رہ گئی تھی۔

کیونکہ...... وہ تو "وہی" تھا۔

دیوانوں کے جیسا پرویز عرف پکلم......!

اور زمین دار گھر کی بیٹی دلہن بنی بیٹھی تھی۔

چاند کے جیسی چندا......!

☆☆☆

گپ چپ سی صبح تیسری منزل پر طلوع ہوئی تھی۔ چندا کی جب آنکھ کھلی تو خستہ کھڑکی سے تیز سورج کی روشنی اندر پڑ رہی تھی۔

فرش پر بچھا ہوا آرام دہ بستر اور ساتھ ہی سلیقے طریقے سے رکھا ہوا پانی کا کولر اور گلاس دیکھ کر وہ جیسے کسی خواب سے جاگی تھی۔ سب سامان سمیٹ دیا گیا تھا۔ مسہری کے ٹوٹے ہوئے پائے بھی نظروں سے غائب تھے۔ نیچے سے پھر پکلم پکلم کی آوازوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔

کبوتروں کا ایک جھنڈ سامنے سے گزر گیا تھا۔

وہ بڑی مشکلوں سے اٹھ کر واش روم تک گئی تھی اور سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچی تھی۔ اور وہاں تو ایسا گھمسان کا رن پڑا کہ سب کچھ ہانپ کانپ گیا تھا۔

بچے تیر کی طرح اس کی طرف بڑھے تھے۔ لڑکیاں ان کو ڈپٹ کر ہٹانے لگی تھیں۔

سامنے ہی تخت پر ساس صاحبہ براجمان تھیں۔ پوتیاں بھی دادی کے ساتھ موڑھوں پر بیٹھی شاید شادی میں شرکت کرنے والے مہمانوں کی چغلیوں میں مصروف تھیں۔ وہ بھی وہیں ایک مضبوط آبنوس کی کرسی پر صبر شکر کر کے ٹک گئی تھی۔

"کیسی ہو دلہن...... نیند تو اچھے سے آئی ناں؟ نئی جگہ ہے تو کچھ وقت لگے گا مگر فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے جلد ہی عادی ہو جاؤ گی۔"

وہ بس سر ہلا کر رہ گئی تھی۔ سامنے ہی چارپائیوں پر بڑے دیور مجی بھیا چھوٹے گوشت کے پائے کا شوربہ پی رہے تھے۔ وہیں سے مسکرا کر خیر مقدم کیا گیا تھا۔ منجھلے دیور عدی بھیا اپنی روٹھی بیوی کو منانے کے چکروں میں تھے اور ان کے پیچھے پیچھے پہلی منزل کے ہر کمرے سے گزر رہے تھے۔ ہاتھوں میں حلوہ پوری کا ناشتہ تھا۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے سب کچھ غور سے دیکھے جارہی تھی۔

پاس کھڑی ثریا نے ٹوہ لینے والے انداز میں پوچھا تھا۔

"پنکم کیسا لگا آپ کو؟"

چندا کو ایک پل کو یوں لگا تھا جیسے کسی نے تیز دھار آری سے ٹوٹے ٹوٹے کر دیا ہو۔ وہ کوئی جواب دینے کو پر تول رہی تھی کہ سامنے بنے باورچی خانے سے چنگیر میں پراٹھے ڈالے پنکم، مجی بھیا کی طرف بڑھا تھا۔

"یہ لیجئے بھیا...... گرما گرم آپ کا مولی والا پراٹھا۔"

بھیا نے اس کی پیٹھ ٹھونکی اور مڑ کر چندا سے مخاطب ہوئے تھے۔

"بھابی! تمہیں پتا ہے جتنا ذائقہ پنکم کے ہاتھوں میں ہے ناں ایسا ذائقہ اس گھر کی کسی عورت کے ہاتھوں میں بھی نہیں۔ اس کے پراٹھے کھائیں گی تو انگلیاں کاٹ کھائیں گی۔"

جھینپا جھینپا سا پرویز جیسے بیوی کے سامنے اس تعریف پر ہلکا سا شرما گیا تھا۔

دن کی روشنی میں پہلی بار چندا نے اپنے مجازی خدا کو دیکھا تھا۔

اونچا لمبا قد...... اول جلول حلیہ...... پیشانی پر گرتے سرسوں کے تیل سے چپڑے بال۔

سفید قمیص پر گھی کے بڑے بڑے داغ تھے۔

اماں نے اسی وقت پنکم کی آنکھوں کی چوری پکڑ لی تھی۔

"بیوی کو تاکنے سے فرصت ملے تو ایک پھلکا مجھے بھی ڈال دو۔ ساتھ ایک دودھ پتی بھی بنا دینا۔ شادی کی تیاریوں نے تو تھکا دیا ہے۔ پورے پنڈے میں درد ہی درد ہے۔"

ذومعنی قہقہے ابلتے رہے۔ مجی بھیا کی بیٹیاں جوان ہونے کو تھیں اور ان کی بیوی عارفہ نویں مہینے سے تھیں اور اندر کسی کمرے میں آرام فرما رہی تھیں۔

لڑکیاں اسے لے کر ان کے کمرے کی طرف آ گئی تھیں۔

سامنے ہی وہ موجود تھیں۔ کمرے کا حال تیسری منزل کے کمرے سے بھی کہیں ابتر تھا۔ بدرنگے پردے لٹکے ہوئے تھے۔

حفظان صحت کے سارے اصولوں کی خلاف ورزی کے ساتھ عارفہ ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ ان کے وجود سے عجیب سی مہک اٹھ رہی تھی یہاں تک کہ چندا کو ابکائی سی آنے لگی تھی۔

"اماں یہ دیکھیں یہ ہیں پنکم کی دلہن۔"

عارفہ نے اتنے جوش وخروش کے ساتھ اسے گلے سے لگایا تھا کہ چندا کا دم نکلنے کو تھا۔

"ہائے ہائے کتنی سوہنی ہے۔ ہمارا پنکم تو جھلا ہے۔ رات سے ہی کہہ رہی تھی کہ دلہن کو میرے پاس

لازمی لاؤ مگر اس حالت میں بھی اس گھر میں تو میری کوئی سنتا ہی نہیں۔ سب اپنی من مرضیاں کرتے ہیں۔ ساری رات بے چینی میں کروٹیں بدلتے گزری کہ جانے کیسی ہوگی پنکھم کی دلہنیا۔ تب سے دوپٹے کے پلو میں منہ دکھائی کے پیسے باندھے بیٹھی ہوں۔ یہ لو اپنی امانت پکڑو۔ شریر بچے گھر میں گھوم رہے ہیں۔ کیا پتا پلو کھول کر پیسے لے اڑیں۔"

جارجٹ کے دوپٹے کی گانٹھ سے پانچ سو کا مڑا تڑا ہوا سا نوٹ انہوں نے چندا کے حوالے کیا تھا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی بھابھی گھر کی ہی تو بات ہے۔"

"ارے عدی کی بیوی ٹوہ میں رہتی ہے۔ جب بھی تمہیں اکیلا دیکھے گی تو ضرور پوچھے گی کہ عارفہ نے تمہاری ہتھیلی پر کیا رکھا۔ تم بھی کہہ دینا ہزار روپے دیے ہیں۔" پاس کھڑی چھوٹی لڑکی کھی کھی کر کے ہنسی تھی۔

"مگر اماں، یہ تو پانچ سو ہیں۔"

اسے زور کا دھموکا پڑا تھا۔ وہ کمر سہلاتے ہوئے پرے ہوئی تھی۔

"جب اپنے ہی دشمن ہوں تو غیروں سے شکایت کیسی۔ بس دلہن تم ناں اس کو یہی بتانا کہ ہزار ہتھیلی پر رکھا ہے۔ عزت کا معاملہ ہے۔ پرائے خاندان کی ہے۔ گود ابھی تک خالی ہے، بس مجھ سے جلتی کڑھتی رہتی ہے۔"

وہ چپکی ہو کر بیٹھی رہی تھی۔ بڑی لڑکی نے چندا کے چمکتے ہوئے سونے کے کڑوں کو دیکھا تھا۔ لہجے میں عجیب سی حسرت اتر آئی تھی۔

"یہ سونے کے ہیں ناں؟"

"جی...... سونے کے ہیں میری اماں کو نانی نے جہیز میں دیے تھے۔ اب میرے حصے میں آ گئے ہیں۔"

وہ دھیرے سے یہ کہہ کر اٹھنے لگی تھی۔ لڑکیاں بھی جھٹ سے کھڑی ہو گئی تھیں۔ تب ہی ہوا کے جھونکے کی طرح یخنی کا بھاپ اڑاتا پیالہ تھامے پنکھم اندر داخل ہوا تھا۔

"یہ لیجیے بھابھی! آپ کی فرمائشی یخنی۔ آپ کے ساتھ ساتھ نئے آنے والے مہمان کو بھی خوب طاقت ملے گی۔"

"پاگل نہ ہو تو۔ جلدی تمہاری بیوی پر بھی وقت آئے گا تب دیکھوں گی تمہیں کہ کیسے اس کے پاؤں دھو دھو کر پیتے ہو۔"

چندا کو دیکھ کر وہ اچانک خاموش ہو گیا تھا۔ چندا نے گہری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ نظروں میں کچھ ایسا تھا کہ پنکھم کو چپ لگ گئی تھی۔

"نہیں بھابھی، ہمارے ہاں مرد باورچی خانے نہیں سنبھالتے۔"

بڑی لڑکی نے لہک کر پوچھا تھا۔ "تو پھر کیا سنبھالتے ہیں؟"

وہ پہلی بار دھیرے سے مسکرائی تھی۔

"ہمارے ہاں مرد خزانے سنبھالتے ہیں۔ تجوریاں سنبھالتے ہیں۔"

گہرے لفظوں کا سحر کمرے میں پھونک کر وہ شان سے باہر نکل گئی تھی۔

تجی بھیا اب ابلا ہوا انڈا نگل رہے تھے۔ اماں پراٹھے پر مربے کی پھانک نکال کر مزے اڑا رہی تھیں۔ دور کمرے میں عدی بھیا نے اسمارہ بھابھی کو منا لیا تھا اور اب چھوٹی چھوٹی برکیوں کے ساتھ انہیں ناشتہ کروا رہے تھے۔

بےچارے پنکھم پر قیامت بیت گئی تھی۔

کسی نے نہیں دیکھا۔ کسی نے نہیں سنا۔

مگر ایک بات تھی۔ دیہات سے آنے والی وہ دلہن اتنی سادہ بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

جس وقت وہ ناشتے کی ٹرے سجا کر اوپر کمرے میں پہنچا تھا۔ تب تقریباً صبح دوپہر میں ڈھلنے والی تھی۔ نئی نویلی دلہن خستہ کھڑکی میں کھڑی اس کی طرف پشت کیے شاید اپنی اماں سے فون پر بات کر رہی تھی۔ نشو کا دوپٹہ فرش پر پڑا تھا، شاید اسے سنبھالنے میں

اسے کوئی وقت پیش آ رہی ہوگی۔

''ارے اماں! کیا بتاؤں آپ کو جیسا سنا تھا اس سے کہیں بڑھ کر پایا ہے۔ ایک ہی دن میں مجھے اپنا گھر گاؤں سب بھول گیا ہے۔ اتنا بڑا شہر ہے۔ بھانت بھانت کے لوگ ہیں۔ الگ الگ کھانے پینے ہیں۔ میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میں دلہن بن کر شہر میں آؤں گی میری طرف سے خاص طور پر بڑے بھیا کا شکریہ ادا کر دیجیے گا کہ انہوں نے میرے لیے اتنا اچھا رشتہ اور شریف شوہر ڈھونڈا۔ مجھے تو بالکل نہیں لگا کہ پہلی بار پرویز سے مل رہی ہوں۔ سچ میں مجھے تو بہت اپنے اپنے سے لگے۔''

ٹشو کے دوپٹے والی نے آنسوؤں کا گلا گھونٹا تھا اور میلوں دور دیہات میں بیٹھی اپنی اماں کو سب اچھا ہونے کی رپورٹ دی تھی۔ ناشتے کے لوازمات کی ٹرے تھامے کھڑا دولہا جیسے اپنی جگہ پر لرز گیا تھا۔ فون بند کر کے وہ دھیرے سے مڑی تھی سامنے ہی وہ کھڑا تھا۔

''کیا لائے ہیں۔ مولی کے پراٹھے؟ کڑک چائے؟''

وہ دھیرے سے اس کا ٹشو کا دوپٹہ اٹھا کر سامنے رکھ رہا تھا۔ چندا نے جھٹ سے دوپٹہ اٹھا کر دوبارہ اوڑھ لیا تھا۔

''نہیں جی۔ اگر آپ کو پسند ہے تو ابھی بنا کر لے آتا ہوں۔''

''تو اس ٹرے میں کیا ہے؟''

وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ کر میز سیٹ کرنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ الماری سے میز پوش نکال کر سجا دیا گیا تھا۔ اب وہ ایک ایک کر کے الماری سے نئے نکور برتن نکال کر چھوٹی سی میز مختلف قسم کے لوازمات سے بھر رہا تھا۔ اسٹیل کے برتن میں لسی۔ مکھن کے پیڑے۔ گڑ والی چائے۔ دیسی گھی کے پراٹھے۔ کھیر کی ٹھوٹھی۔ حلوہ پوری اور چنے بھی۔

چندا کی نظریں پھٹنے کے قریب ہو گئی تھیں۔

''یہ اتنا سارا کچھ کون کھائے گا؟''

''آپ کھائیں گی اور کون کھائے گا؟ جانتا ہوں آپ کے ہاں مکھن لسی سے ناشتہ کیا جاتا ہے۔ میں نہیں چاہتا یہاں آپ کو کھانے پینے کے معاملے میں بھی اجنبیت محسوس ہو۔ اس گھر میں رہنے والے بالکل مختلف رہن سہن کے لوگ ہیں۔ اتنی جلدی سمجھ میں نہیں آتے۔ ان کے بارے میں سوچ کر خود کو مت تھکائیے گا۔''

چندا کو بالکل بھی یقین نہیں تھا کہ اس کے سامنے وہ اتنا لمبا جملہ بولے گا۔ پہلی منزل اور تیسری منزل کی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد شاید یہ انسان کئی روپ بدل لیتا ہوگا۔ مگر پھر بھی سب کے لیے وہ پہیلی ہی تھا۔

''لے جاؤ اپنا یہ ناشتہ۔ کچھ نہیں کھانا مجھے۔''

''کچھ نہیں کھائیں گی تو بیمار پڑ جائیں گی۔''

''میں بیمار پڑوں یا مر جاؤں تمہیں کیا۔''

''آپ نکاح میں ہیں میرے۔ مجھے فکر ہے آپ کی۔''

''باہر بیٹھے ہیں ناں تمہارے سگے۔ جا کر ان کی فکر کرو۔ ان کے ناشتوں کا خیال رکھو۔ ان کے لیے بناؤ مولی کے پراٹھے۔ کڑک چائے اور۔ ہاں یخنی کے پیالے بھی۔''

''آپ کو اچھا نہیں لگا میرا سب کی خدمت کرنا؟''

وہ جیسے رندھے ہوئے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ آج تک اتنے سالوں میں کسی نے بھی اس کی ان خدمات پر سوال نہیں اٹھایا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ہی معمول کے مطابق گھر کے مکینوں کے دل جیتنے کے لیے بچھ بچھ جاتا تھا۔ وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ شاید اب ان کے دل میں تھوڑی سی جگہ مل جائے۔

''سب کو اپنے کام خود کرنے چاہئیں۔ سارے ہٹے کٹے ہیں۔ اپنے کام خود کر سکتے ہیں۔ تم اس گھر کے ملازم نہیں ہو۔ میں نے کسی ملازم سے شادی نہیں کی اور نہ ہی کسی چائے والے ڈھابے پر کام کرنے والے چھوٹے سے۔ جو ہر آنے والے راہگیر کی

خدمات سرانجام دینے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اور خود کو دیکھو۔"

چندا کے اونچی آواز میں چلانے اور متوجہ کرنے پر پہلی بار پرویز نے اپنے آپ کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا تھا۔ سفید قمیص داغ داغ تھی۔ ہاتھوں پر مٹی کے چھینٹے پڑنے کے واضح نشانات موجود تھے۔ اس نے سر کے بال سیدھے کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ مانگ نکالنے میں ناکام رہا تھا۔

"دیکھ لیا...... کیا لگ رہے ہو تم۔ کہیں سے بھی نئے شادی شدہ دولہا نہیں دکھائی دیتے۔ تم سے تو کہیں زیادہ ہمارے ہاں اینٹوں کے بھٹے پر کام کرنے والے مزدور صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ اگر تمہیں اپنا خیال نہیں ہے تو یہ بات اپنے ذہن سے نکال دو کہ یہ ساری دنیا تمہارا خیال رکھے گی۔ تمہارے صاف کپڑوں کا دھیان رکھے گی۔ اور نہ ہی کبھی تمہاری بگڑی ہوئی مانگ سنوارے گی۔"

پرویز شعلہ جوالا بنی دلہن کے سامنے جیسے ڈھیر ہو کر دھب سے فرش پر بیٹھا تھا۔

"میں کسی صلے اور پروا کے لالچ میں یہ سب نہیں کرتا۔ چندا جی......"

"اگر نہیں بھی کرتے تو کرنا چاہیے۔"

چندا کی بات پر وہ جیسے تلخ لہجے کے ساتھ قہقہہ لگانے پر مجبور ہوا تھا۔

"اتنا خود غرض نہیں ہوں میں۔ دوسروں کی مدد کر کے خوشی ملتی ہے مجھے۔ بچپن سے یہی سب کرتا آیا ہوں۔ جو ملا پہن لیا۔ جو چھت ملی وہاں رہ لیا۔ بھوک مٹانے کو چنگیر میں جو پیش کیا گیا وہ صبر شکر کر کے کھا لیا۔"

چندا حیران نظروں سے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھے جاتی تھی جو اس کے شوہر کے رتبے پر فائز تھا۔ وہ منہ موڑے خستہ حال کھڑکی کی طرف دوبارہ رخ کر گئی تھی۔

"تم نے گزار لیا اپنا بچپن۔ اور جوانی بھی۔ صبر شکر کر کے۔ مگر میرے اندر صبر شکر کی کوئی رمق نہیں ہے۔ اور مجھ سے کوئی امید بھی مت رکھنا کہ میں گھر والوں کی خدمتیں کروں گی اور جواب میں وہ مجھ سے تمہاری طرح سوتیلوں جیسا سلوک کریں گے۔"

پکلم نے بھیگی ہواؤں کا راز جان لیا تھا۔ پکلم کی دلہن دھاڑنے اور چلانے کے بعد شاید اب رو رہی تھی۔ بے چاری دل کی اتنی بری بھی نظر نہیں آتی تھی۔ شادی کے پہلے دن کی شروعات اس نے بھی کہاں ایسی سوچی ہو گی۔ لڑکیوں کے بھی تو شادی شدہ زندگی کو لے کر بہت سارے خواب ہوتے ہیں۔ اور کون جانے کب یہ ٹوٹ کر بکھر جائیں۔

"سوتیلا ہی تو ہوں۔ تب ہی تو سوتیلوں جیسا سلوک بھی سہہ لیتا ہوں۔"

پرویز عرف پکلم دھیرے سے یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا تھا۔ چندا سکتے میں تھی۔ ناشتے کی میز دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی دولہا بھی جیسا دکھائی دیتا تھا ویسا ہرگز بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

چاند کے جیسی چندا گھر بھر کی لاڈلی تو تھی ہی مگر ساتھ ہی ساتھ وہ دیہات بھر کی بھی لاڈلی بن گئی تھی۔

ابا کی شان، جان اور مان تھی۔ صاف گو اور منہ پھٹ تو بلا کی تھی اور جب سے پرائیویٹ بی اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا تو سمجھو ایک کلغی سج گئی تھی۔ بڑے بھیا بھی شہری بابو تھے اور شہر میں پڑھ لکھ کر تو ان کی ٹور ہی بدل گئی تھی۔ دیہات کے لوگوں سے مزاج میل نہ کھاتا تھا اور ہر بات میں کیڑے نکالنے کی عادت پڑ گئی تھی اور اسی بھیا کی بھلائی کے لیے چندا ہر کسی سے دکھ سکھ کر لیتی تھی اور میٹھے شہد جیسے بول بولتی تھی۔

"اماں سمجھائیں بھیا کو، ابھی سے اپنے آپ کو لاٹ صاحب سمجھنے لگے ہیں اور باقی سب کو کیڑے مکوڑے۔ سننے میں آیا ہے کہ کل شرفو کے گلاس سے پانی پینے سے بھی انکار کر دیا وہ بے چارہ دھو کر نلکے سے ٹھنڈا پانی بھر کر لایا تھا۔"

اماں کو اکلوتے بھیا بڑے عزیز تھے تب ہی ان

کی بہت ساری شکایتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتی تھیں۔

"ارے مردذات ہے۔ شہری لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔ جب کھانا پینا اور پہننا وہ ایک جیسا ہو جائے تو کچھ نہ کچھ فرق پڑ جاتا ہے۔" وہ تن فن کرتی ہوئی اماں کے مقابل آجایا کرتی تھی۔

"کپڑوں میں کلف آجائے تو خیر ہے اماں مگر جو گلے میں کلف سجائے پھرتے ہیں اور دوسروں کو اپنی میٹھی مصری زبان سے گاجر مولی کی طرح کترتے پھرتے ہیں ناں۔ یہ غلط ہے۔"

"ارے چندا، کہاں سے آتی ہیں تجھے اتنی ڈھیر ساری باتیں۔ کہاں سے سیکھتی ہے یہ سب۔"

"بی اے پاس ہوں اور ایم اے پرائیویٹ کا داخلہ بھی بھیجنے لگی ہوں۔ مجھے اتنا سیدھا سمجھنے کی کوشش نہ کریں آپ۔"

چندا کی ایم اے میں داخلے کی خبر اڑتی ہوئی بھیا تک بھی پہنچ گئی تھی اور وہ تن فن کرتے ہوئے آئے تھے۔

"جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا۔ اب گھر بسانے کی کرو۔"

وہ بھی آگے سے شیرنی تھی۔ وہ بھلا کسی سے ڈرتی تھی۔ کبھی بھی نہیں۔ سچی کھری ایسے ہی تو نہیں کہتی تھی خود کو۔ ماں جائے کے سامنے بھی ڈٹ گئی تھی۔

"تمہیں جلدی پڑی ہے تو بسا لو گھر۔ میں تو ایم اے کروں گی۔ ماسٹرنی لگوں گی۔ ابا سے بھی وعدہ لے لیا ہے میں نے اب تو۔"

حقہ گڑگڑاتے ابا کے سامنے وہ تلوار بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ دور چولہے پر اماں اس کے فرمائشی پکوان بنانے میں مگن نظر آتی تھیں۔

"کس کی شہ پر اچھل رہی ہے چندا۔ لگام ڈالیں اسے۔ چڑھ چڑھ کر آرہی ہے۔ اور آپ کیوں طرف داری کر رہے ہیں اس کی۔"

ابا نے دھوئیں کے مرغولے سے سر اٹھا کر جگمگ کرتی آنکھوں والی کو دیکھا تھا۔

"چل ہٹ دھی ہے میری۔ اس کی طرف داری نہیں کروں گا تو کیا لوگوں کی کروں گا۔ اور لگام تو تجھے ڈالنی چاہیے گدھا گھوڑا کہیں کا۔ دھیوں کے تو ساتھ کھڑا ہوا جاتا ہے۔ دھیوں کا تو ساتھ دیا جاتا ہے۔ خبردار جو آئندہ کبھی اس کی شکایت بھی لے کر آیا تو۔"

وہ پالس کی طرح تن کر پھرتی رہی تھی اور ادھر سے داخلہ بھی ہو گیا تھا۔ شہر پرچے دینے جاتی تھی تو دیہات کی ساری سکھی سہیلیوں کے لیے تحفے لاتی تھی۔ سہیلیاں بھی صدقے واری جاتی تھیں۔

"قسم سے چندا۔ تیرے جیسی سہیلی تو اللہ سب کو دے۔"

"مجھے لگا تھا تو میرا ہار بھول آئے گی۔ مگر تو تو سب یاد رکھتی ہے۔"

"میں تمہارے رشتے کی دعا بھی اپنے ساتھ ساتھ مانگ لیا کرتی ہوں۔"

سب سے دعائیں بٹورنے والی چندا کے اچھے دن، تب ختم ہوئے تھے جب بھیا نے گھر میں پسند کی شادی کا فساد ڈال دیا تھا۔

"غزالہ نام ہے۔ میرے ساتھ پڑھتی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔"

اماں نے ابا کو دیکھا تھا اور ابا نے برآمدے کے پلر کے ساتھ لگی کھڑی چندا کو۔

"جس گھر میں دھی ابھی کنواری بیٹھی ہو۔ وہاں کے مرد اپنی پسند کی شادی پہلے رچانے کو تیار نہیں بیٹھے ہوتے۔" بھیا نے گھور کر پلر کی ٹیک لینے والی کو دیکھا تھا۔

"اس کا کیا ہے۔ میرے شہر میں اتنے جاننے والے ہیں۔ کبھی بھی اچھی جگہ رشتہ ہو جائے گا چندا کا آپ اس کی فکر چھوڑ دیں۔"

وہ رات اسی خوشی میں جیسے تیسے کٹ گئی تھی۔ مگر ابا بہت چپ چپ رہنے لگے تھے۔ اماں اور چندا کو بھیا نے غزالہ کی فوٹو بھی دکھائی تھیں۔ فوٹو والی دکھنے میں کوئی اپسرا جیسی نظر آتی تھی۔

"اماں، یہ تو بہت سوہنی ہے۔ ذرا اس کے ماتھے کا بندی ٹیکہ تو دیکھو۔ لگتا ہے کسی گھر کی شادی میں فوٹو لی ہوگی۔"

وہ تو بعد میں پتا چلا تھا کہ یہ فوٹو تو بھیا اور غزالہ کی اپنی ہی شادی کی تھی۔ جو چوری چھپے پتا نہیں کب کی ہو چکی تھی۔ ابا کو خفیہ ذرائع سے خبر مل گئی تھی۔ اور انہوں نے دھکے دے کر بھیا کو گھر سے باہر کر دیا تھا۔

"خبردار جو آج کے بعد تو نے میرے ویڑھے میں قدم بھی رکھا۔ چندا کی بھی شادی کی عمر ہے۔ وہ فرض بھی پورا کرنا ہے مجھے۔ تم نے کون سا بھائی ہونے کا فرض ادا کیا ہے۔"

ابا اور بھیا میں خوب منہ ماری ہوئی اور پھر بھیا اماں سے کچھ پیسے چپکے سے لے کر اپنا بڑا بیگ سنبھالے دہلیز پار کر گئے تھے اور جاتے جاتے اعلان کر گئے تھے۔

"آج کے بعد شرافت آپ کے لیے مر گیا۔"

رشتے کے کاغذوں میں بھیا تو پھر بھی زندہ رہے، مگر ابا اگلے روشن دن کی ٹھنڈی شام میں دنیا اندھیر کر کے چل بسے تھے۔

وہ ٹکر ٹکر انہیں دیکھتی رہی تھی اور جب بھیا اور بھابھی کے توسط سے شہری رشتہ آیا تو اسے رخصت کر دیا گیا۔

دیہات بھر میں بھیا نے ایک ایک کو پکڑ کر بتایا تھا کہ چندا کے سسرال والوں کی قدیم خاندانی حویلی ہے۔ سسرالی آباؤ اجداد پرانے وقتوں کے رئیس اور امیر کبیر تھے۔ جو وراثت میں حویلیاں پلاٹ باغ اور فیکٹریاں چھوڑ کر مرے ہیں۔

دنیا اش اش کر اٹھی تھی۔ چندا کو خوش قسمت تصور کیا گیا تھا۔ تن فن کرنے والی اور سینہ سپر ہو جانے والی چندا کو اپنا ایم اے بھی بھول گیا تھا۔ یاد رہا تو بس اتنا کہ چندا کی شادی اور چندا کے فرض کی فکر ابا کو لے ڈوبی تھی۔

اور بیٹیاں اپنے ماں باپ کو اگلے جہان میں بھی کہاں فکر کا شکار ہونے دے سکتی ہیں۔ تب ہی تو وہ اس بھرے پرے انجان شہر میں دلہن بن کر آ گئی تھی کہ رشتوں کا لگایا گیا زخم اندر ہی اندر رسنے لگا تھا۔

معاشرے کی نظروں میں پرویز عرف پکھم اچھا کے لیے عمر بھر کا داغ تھا۔

مگر...... کہا تھا ناں...... چندا جیسی نظر آتی تھی ویسے کبھی تھی ہی نہیں۔ سارے گاؤں والے کہتے تھے کہ چندا کے ابا نے بنجر زمینوں کو زرخیز کیا تھا۔ وہ بھی ابا کی بیٹی تھی۔ کچھ تو ہنر اسے بھی میسر آ ہی گیا تھا۔

☆☆☆

شہر کے مرکز میں موجود اس حویلی میں پکھم کو تب لایا گیا جب وہ صرف چار سال کا تھا۔ حویلی میں اس کا خیر مقدم طعنوں تشنوں اور بے شمار بد دعاؤں کے ساتھ کیا گیا تھا کیونکہ اس کے ابا نے، حویلی والوں کے خلاف جا کر اس کی ماں سے شادی کی تھی۔ تب سے لے کر آج تک وہ بے چارہ اکیلا ہی اس شادی کا بھگتان بھگت رہا تھا۔

اپنی سگی ماں تو ٹی بی کا شکار ہو کر دنیا سے چل بسی تھی اور ابا بھی کچھ عرصے بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یوں پکھم کے لیے ساری دنیا سوتیلی ہو گئی تھی۔ حالات بھی۔ وقت بھی۔ حویلی میں اس کی اہمیت ایک ملازم سے بڑھ کر نہیں تھی۔ دوسروں کی اترن پہنتے پہنتے وہ جوان ہوا تھا۔ گھر کا سارا کام صرف اس کے ذمے تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ حویلی کے مکینوں کی ضرورت بنتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ باورچی خانہ سے لے کر گھر داری کے سارے معاملات وہی سنبھالے گا۔ اپنی ذمہ داریوں سے جان چھڑانے کے لیے حویلی کی خواتین نے اپنے سارے ہنر پکھم کو دان کر دیے تھے۔ گھر بھر کے سارے میلے کچیلے کپڑے دھونے سے لے کر مردوں کے کپڑوں کو کلف لگانے تک کی ذمہ داری بھی پکھم کے سر پڑ گئی۔

ساگ سبزی سے لے کر دال دلیہ اور دال دلیہ سے لے کر تہاری تک بھی وہی بنایا کرتا تھا۔ رات کے آخری وقت میں بھی وہ سب گھر والوں کے

لیے کوئلوں والی استری کے ساتھ مصروف نظر آتا تھا۔ ویسے تو ساری حویلی ہی خستہ حال تھی مگر حویلی کی تیسری منزل کو ایک خاص اعزاز حاصل تھا۔ جہاں چوہوں اور چھپکلیوں کی بہتات تھی۔ ان سے چھٹکارا پانے کے لیے اسے بہت مدت درکار تھی۔ ساون کے موسم میں ویسے تو ساری حویلی ہی جھیل سمندر ہو جاتی تھی مگر پاگلم کی تیسری منزل بھی دریاؤں کا منظر پیش کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بے وقت کی بارشوں نے پاگلم کی صحت پر کافی اثر دکھایا اور وہ نمونیا کا شکار ہو گیا۔

حویلی والوں کو پاگلم کی صحت یابی سے چنداں غرض نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ محلے کی نائن کے بتائے گئے ٹوٹکوں سے وہ صحت یاب ہو گیا۔ سولہ سال کی عمر میں بھی وہ اماں کے گھونسے اور مکے کھاتا رہا۔ عدی اور فہمی بھیا نے بھی گھریلو معاملات کے تناؤ اور باہر کی پریشانیوں کو کم کرنے کے لیے ہمیشہ اسی کو تختہ مشق بنایا۔

گھر کے بڑوں کے ساتھ ساتھ گھر کے بچوں نے بھی پگلم کو خوب زچ کیا۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں ماں باپ کے جانے کے بعد ساری دنیا مل کر سوتیلوں جیسا ہی سلوک کیا کرتی ہے۔ انسان تو شاید خطا کا پتلا ہو سکتا ہے اور اسے معافی بھی مل جاتی ہے۔ مگر سوتیلے رشتے اور ان کی غلطیاں کبھی معاف نہیں ہوتیں۔ دنیا سے جاتے جاتے، ابا نے اگر کوئی نیکی کا کام کیا تھا تو وہ یہ تھا کہ یہ خستہ حال حویلی تینوں بھائیوں کے نام کر گئے تھے۔ شاید ایک وجہ یہ بھی تھی جس کی وجہ سے حویلی کے مکین پرویز کو برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

مشقت کی چکی کاٹتے ہوئے یونہی، سال گزر گئے اور پتا نہیں کیسے گھر میں ایک بھونچال آیا کہ پگلم کی شادی ہو رہی ہے۔ سننے والوں نے سنا اور حیرت کا اظہار کیا کہ اس پاگل اور دیوانے کے لیے کون سی لڑکی کے نصیب پھوٹنے والے ہیں؟

ابا کے ایک پرانے جاننے والے دوست کی وساطت سے یہ رشتہ طے پایا اور کافی غور و خوض کے بعد یہ رشتہ منظور کر لیا گیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ چاند کے جیسی چندا اور دیوانوں جیسا پگلم نکاح جیسے مبارک اور حسین بندھن میں بندھ گئے۔ کون جانے کب دنیا سوتیلی سے ہٹ کر اپنی ہو جائے؟

کون جانے خود غرض رشتوں کا شکار ہونے والوں پر قدرت مہربان ہو جائے؟

☆☆☆

پرویز کو اتنی ساری باتیں سنانے کے بعد چندا کو بعد میں احساس ہوا تھا کہ وہ اس کا مجازی خدا تھا۔ اس کا پرویز کے ساتھ احترام کا رشتہ تھا۔ بھیا کی طرف سے ہونے والی غداری اور حویلی کی ساری صورت حال نے اس کے اندر زہر بھر دیا تھا۔ ان ہی باتوں کو سوچتے ہوئے اور دعائیں پڑھتے ہوئے جب وہ سیڑھیوں سے نچلی منزل کی طرف آئی تھی تو اسے پتا چلا تھا کہ عارفہ بھابھی کا وقت قریب آ گیا تھا اور انہیں جلد از جلد ہسپتال لے جایا گیا تھا۔ عدی بھیا اور پگلم انہیں ایمبولینس میں لے گئے تھے جبکہ زچہ کے شوہر وہیں صحن میں چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اماں بھی تسبیح لیے تخت پر بیٹھی کوئی وظیفہ کر رہی تھیں۔

”اللہ کرے اس بار عارفہ ہمیں وارث دے دے۔ ورنہ پہلے ہی میرا بیٹا دو لڑکیاں پال پوس کر خود بڈھا ہو گیا ہے۔“

چندا کی نظر دروازے میں کھڑی دونوں لڑکیوں پر پڑی تھی۔ کچھ دیر پہلے والی شرارت اور شگفتگی کہیں غائب ہو چکی تھی۔ اب آنے والے لمحات کا خوف ان کے چہرے پر واضح تھا۔ تب ہی وہاں پر اسارہ بھابھی آ کھڑی ہوئی تھیں۔ شوخ رنگ کی لپ اسٹک اور نیا جوڑا پہنے وہ بالکل مطمئن نظر آ رہی تھیں۔

”سچی بات ہے اماں، مجھے تو لگتا ہے کہ اس بار بھی عارفہ کے ہاں لڑکی ہی ہو گی۔“

”زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بھی اس صورت میں کہ تم نے ابھی تک لڑکا تو کیا چوہے کا بچہ نہیں جنا۔ بڑی آئیں بددعا دینے والی۔“

digest.library.com

"بھئی میں تو سچی اور کھری بات کہتی ہوں۔ انسان کی نیت اس کے آڑے آجاتی ہے۔ اگر آپ نے پکلم کے ساتھ اچھا سلوک کیا ہوتا تو اللہ کبھی بھی حویلی کو وارث سے محروم نہ رکھتا۔"

"ارے جاؤ جاؤ۔ بڑی آئی ملانی بی بی اور وہ بھی ہمیں سمجھانے والی۔ جاؤ لڑکیوں دلہن کے ساتھ جا کر باورچی خانہ دیکھو۔"

لڑکیوں نے جھجک کر دلہن کو دیکھا تھا جو سر ہلاتی ہوئی دونوں کو اشارہ کرتے ہوئے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

اسمارہ نے ایک فلک بوس قہقہہ لگایا تھا۔

"ویسے سچی بات ہے اماں! آپ نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔ اب تو آپ کو ملازم کے ساتھ ملازمہ کی بھی خدمات میسر آئیں گی۔"

قہقہہ اور الفاظ بغیر کسی رکاوٹ کے باورچی خانے تک پہنچ گئے تھے۔ آٹا نکالتے ہوئے دلہن کے ہاتھ رک گئے تھے۔ لڑکیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

"آپ ان کی بات کا برا نہ مانیے گا وہ شروع سے ہی ایسی ہی ہیں۔ ڈرامے باز اور فنکار۔"

چندا نے مڑ کر ان کے نفرت بھرے لہجے پر سرزنش کرنے والے انداز میں ٹوکا تھا۔

"بڑی ہیں تم سے...... ان کے بارے میں ایسے بات مت کرو۔"

"حیرت ہے۔ آپ کے بارے میں وہ اتنی بری بات کہہ گئی ہیں یہاں تک کہ آپ کو ملازمہ بنا دیا ہے۔ اور آپ ابھی بھی ان کے لیے بول رہی ہیں۔"

"بڑوں کی باتوں کو درگزر کر دیتے ہیں۔"

"چاہے وہ کچھ بھی کہیں کچھ بھی کریں؟"

پانی کی دھار سے آٹا گیلا ہونے لگا تھا۔ اور کہیں کہیں دل بھی۔

"ہاں چاہے وہ کچھ بھی کہیں۔ وہ کچھ بھی کریں۔ اس کا اجر ہمیں زندگی میں ان سے نہیں ملتا لیکن آخرت میں اللہ ہمیں اس چیز کا اجر ضرور دے گا۔" دونوں لڑکیوں نے متاثر ہو کر دلہن کو دیکھا تھا۔ ایسی اچھی اور پیاری باتیں تو حویلی میں کوئی بھی نہیں کرتا تھا۔

"آپ کتنی پیاری باتیں کرتی ہیں ناں دلہن۔"

وہ تینوں ایندھن جلاتے ہوئے اور روٹیاں پکاتے ہوئے ہنستی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اماں کے بین سے درودیوار لرز گئے۔

"تیرا ککھ نہ رہے عارفہ۔ تو نے حویلی کو اس بار بھی وارث نہیں دیا۔ میں کہے دیتی ہوں کہ خبردار جو عارفہ نے اب قدم بھی رکھا۔"

رات بھاری تھی۔ رات کالی تھی۔ مجی بھیا دروازے کو ٹھوکریں مارتے ہوئے باہر نکل گئے اور صبح سے ذرا دیر پہلے پکلم اکیلا، ننھے وجود کو سینے سے لگائے اور عارفہ کو سنبھالے گھر آیا تھا۔ جبکہ عدی بھیا بچے کی ولادت کے فوراً بعد چراغ کے جن کی طرح اسمارہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے تھے۔ تیسری منزل میں چندا نے دونوں لڑکیوں کے ساتھ، رات آنکھوں میں کاٹی تھی۔

لڑکیوں کے ساتھ چندا نے جب عارفہ کے کمرے میں قدم رکھا تھا تو عارفہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے سوتی بن گئی تھیں۔

دونوں لڑکیاں سہمی ہوئی ماں کے دائیں بائیں بیٹھ گئی تھیں۔ چندا نے آگے بڑھ کر پرویز سے وہ ننھا وجود تھام لیا تھا۔

وہ چھوٹا سا ننھا وجود جیسے کسی جگنو کی طرح جگمگ کر رہا تھا۔ موٹی موٹی آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیر شرارت تھی۔ وہ اپنا انگوٹھا چوس رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے کاجل نے چندا کو حیران کیا تھا۔ چندا نے حیرت سے پکلم سے پوچھا تھا۔

"یہ کاجل کیسے......؟"

پکلم گڑبڑایا تھا اور اپنی جیب سے کاجل کی ڈبیا اور چھوٹی سی شہد کی بوتل نکالی تھی۔

"جی وہ میں لے کر گیا تھا۔ شہد اور کاجل۔ مجھے پتا تھا ہسپتال میں ضرورت پڑے گی۔ اور آپ کو پتا

گڑیا کو میں نے گھٹی دی ہے اور اس کے کان میں اذان بھی دی ہے۔ اذان سنتے ہوئے اتنی پرسکون اور پیاری لگ رہی تھی ہماری بیٹی۔"

"کون کہتا تھا وہ پاگل تھا؟ کون کہتا تھا وہ اکیلا تھا؟ کون کہتا تھا وہ لاوارث تھا؟"

چندا کو پہلی بار پرویز عرف پگلم کائنات جیسے لگا تھا۔

دونوں لڑکیاں چندا کے اشارے پر جھجکتے ہوئے اپنی چھوٹی بہن کی طرف آئی تھیں۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"کتنی پیاری ہے یہ۔ ہم دونوں سے بھی زیادہ۔"

دونوں نے پگلم کے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔

"بہت شکریہ چاچو آپ کا۔ اگر آپ نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔"

آنسو چھپاتا ہوا دیوانوں سا پگلم کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ لڑکیوں نے گڑیا کو سنبھال لیا اور چندا ہولے ہولے چلتی ہوئی عارفہ کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ اس کے کمزور ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ یہی وہی عورت تھی جس سے کل اسے ابکائیاں آرہی تھیں۔ پتا نہیں کچھ لمحوں میں ایسا کیا ہوا تھا کہ بستر پر نیند کا ڈرامہ کرنے کی کوشش کرتی ہوئی وہ ماں اسے بہت عظیم لگی تھی۔

"میں جانتی ہوں جاگ رہی ہیں آپ۔ اللہ کے فیصلے پر یقین رکھیں۔ بیٹیاں رحمت ہوتی ہیں۔ انہیں آپ کی ضرورت ہے۔ اور آپ کو ان کی۔ بہت بدقسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو بیٹیوں کی پیدائش پر مین کرتے ہیں۔ رونا ڈالتے ہیں۔ آپ کو پتا ہے۔ جب میں پیدا ہوئی تھی تو میرے ابا نے پورے گاؤں میں مٹھائیاں بانٹی تھیں۔ آج مجھے اپنے ابا یاد آگئے۔ ہم بھی آج گڑیا کی خوشی میں مٹھائی بانٹتے ہیں۔"

☆☆☆

نئی دلہن نے عارفہ کے کل کے دیے ہوئے پانچ سو سے مٹھائی منگوائی تھی۔ عارفہ نے پہلی بار اس گھر میں بیٹیوں کی پیدائش پر کسی کو خوش ہوتے دیکھا تھا۔ انہیں جیسے پرویز کے نصیب پر رشک ہوا تھا۔ پرویز نے بھی ان کی خاطر میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ گرائپ واٹر سے لے کر جنگ تک انتظام کر لیا تھا۔ اماں نے مڑ کر بھی عارفہ اور بچی کی خبر نہیں لی تھی۔

اگلے دن کی شام، مسہری مرمت ہو کر آ گئی تھی اور چندا مسہری پر بیٹھی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ جب پرویز نے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گھر بھر کے استری کرنے والے کپڑوں کا ڈھیر تھا۔ فرش پر کھیس پھیلائے وہ مصروف نظر آتا تھا۔ چندا نے اس کی اس مصروفیت کو خشمگیں نظروں سے دیکھا تھا۔ کسی کام سے جیسے ہی وہ باہر گیا تھا چندا نے جلتی ہوئی استری سامنے پڑے اسمارہ کے کپڑوں پر رکھ دی تھی اور اس کے بعد آنے والے طوفان کو سارے محلے نے دیکھا تھا۔

پگلم صحن کے بیچوں بیچ اسمارہ اور عدی کے عتاب کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ جب تک چندا نیچے پہنچی تھی عدی اسے ایک تھپڑ رسید کر چکا تھا۔

"تمہاری جرأت کیسے ہوئی۔ اسمارہ کے کپڑے جلانے کی۔ تم نے اور تمہاری بیوی نے کبھی دیکھے ہیں اتنے مہنگے کپڑے۔ کھدر ٹاٹ پہننے والوں کو کیا پتا۔"

اسمارہ نے آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

"سب جانتی ہوں میں...... کیوں اتنے پر پرزے نکل رہے ہیں تمہارے۔ بیوی کیا آ گئی لگتا ہے تم اپنی ساری ذمہ داریاں بھول گئے۔ ایک بات یاد رکھنا، اس گھر کے لیے تم ایک ملازم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اور نہ ہی تمہاری بیوی۔ جس طرح تم لاوارث ہو اسی طرح تمہاری دلہن بھی...... جس کا پتا لینے کے لیے میکے سے کسی نے بھی آنا گوارا نہیں کیا۔"

اس گھر کے مکین وار کرنے میں طاق تھے، کب کب کہاں اور کیسے کسی کو توڑنا ہے۔ چندا جیسے ڈھے گئی تھی۔

ماں جائے نے اسے دیس سے نکالا دیا تھا۔ اور جس کے ساتھ نصیب جڑا تھا وہ بھی کسی کھاتے میں نہیں تھا۔ وہ تیسری منزل پر آ کر گھٹ گھٹ کر روتی رہی تھی۔ زندگی کا یہ رنگ روپ تو اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ کیا انسان ایسے بھی ہوتے ہیں۔ اور کیا رشتوں کی یہ قسم بھی دنیا میں پائی جاتی ہے؟ شاید وہ اور پکلم ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ اب ان پر تھا کہ کشتی چلانے کا ہنر سیکھتے یا پھر خود کو پانیوں کے حوالے کر دیتے۔

☆☆☆

سسرال کی دنیا بھی جیسے بہت عجیب و غریب تھی دیکھو تو یوں لگتا تھا، جیسے کسی فلم کا سیٹ ہو جہاں ہر ہر لمحہ ایک نیا سین پرانے کی جگہ لے لیتا ہے۔ اور سیٹ کے بعد دیگرے مختلف چہروں کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اور اسی طرح جذبات بھی بدل جاتے ہیں۔

گھر کی اس دنیا میں وہ کہیں گم ہوتی چلی گئی تھی۔ تیسری منزل کے کمرے میں وہ لایعنی سوچوں میں جتلا، مرمت شدہ مسہری پر ڈر ڈر کر کروٹیں بدلتی رہتی تھی کہ اب گرا کہ تب گرا اور مسہری پھر سے مریض ہو جائے۔

پرویز سے بات چیت بھی بس ہوں ہاں تک تھی۔ چھوٹی اور بڑی لڑکیاں کبھی کبھار نمکو، پاپڑ لے کر اس کے پاس آ جاتی تھیں۔ ان کی عمر کے مطابق ان کے پاس کرنے کو سینکڑوں باتیں تھیں۔ ادھر ادھر کے معاشقوں کی، ٹوٹے بکھرے گھروں کی، آنے والی زندگی کے حسین خوابوں کی۔

چھوٹی گڑیا کو اسارہ بھابھی نے ویسے تو نظر بھر کر بھی نہ دیکھا تھا، بلکہ انہیں عارفہ سے شکایتوں کے دفتر ہی تھے۔ عدی بھیا کے کانوں میں منمناتی رہتی تھیں۔

"اماں نے اس کی وجہ سے مجھے بانجھ ہونے کا طعنہ دیا ہے۔ حالانکہ وارث تو وہ بھی انہیں نہیں دے پائی۔"

"اماں جذباتی ہو جاتی ہیں تو کچھ بھی کہہ جاتی ہیں۔ بس تم دل پر مت لیا کرو۔"

اسارہ تو ہمیشہ سے وہی کرتی ہوئی آ رہی تھی جس چیز سے منع کیا جاتا تھا، دل سے ساری باتیں لگائی تھی اور عدی بھیا پیچھے پیچھے پھرا کرتے تھے۔

اسارہ کی پراندہ لہراتے ہوئے ٹور ہی بدل جایا کرتی تھی۔

عارفہ کو جی بھر کر تاؤ آتا اور وہ اپنے جلے دل کے سارے پھپھولے چندا کے سامنے پھوڑتی تھیں۔

"ذرا دیکھو تو ان دونوں کے چھچھن۔ شرم و حیا چھو کر بھی نہیں گزری۔ گھر میں جوان ہوتی ہوئی بچیاں ہیں مگر ان کی دل پشوریاں نہیں ختم ہوتیں۔ اگر کرنی بھی ہیں تو تم اور پکلم کرتے اچھے بھی لگو کہ نیا نویلا جوڑا ہو۔"

دل پشوریوں کی بات پر جیسے وہ ایک پل کے لیے چونک گئی تھی اور پھر سر جھٹک دیا تھا۔

"چھوڑیں بھابھی...... میرے نصیب میں ایسا ہی مرد لکھا ہے۔ ابھی ککر پر پائے چڑھا کر باہر اماں کے قہوے کے لیے گڑ لینے گیا ہے۔ کپڑوں کا ڈھیر دھویا اور شام کو وہیں بیٹھ کر استری کرے گا۔ میں نے تو ساری زندگی میں بھی ایسی مرد ذات نہیں دیکھی۔"

گڑیا کی چوٹی ٹھیک کرتی ہوئی عارفہ نے یاسیت کی لپیٹ میں جاتی ہوئی دلہن کو غور سے دیکھا تھا۔ آنکھوں میں مٹا مٹا سا کاجل تھا۔ ہتھیلیوں پر حنا کے رنگ کمزور پڑنے لگے تھے۔

عارفہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"ذرا میری طرف دیکھو۔"

اس نے بس دیکھا تھا اور انہوں نے آن کی آن میں کاجل کی سلائی اس کی آنکھوں میں پھیر دی تھی۔

"اپنی آنکھیں کاجل سے خالی نہ رکھا کرو۔ عورت کو اپنے مرد کے لیے بجنا سنورنا چاہیے۔" دوپٹے کے پلو سے پھیلے کاجل کے کنارے صاف کرتی چندا جیسے ٹھٹک سی گئی تھی۔

"پھر تو مرد کو بھی عورت کے لیے بجنا سنورنا

چاہیے ناں۔ اچھے اچھے کپڑے پہنے خوشبو لگائے۔ کلف والی کاٹن پہنے۔ رعب جمائے اور بھی بہت کچھ جو "مرد" ہلیز پر آ کر ٹھہر گیا تھا۔ نظریں اپنے کپڑوں پر اٹک گئیں۔

رف سا پرانا کھدر کا سوٹ۔ پیروں میں قینچی والی عدی بھیا کی چپل۔ ہاتھوں میں گھریلو ضروریات کے سامان کا ڈھیر۔

وہ عارفہ کے کمرے سے کھٹ سے نکلی تو سامنے بت بنے شوہر نامدار کو دیکھ کر رک سی گئی تھی۔ دونوں کی دن کے اجالے میں آنکھیں چار ہوتی تھیں تو دونوں ہی ہڑبڑا کر ادھر ادھر ہو جایا کرتے تھے۔ اب کی بار بھی یہی ہوا تھا۔

پچھلے کئی دنوں سے اماں گاؤں چکر لگانے کے اصرار پر مصر تھیں اور اس نے جانے کی ٹھان لی تھی۔ ساس صاحبہ کسی محلے کی عورت کے ساتھ ادھر کی ادھر اڑانے میں مصروف تھیں، جب وہ ان کے سر پر جا کھڑی ہوئی تھی۔

"کل میں اور پرویز میرے میکے جا رہے ہیں۔"

پاندان سے چھالیہ نکالتا ہوا ہاتھ واپس نہیں آیا تھا۔ جیسے پاندان نے غڑاپ سے نگل لیا تھا۔

"ارے۔ ایسے کیسے چل دیئے۔ نہ اجازت نہ پوچھ پریت۔ یہ چلا گیا تو گھر کا سارا انتظام کون دیکھے گا؟"

"ہماری طرف رسم ہے، لازمی جانا پڑتا ہے۔ اب میں اکیلی تو نہیں جا سکتی ناں۔"

"ارے میں بچی کو کہوں گی تمہیں بس پر بٹھا دے گا۔ کچھ ہی گھنٹوں میں اماں کے پاس صحیح سلامت پہنچ جاؤ گی۔"

وہ غصے سے جیسے بھنا کر رہ گئی تھی اور بگڑ کر باورچی خانے میں پہنچی تھی، جہاں سلیب پر چاولوں کا ڈھیر چنتا ہوا وہ کافی مصروف دکھائی دیتا تھا۔ چاول نہیں جیسے موتی چننے کی ڈیوٹی کرنے میں مصروف تھا۔

"ہم کل جا رہے ہیں۔"

"اچھا کہاں......؟"

"میرے میکے اور تمہاری سسرال۔"

چاول بھول گئے تھے۔ وہ حیرانی سے مڑا تھا۔

"میں کیوں جاؤں گا بھلا ...... میری کیا ضرورت ہے۔"

"ٹھیک ہے پھر میں بھی اماں کو منع کر دیتی ہوں کہ ساس اماں کے دباؤ میں آ کر آپ کے داماد صاحب تشریف لانے سے معذرت کر رہے ہیں۔"

پرویز کو پریشانیوں میں مبتلا کر کے وہ کھسک گئی تھی مگر شام تک لاوا پھٹ چکا تھا۔

آخر کچھ سوچ کر بچی اور عدی بھیا نے بیچ میں پڑ کر اماں کا غصہ بھی ٹھنڈا کر دیا تھا۔

"جانے دیں اماں اب وہ بیوی والا ہے۔ نئے خاندان سے رشتہ جڑا ہے اس کا۔ پھر روز روز جانا تھوڑی ہو گا۔ نیا نیا شوق ہے پھر ہماری طرح مسرت اور مرگ کے موقع پر ہی جانا ہو گا۔"

بیچ بچاؤ کے بعد پکلم کے نئے کپڑے سلنے کے لیے گلی کی نکڑ پر موجود درزی کو دیئے گئے۔ زلف تراش سے بالوں کی تراش خراش بھی کروائی گئی۔ وہ بھی نئے سرے سے قریبی پارلر سے مہندی لگوا آئی تھی اور نیا سوٹ بھی منٹوں میں دستیاب ہو گیا۔

گھر بھر پر یہ راز کھلا تھا کہ دلہن جیسی دکھائی دیتی تھی ویسے تو بالکل بھی نہیں تھی۔ گھنی میسنی سی نظر تھی۔

اہتمام کے ساتھ، وہ دونوں اماں کے گھر پہنچ گئے تھے۔ جاڑے کے دن تھے اور صبح سے لے کر شام تک ٹھنڈی دھوپ رہتی تھی۔ کھلا وسیع و عریض صحن تھا۔ آنگن میں ابھی تک کھجور اور دھریک کے درخت کھڑے تھے جن پر موسمی پرندوں کے جھرمٹ آ کر بیٹھ جاتے تھے۔

اماں اور غزالہ بھابھی نے ان دونوں کا استقبال کیا تھا اور انہیں رنگ دار پایوں والی چارپائیوں پر بٹھایا تھا۔ اماں نے پرویز کا ماتھا چوما تھا تو وہ عجیب احساس میں گھر کر، وقفے وقفے سے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر جیسے وہ لمس محسوس کر کے خود ہی چپکے چپکے

digest library.com

ہنس دیتا تھا۔

وہ اماں کے پاس چولہے کی راکھ پھرولنے آ گئی تھی۔ یہ شروع سے ہی اس کی عادت رہی تھی کہ جب بھی اماں کچھ کاڑھ رہی ہوتی تھیں تو وہ یونہی موڑھا گھسیٹ کر ساتھ بیٹھی راکھ کریدتی رہتی تھی اور ڈھیروں ڈھیر باتیں کیا کرتی تھی۔

آج وہ قدرے چپ چپ سی تھی۔ کھیر کے چاول ابالتی اماں کو اس کا یہ سناٹا ذرا نہ بھایا تھا۔

"تمہارے ساتھ سب اچھے تو ہیں ناں؟"

وہ ضبط کر کے بیٹھی رہی سی۔ کانچ کی چوڑیاں کھن کھن کرتی رہیں۔

"ہاں...... اچھے ہیں اماں۔ سب کے سب۔"

"گھر کیسا ہے تمہارا شرافت تو کہتا ہے کہ ہماری چندا راج کر رہی ہوگی راج۔ اتنی بڑی حویلی ہے۔"

"ہاں بڑی تو بہت ہے۔ راج تو کرتی ہوں وہاں۔"

اماں تو جیسے مالو خوش ہی ہو گئی تھیں۔ مائیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں، بیٹیوں کے سارے جھوٹ سچ سمجھ کر خوش ہو جاتی ہیں۔ کون جانے کہ کون سی فلم کا سیٹ ہے یہ میکہ بھی۔ یہاں بھی گھڑی گھڑی سین بدل جاتا ہے۔ جھوٹی ہنسی ہنس کر دکھاؤ۔ ہاتھوں کی مہندی کا گہرا رنگ دکھاؤ۔

وہ بھی یہی تو کر رہی تھی۔ اماں نے اب کی بار اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا تھا۔

"نوکر چاکر بھی ہیں کیا؟"

وہ دور کمرے کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ رنگین چارپائی پر وہ نیم دراز تھا۔

"ہاں...... اماں ایک ہے۔"

کچھ دیر بعد اماں نے وہ بڑا شاپر کھولا تھا جس کے اندر موجود چیزیں دنیا سے وہ خود بھی لاعلم تھی۔ شاپر عمر و عیار کی زنبیل کی طرح تھا۔ نان خطائی کے ڈبے۔ میوے والے بسکٹ۔ کراری نمکو۔ بھابھی کے لیے کون مہندی اور جھمکیاں۔ اماں کے لیے چکن کا دوپٹہ اور عطر۔ بھائی کے لیے کھدر کا جوڑا۔

وہ گہری سانس لے کر رہ گئی تھی۔ یہ شخص بھی کتنا بڑا اداکار تھا۔

کھانے کے وقت بھیا آئے تھے۔ ذرا بجھے بجھے سے نظر آتے تھے۔ جتنی دیر سامنے رہے کھوکھلے قہقہے لگاتے رہے اور چندا سے نظریں چراتے رہے۔ اس نے انہیں نکلنے پر ہی پکڑ لیا تھا اور خود نلکے کی ہتھی چلانا شروع کر دی تھی۔

پانی جھر جھر بہنے لگا تھا۔ وہ اوک میں پانی بھرے منہ دھو رہے تھے۔

"ابا خواب میں آئے تھے۔ بہت رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ آپ کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ آپ نے ان کی لاڈلی کو اپنا راستہ صاف کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ استعمال تو چیزیں ہوتی ہیں بھیا۔ بہن بیٹیوں کی تو حفاظت کی جاتی ہے۔ اللہ کرے آپ کے ہاں بھی بیٹی کی پیدائش ہو۔ پھر آپ سے پوچھنے آؤں گی۔ ویسے بھی سنا ہے غزالہ بھابھی کا ساتواں مہینہ چل رہا ہے۔" بھیا گم صم کھڑے تھے۔

وہ دبنگ لہجے میں نقارہ بجا کر اندر گم ہو گئی تھی۔

اگلے دن صبح ساری سکھی سہیلیاں جمع ہو گئی تھیں۔

"ہم تو دولہا بھائی سے ملنے آئے ہیں۔"

چندا نے بیزاری سے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ اماں نے چائے چڑھا دی تھی۔

وہ ٹرے میں چائے رکھے جب کمرے میں آئی تو سامنے محفل کشت زعفران تھی۔ اونچے اونچے قہقہے لگ رہے تھے۔

"قسم سے چندا۔ دولہا بھائی تو بہت اچھے ہیں۔ اتنی مزے مزے کی باتیں سناتے ہیں۔ اور دیکھو تو یہ کتنے اچھے میوے والے بسکٹ لائے ہیں۔ منہ میں گھل رہے ہیں۔"

بسکٹوں کا ڈبا لڑکیوں بیچ کھلا پڑا تھا۔ وہ مسکراہٹ سجا کر سب کو چائے پیش کرنے لگی تھی۔ پرویز نے اس کی نگاہوں کا قہر مشکل سے سہا تھا۔ سہیلیاں جاتے جاتے پرویز کو اپنے گھر دورہ کرنے کی دعوت دے کر گئی تھیں۔

"ضرور آئے گا۔ ورنہ کٹی ہو جائے گی۔ آپ کو بیٹھے کا حلوہ اور ساگ کھلائیں گے۔"

وہ شکریہ کے ساتھ مسکرا تا رہا تھا۔

مزے سے چائے کی چسکیاں لیتے ملکم کو اس نے پکڑا تھا۔

"کیا ملمع سازی کر کے آئے ہو تم یہاں؟"

"انسانوں کی بہت پہچان ہے آپ کو چندا صاحبہ۔"

"میں اماں کو سب سچ سچ بتا دوں گی۔"

وہ دھمکی دینے پر اتر آئی تھی۔

"بتا دیں میں ہرگز بھی منع نہیں کروں گا۔ اور ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ مجھے شرمندگی اٹھانی پڑے۔ یہ تو آپ کے نظریے پر ہے کہ ملکم سمجھیں یا پرویز۔ مجازی خدا یا پھر ملازم۔"

وہ مسکراتا ہوا زہر نظر آتا تھا۔ بدتمیز خبیث۔

کاش وہ اکیلی ہی آ جاتی۔ دو دن کے دورے میں اماں نے اس کے خوب خوب لاڈ اٹھائے تھے اور صحیح معنوں میں پروٹوکول سے نوازا تھا۔ بادشاہ سلامت بھی کافی شاداں و فرحاں نظر آئے تھے۔

اماں اس کی تعریف کرتے ہوئے نہ تھکتی تھیں۔

"کتنا سیدھا سچا سا شوہر ہے ناں چندا تمہارا۔ قدر کیا کرو۔ نصیب والیوں کو ملتے ہیں ایسے گھر والے۔"

"ہونہہ......اور ایسے گھر بھی۔"

اماں پہلی بار اس کے لہجے کی ترشی پر چونک گئی تھیں۔ زہر زہر لہجہ۔

اور پھر وہ ان کے آگے پھٹ پڑی تھی۔ ایک ایک بات......سب کچا چٹھا کھول کر سامنے رکھ دیا تھا۔

اماں نے زندگی گزاری تھی۔ ساری اونچ نیچ سے واقف تھیں۔ تب ہی نرمی سے بیٹی کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"میری چندا کبھی بھی دوسروں کی باتوں میں آ کر اپنے مرد کی خوبیاں ضائع مت کر بیٹھنا۔ ایسے عورت کا ہاتھ بٹانے والے مرد کسی کسی کو ملتے ہیں۔ وہ چائے کافیاں بنائے۔ قمیص کے بٹن ٹانکے۔ جھاڑو لگائے یا پھر کپڑوں کے ڈھیر استری کرے۔ تو اس کی ذات پر سوال جواب مت کرو۔ اس کی خوبیاں ریت مت کرو۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سارے کام خود کرتے تھے۔" اماں کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اندھیرے آسمان پر چاند روشن تھا۔

جاڑے کی چاندنی کا نور چہار جانب پھیلا ہوا تھا۔

وہ کسی نمک کے مجسمے جیسی بیٹھی رہ گئی تھی۔

اماں کی طرح تو کسی نے کبھی کچھ سمجھایا ہی نہیں تھا۔ وہ سکے کا ایک رخ دیکھ دیکھ کر پریشان ہوتی رہی تھی۔

وہ دور سے بھی اس مرد کو دیکھ سکتی تھی جو بہت پرسکون انداز میں لیٹا ہوا تھا۔

دودھ کاڑھنے والا مرد۔ بٹن ٹانکنے والا مرد۔ جھاڑو لگانے والا مرد۔ آٹا پسوانے والا مرد۔ شہد چٹانے والا مرد۔ اور اور۔ اذان دینے والا مرد۔ وہ ساری رات بیٹھی رہی تھی۔ رات گزر گئی تھی۔

☆☆☆

دونوں مسافر دوبارہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ چکے تھے۔ وہاں پر تو ہو کا عالم طاری تھا۔ اماں نے بہت ساری سوغاتیں ساتھ کر دی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ دوپٹے کے پلو کے ساتھ ایک نصیحت بھی لپیٹ کر بھیجی تھی۔

"جانتی ہوں محل جیسا گھر نہیں ہے تمہارا اور نا ہی شہزادوں جیسا شوہر۔ اور نہ مجھے لگتا ہے تمہارا سسرال کسی شاہی گھرانے جیسا ہو گا۔ مگر ایک بات اپنی ماں کی مان لو کہ اللہ نے عورت کے اندر گھر کو محل بنانے۔ شوہر کو شہزادہ بنانے۔ اور سسرال کو شاہی گھرانہ بنانے جیسی صلاحیت رکھی ہے اور میں جانتی ہوں کہ میری بیٹی بہت سمجھدار اور کرموں والی ہے۔ وہ اپنے گھر کو کبھی برباد نہیں کرے گی۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ اگلے دن بھیا

بھابھی شمیم سے رپورٹ کروا کر آئے تھے۔ بھیا چپ چپ اور غمگین سے نظر آتے تھے۔ بھابھی بھی عجیب ڈری ڈری سی دکھائی دیتی تھیں۔ اماں نے پوچھا تو رو کر کہنے لگیں۔

"اماں بچی ہے۔ رپورٹ میں صاف صاف لکھا ہے اور ڈاکٹر نے بھی بتایا ہے۔" اماں پہلے تو حیران ہوئیں پھر ہنستے ہوئے بہو کو بانہوں میں بھرلیا۔

"پاگل ہو تم دونوں بھی۔ اس میں منہ لٹکانے والی کون سی بات ہے۔ یوں سمجھو اللہ نے ہمیں ہماری چندا دلہن لوٹا رہا ہے۔ آج ہی سوجی بنا کر سارے محلے میں بانٹ دیتی ہوں۔ خبردار جو تم دونوں نے میری پوتی کی آمد سے پہلے یہ ملال کا موسم خود پر طاری رکھا۔"

وہ بھی بھیا کے سامنے آئی تھی اور ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

"مبارک ہو بیٹی ہو گی۔ جانتی ہوں آپ ایک اچھے باپ ضرور ثابت ہوں گے۔ مگر اس کا کوئی بھائی ہو جائے تو کوشش کیجیے گا کہ اسے اس سے بچا کر رکھیں۔ بس اتنی دعا کرتی ہوں کہ بھتیجی کا نصیب اللہ اچھا کرے۔ اور اس کے اپنے اس کے لیے گڑھا نہ کھودیں۔"

اماں اور غزالہ بھیا کے آنسوؤں کو خوشی کے آنسو سمجھتی رہیں۔ مگر صرف واحد وہ تھی جو جان گئی تھی کہ اس بار اس کے مان جائے کے آنسو پچھتاوے کے تھے۔ سسرال واپس آ کر وہ پرسکون تھی۔ مرمت شدہ مسہری۔ خستہ حال کھڑکی جہاں سے اب بھی چمگادڑیں روزانہ کی بنیاد پر چکر لگا کر نکل جاتی تھیں اور ٹوٹی پھوٹی سیڑھیاں اسے زیادہ بری نہیں لگ رہی تھیں۔

بھری محفل میں دوپہر کے کھانے کے وقت جب ہر طرف پکلم کی ڈھنڈیا مچی ہوئی تھی اور لڑکیاں پکلم کے آنے پر اسے ڈانٹ رہی تھیں۔

"پکلم کہاں رہ گئے تھے تم۔ کب سے اسکول سے آئے ہوئے ہیں۔ بھوکے بیٹھے ہیں۔ کھانا دے دو۔"

فریم تھا۔ وہ کسی ٹانکے میں الجھی ہوئی تھی۔ چندا نے سر اٹھا کر لڑکیوں کو سرزنش کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

"خبردار..... جو آئندہ انہیں پکلم کہہ کر بلایا تو۔ عمر میں بھی بڑے ہیں تم سے اور رشتے میں بھی۔ رشتوں کا احترام کیا کرو۔"

جاڑے کے موسموں میں جب طوفانی بارش ہوئی تو وہ تیسری منزل کے کمرے میں پریشانی کے عالم میں ٹہل رہی تھی۔ باہر ایسا طوفان اٹھا تھا کہ چاروں طرف سیٹیاں بج رہی تھیں اور درخت اکھڑ کر جڑوں سمیت گھر رہے تھے۔ مگر پرویز عرف پکلم کا کہیں پتا نہیں تھا۔ دل کو عجیب احساس دلائے دے رہا تھا۔ پریشانی کے عالم میں بارش میں بھیگتے ہوئے وہ نیچے والی منزل پر بجی بھیا اور عذی بھیا کے دروازے بجاتی رہی تھی۔ کسی کو بھی پکلم کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ پچھلے کئی گھنٹوں سے گھر کے کام کے سلسلے میں وہ بازار گیا تھا۔ بازار جانے والا جاڑے کی شدید بارش میں لوٹ کر نہیں آیا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جب ساری امیدیں دم توڑ گئیں اور خستہ حال کھڑکی سے بارش کی ایک بوچھاڑ نے چندا کو بالکل بھگو کر رکھ دیا تو تب کہیں دروازے سے بھیگا پانی پانی ہوتا ہوا وہ سامنے نظر آیا تھا۔ کاٹن کی قمیص گیلی ہو چکی تھی۔ سرسوں کے تیل میں چپڑے ہوئے بال ماتھے پر آ چکے تھے۔ وہ چیل کی طرح اس کی طرف لپکی تھی اور اسے گریبان سے پکڑ لیا تھا۔ اسے نہیں پتا تھا کہ وہ کیا کیا بولنے جا رہی ہے۔ باہر اور اندر کا طوفان اکٹھا ہو گیا تھا۔

"کہاں تھے تم...... ذمہ داریوں سے بھاگنے والے۔ فرار حاصل کرنے والے۔ دنیا بھر کی جی حضوری کرنے والے۔ تمہیں مجھ سے شادی کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ تم جیسے لوگ کبھی بھی کوئی رشتہ نہیں نبھا سکتے۔ اور شادی جیسا رشتہ تم کیا نبھاؤ گے جسے اپنی ذمہ داریوں تک کا احساس نہیں ہے۔ اب میری سمجھ

digest library.com

ہیں آرہا ہے کہ تمہیں پکے رشتوں سے کیوں نہیں نوازا گیا ہے۔ اگر میں مر جاتی۔ مجھے کچھ ہو جاتا۔ میرا دل بند ہو جاتا تو......؟"

بولنے والی جی جان سے بولی تھی۔ سننے والا اپنی بھیگی ہوئی قمیص سے پانی نچوڑ رہا تھا۔ شاید اسے سردی بھی لگ رہی تھی۔ وہ تھوڑا ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

"معذرت چاہتا ہوں۔ آپ کو بتانا بھول گیا تھا۔ آج سے میرے پرائیویٹ ایم اے کے امتحانات شروع ہو گئے ہیں۔ وہی پرچا دینے گیا تھا۔ مگر موسم خراب ہو گیا۔"

چندا حیرت سے دیکھتی رہ گئی تھی۔ سامنے کھڑا ہوا شخص عجیب پہیلی تھا۔ ٹکڑوں میں سمجھ میں آتا تھا۔ اور آج جاڑے کی سرد رات بارش میں اس نے چندا کو بہت سارے ٹکڑوں میں بانٹ دیا تھا۔ طوفان، بارش سنہری اور رات چندا پر ہنستے رہے۔

☆☆☆

بہت دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک تھی چاند کے جیسی چندا...... اور...... ایک تھا دیوانوں جیسا پگلم۔

اور آج جدید طرز تعمیر پر مشتمل یہ حویلی جو شان سے کھڑی ہے اور اس کے مکین گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ اپنی حویلی کی طرز تعمیر کے ساتھ خود بھی زیر تعمیر چلے آرہے ہیں۔ اس حویلی میں ساڑھی پہنے بالوں میں موتیا کے گجرے سجائے ماسٹرنی چندا رہتی ہے۔ جو ہر روز اپنے ماسٹر پگلم کا انتظار کرتے ہوئے تیسری منزل کے پختہ اور خوب صورت پورشن میں انگریزی کھانوں کی نت نئی ترکیبیں آزماتے ہوئے خوش نظر آتی ہے۔ شادی کے بعد ہونے والی محبت کی یہ ایک عمدہ مثال ہے۔ بابا آدم کی یہ حویلی اب ماسٹر اور ماسٹرنی کی محبت حویلی کہلاتی ہے۔ سارے محلے میں اس جوڑے کی دھوم ہے۔ ساس صاحبہ دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں۔ مگر عینی شاہدین کے مطابق اپنے آخری وقت میں وہ اپنے سگے بیٹوں سے کہیں زیادہ اپنے سوتیلے بیٹے پرویز سے خوش ہو کر گئی تھیں۔ شاید تب ہی اگلے جہان سے جھولیاں بھر بھر دعائیں بھیجتی رہتی ہیں۔

عارفہ کی بیٹیوں کو ہمیشہ حقارت سے دیکھنے والی اسمارہ اب ننھی گڑیا کو چپکے چپکے پیار کرتی نظر آتی ہے۔ اور اسے نہیں معلوم کہ یہ سب کرتے ہوئے وہ دوسروں کو نظر آتی ہے۔ ماسٹرنی جی بار بار شام کی چائے پر بیٹیاں سانجھی ہوتی ہیں اور حقوق العباد کے ساتھ ساتھ گھر داری میں عورت کے کردار پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔ اماں کبھی کبھی بھیا کے ساتھ موسموں کی سوغات لے کر حاضر ہو جاتی ہیں اور فخر سے اپنی ماسٹرنی بٹیا کو یاد دلانا نہیں بھولتیں کہ عورت چاہے تو مکان کو گھر بنا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت ساری خصوصیات عورت ذات میں رکھی ہیں۔

دیوانہ پگلم اور پیاری چندا آج بھی اپنی اتفاقیہ شادی اور حالات زندگی پر تبصرے کرتے ہوئے شکر ادا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی زندگی واقعی کسی فلم کا سیٹ بن جاتی ہے۔ بدلتی رہتی ہے وقفے وقفے سے۔ دھیرے دھیرے سے۔ زندگی کے بدلتے ہوئے پھیلاؤ میں کامیاب ہمیشہ وہی ہوتے ہیں جو جی جان سے حالات کا مقابلہ کرتے ہیں اور پار لگ جاتے ہیں۔ سکے کا ایک ہی رخ کبھی بھی خوش حال شادی شدہ زندگی کی ضمانت نہیں ہوتا۔

چائے کی پیالی سے سڑک سڑک کر چائے پیتے ہوئے ماسٹرنی اکثر ماسٹر جی سے کہتی ہے۔

"تمہیں پتا ہے میں پہلی بار تم سے کب متاثر ہوئی تھی۔ تب جب تم ننھی گڑیا کو لے کر ہسپتال سے آئے تھے۔ تمہاری جیب میں شہد اور کاجل کی ڈبیا تھی اور تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے گڑیا کی آنکھوں میں کاجل بھرا ہے اور شہد کی گھٹی بھی چٹائی ہے۔ میں نے ایسا مرد اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ ٹھیک کہتی تھیں اماں تمہارے جیسے مرد نصیب والیوں کو نصیب ہوتے ہیں۔"

کبھی کبھی وہ یونہی چائے کی ایک پیالی کے بدلے تعریف کر دیا کرتی ہے اور پرویز عرف پگلم اعزاز سمجھ کر یہ ساری تعریفیں وصول کرنا اپنا حق سمجھتا ہے۔

☆☆

ریحانہ وقاص

محبت کا سبق

digest library.com

"مما آپ نے پھپھو سے بات کی پھر؟ پلیز آپ اب ہمت کر لیجئے گا۔ ورنہ ہم بچے مل کر بات کر لیتے ہیں۔"

"کہا ہے ناں کہ میں بات کرتی ہوں موقع محل دیکھ کر۔ پتا تو ہے تمہیں کس بات کا بتنگڑ بن جائے کچھ پتا نہیں چلتا۔" رانی نے چکن پلاؤ ڈش میں نکالتے ہوئے دس سالہ زینب کو لتاڑا۔ جو کب سے کچن میں اس کے آگے پیچھے گھومتی اس کا سر کھائے جا رہی تھی۔

"رانی او رانی آج کھانا لے آؤ گی یا ہم روزہ رکھ لیں۔ حد ہو گئی بھئی تین بج گئے۔ ایک کھانا نہ بن سکا تم سے۔ اس وقت تو ہم اپنے گھر میں قیلولہ فرما رہے ہوتے ہیں۔"

کمرے سے آوازیں آنی شروع ہو گئی تھی۔ کم بختی آنی لازمی تھی اب رانی کی۔

"آپ بھی تو رات سے تین بجے دوپہر تک قیلولہ ہی فرما رہی تھی۔" رانی نے دل میں سوچا اور ٹرے اٹھا کر کمرے کی طرف دوڑ لگائی۔

"شمع باجی! میں نے بڑے دل سے بنائے ہیں چاول، امی جیسے تو نہیں بنے مگر قریب قریب تو بنے ہیں۔ آپ کھا کر بتائیں اور یہ رائتہ سلاد بھی لیں۔"

پہلے مارکیٹنگ ضروری تھی۔

چاولوں کو پلیٹ میں ڈالتے ہوئے ڈش کو اچھی طرح کھنگال ڈالا، بوٹیاں کم ہی نظر آئیں تو شمع نے ابرو اچکا کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا کہ جیسے ساری بوٹیاں اسی نے کھائی ہوں۔

"باجی ابھی ہانڈی میں اور بھی بوٹیاں ہیں آپ یہ لیں میں اور گرم گرم لے آتی ہوں۔"

"رہنے دو بچوں کو دے دیا ہے کھانا کیا؟"

"جی باجی! پہلے انہیں دیا ہے۔ کافی بھوک لگی ہوئی تھی انہیں۔"

باجی نے تسلی سے کھانا شروع کیا تو رانی کی جان میں جان آئی۔

"کیسا بنا ہے؟"

آدھی پلیٹ صاف ہو جانے پر رانی نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے چاول ذرا دب گئے ہیں اور گوشت سخت ہو گیا ہے! امی کا گوشت پکا ہوا دیکھا ہے۔ کتنا نرم سا ہوتا ہے بوٹی یوں کھلتی ہے منہ میں کہ سواد آ جاتا ہے۔ اب گزارا ہی کرنا ہے۔ سرپرائز دینے کے چکر میں بندہ ذلیل و خوار ہی ہوتا ہے جو ہم ہو ہی گئے۔ ہمیشہ کی طرح امی کو بتا کر آتے تو امی اور عزت افزائی دونوں ملتی۔ امی کو بھی اپنی بہن کی یاد آئی اور چل دیں، خیر کر دیا ہے فون، راستے میں ہیں شام تک آ جائیں گی۔ سچ میں گھر، گھر نہیں لگ رہا، رونق ہی نہیں ہے گھر میں، کچھ کھانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا۔"

شمع نے چاولوں کی پلیٹ ختم کر کے کولڈ ڈرنک کا گلاس اٹھایا۔

"جی جی باجی! امی کے بغیر تو ہمارا دل بھی نہیں لگ رہا۔" جو ڈانٹ امی سے پڑتی تھی وہ باجی شمع فرض نبھا رہی تھی۔

"آپ کے آنے سے رونق آئی ہے گھر میں اب آپ کے لیے سونف والی چائے بناتی ہوں پھر باتیں ہوں گی۔"

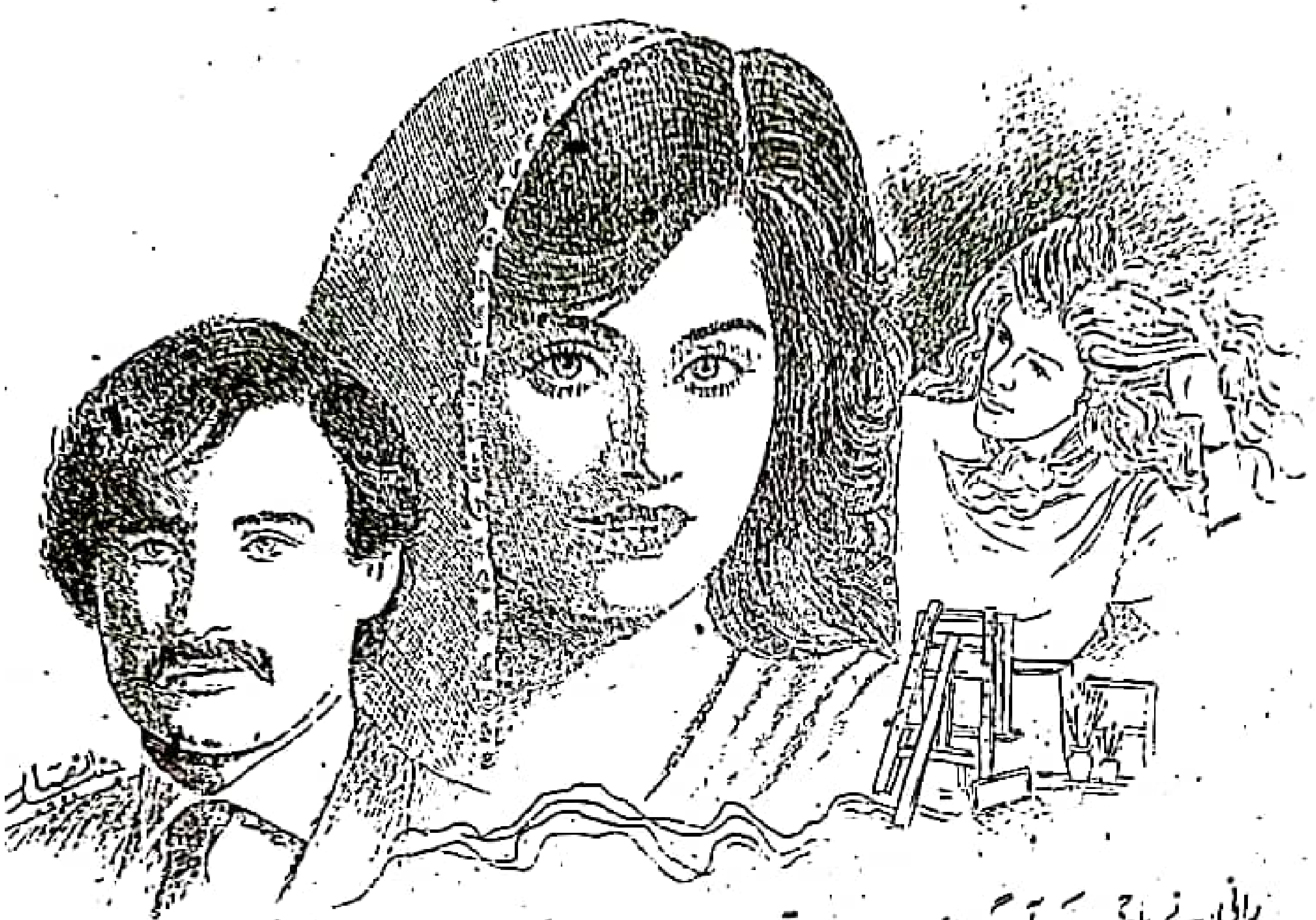

رانی نے باجی کے آگے پڑے سب برتن
سمیٹے۔

"ذرا زینب کو بھیجنا میرے پاؤں میں درد ہو رہا
ہے پھپھو کی کچھ خدمت ہی کر لے۔"

"ہاں ہاں میں بھیجتی ہوں۔" برتن اٹھاتے
ہوئے رانی زینب کو بلانے چل دی۔

☆☆☆

شمع اور رانی دونوں کا رشتہ دوطرفہ تھا دونوں
ایک دوسری کی نند بھابھی تھیں۔ شمع کی جب رانی کے
بھائی سے شادی ہوئی تو گھر کی سب سے چھوٹی پندرہ
سولہ سالہ رانی بھابھی کو دیکھ کر خوشی سے باغ باغ ہو
گئی۔ اگرچہ شمع ان کی دور کی رشتہ دار تھی۔ پڑھی لکھی
فیشن کی دلدادہ، رسالوں کی رسیا اور نت نئے کھانے
پکانے والی بھابھی اس کے ان پڑھ بھائی کو گھر بیٹھے
مل گئی تھی آج سے بیس پچیس سال پہلے رشتے داریاں
نبھائی جاتی تھیں جوڑ نہیں دیکھے جاتے تھے۔

باقی بہن بھائیوں نے تو بھابھی کا سواگت
برے برے منہ بنا کر کیا لیکن رانی کو تو جیسے کوئی
پرستان سے آئی شہزادی مل گئی ہو۔ وہ ہر وقت شمع باجی
شمع باجی کرتی اس کے آگے پیچھے پھرتی۔

شمع اپنے گھر کی بڑی بیٹی اور ماں کی انتہائی
لاڈلی تھی جس کو اس کے باپ نے ماں کے خلاف جا
کر زبردستی اس کا بیاہ پانچ کلاس پڑھے شاہد سے کروا
دیا۔ اس زمانے میں انکار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا
تھا۔ لیکن شاہد اس کا مرید بن گیا۔ ہر وقت اس کی جی
حضوری کرتا جو اس کے بہن بھائیوں اور ماں کو ایک
آنکھ نہ بھاتی۔

گھر کا ماحول عجیب سا ہونے کی وجہ سے شمع
نے کمرے سے نکلنا کم کر دیا وہ صرف اپنی ڈیوٹی اور
ضروری کام نبھانے آتی، تب بھی بہت سی آنکھیں
اس کو گھور رہی ہوتیں۔ باپ کی وجہ سے وہ ان سب کو
برداشت کر رہی تھی۔

ان حالات میں رانی اپنے گھر والوں سے بچ
بچا کر ساری دوپہر اس کے پاس گزارتی۔ گھر والوں
نے اس کو بھابھی کی چمچی کا خطاب دے دیا تھا۔ اکثر
اس کا مذاق اڑاتے لیکن بھابھی کی محبت میں گرفتار

ہوتے ہوئے اس نے سب برداشت کرلیا۔

شمع نے زندگی کے ان کٹھن حالات کو خاموشی سے برداشت کیا۔ شاہد جو سب حالات کو دیکھ رہا تھا لیکن کچھ کہنا شہد کی مکھیوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا سب اس سے متنفر تھے حالانکہ وہ اپنی آمدنی کا آدھا حصہ ماں کے ہاتھ پر رکھتا اور آدھے پر گزارا کرتا۔ منڈی میں کام کرنے کی وجہ سے آمدنی کا اتار چڑھاؤ رہتا تھا۔

شمع نے اسے بھی اس کے گھر والوں کے خلاف نہیں بھڑکایا تھا۔

بالاخر شمع کا صبر رنگ لے آیا اور شاہد اس کو لے کر کبیروالا سے لاہور شہر میں شفٹ ہوگیا۔ کرائے کا گھر اوپر نیچے کے تین بچوں کے ساتھ نہایت سلیقے کے ساتھ انہوں نے اپنی گزر بسر شروع کی تو اللہ نے بھی ان کا ساتھ دیا اور حالات بہت بہتر ہوگئے بچے اچھے اسکولوں میں پڑھنے لگے۔

ساس جن بیٹوں کے پیچھے لگ کر شمع کی بے عزتی کیا کرتی تھی۔ جب ان کی بیویاں آئیں تو انہوں نے زبان درازی کی انتہا کردی اور مہینے بعد ہی انہیں لے کر علیحدہ رہنے لگی۔

بیٹیوں کی شادی کے بعد ساس معافیاں مانگتی ہوئی رانی کو لے کر شمع کے پاس رہنے لگی۔ باقی بہن بھائیوں کو رانی اور ماں کی بالکل فکر نہیں تھی ماں ان کا دکھ لے کر قبر میں جا سوئی اور رانی کو شمع کے سپرد کرگئی۔

رانی کی مرضی اور خواہش کے مطابق اس کی شادی شمع کے بھائی سے کردی گئی اور یوں دونوں ایک ہی رشتے میں بندھ گئیں۔ اب رشتہ بدلا تھا تو حالات اور خیالات بھی بدل گئے تھے۔ کیونکہ اب رشتہ برابری کا تھا۔

شمع ہر دو، تین ماہ بعد ملتان ماں سے ملنے آجاتی۔ جہاں بھائی اور ماں اس کا بھرپور خیر مقدم کرتے۔ شادی کے شروع دنوں میں ایک دو بار رانی گئی تھی پھر اتنے سال گزر گئے گھر کے کاموں سے فرصت نہ ملی۔ خدمت کرتے کرتے جب انتہا ہوگئی تو بچوں نے احساس دلایا کہ مما کبھی ہم بھی پھپھو کے گھر مہمان بن کر جائیں۔ باقی ماموؤں نے کبھی پوچھا نہیں۔ ادھر ہی لے جائیں۔

آہستہ آہستہ رانی کا بھی ذہن بن گیا۔ فروری میں آئی شمع سے اپنے بچوں کے آنے کا کہا تو اس نے بھنویں سکیڑتے ہوئے کہا۔

”رانو! تمہیں کب سے اجازت کی ضرورت پڑ گئی۔ جم جم آؤ۔ تمہارے بھائی کا گھر ہے۔ پھر ہم تمہیں بتائیں گے کہ اپنا پن کیا ہوتا ہے آخر تمہیں بھی تو پتا چلنا چاہیے کہ ہم کن حالات میں گزارا کررہے ہیں۔ اور تم کن حالات میں مزے کررہی ہو۔“

رانی جو پہلے ہی شمع سے دبتی تھی۔ ڈرگئی کہ کہیں غلط فیصلہ تو نہیں کرلیا۔ لیکن جب بچوں کی خوشی دیکھی تو رنگ میں بھنگ نہ ڈالنے کا فیصلہ کیا کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں جانے کا فیصلہ طے پایا گیا۔

☆☆☆

”مما، مما ہمیں کل سے چھٹیاں ہوگئی ہیں اب ہم آزاد ہیں۔ بتائیں ہم کب جائیں گے؟“

بچوں نے اسکول سے آتے ہی چڑھائی کردی۔ ناچار رانی نے جانے کی تیاری شروع کردی ٹرین کی ٹکٹیں کروالی گئیں۔

میاں صاحب ٹرین پر بٹھا کر چلے گئے آگے بھائی نے لینے آنا تھا۔ بچوں نے اپنے اپنے کھانے پینے کے شاپر پکڑے ہوئے تھے۔ حیرانی اور منہ کھولے ادھر ادھر ایسے دیکھ رہے تھے جیسے چڑیا گھر میں نئے نئے جانور لائے ہوئے ہوں۔

ہر اسٹاپ پر نت نئی چیزیں لے کر تھال سجائے کوئی نہ کوئی آٹپکتا اور ساتھ ہی بچوں کے منہ میں پانی آجاتا۔ جیسے دو، چار چیزیں لگا کر ختم کروایا جاتا۔ اللہ اللہ کرکے بھائی کا فون آیا کہ ابھی اسٹاپ آئے گا۔

digest.library.com

اماں نے عرصے کا فریز کیا ہوا ساگ، گوشت بھنا اور تازہ پکا ہوا کریلے، بھنڈی گوشت باجی کے لیے ان کے ہمراہ کر دیا۔

"جہاں ٹرین کچھ منٹ کے لیے رکے گی۔ تو فوراً اتر جانا ہے۔ ابھی فوراً بچوں کو لے کر دروازے پر آجاؤ۔" بھائی کے حکم نامہ پہ دو بچے آگے کیے ایک کو گود میں اٹھایا۔ دوسرے ہاتھ سے سامان گھسیٹا اور گرتی پڑتی دروازے پر آن پہنچی۔

ٹرین نے وسل بجائی اور ہلکی رفتار کرنے لگی۔ دھکم پیل ایسے ہونے لگی کہ اترنے کے بجائے ہوا میں اچھلتی باہر ہی نہ جا گرو۔ سامنے بھائی کی شکل دیکھ کر اور اپنے حالات دیکھ کر آنکھوں سے آنسو ہی بہنے لگے۔

بھائی نے لپک کر بچوں کو اور سامان کو تھاما۔ اور اس نے باہر چھلانگ پار دی کیونکہ ہلکی ہوتی ٹرین کی رفتار پھر تیز ہونے لگی تھی اور وہ گھٹنوں کے بل سجدہ کرتی فرش پر پڑی۔ گرتے پڑتے خود کو سنبھالا اور چنگچی رکشے میں سواری کر کے بالآخر منزل مقصود آن ہی پہنچے۔ رکشہ تنگ گلیوں کا سفر کرتے ہوئے ایک چھوٹے سے مکان کے پاس آ کر رک گیا۔

بچے جو سفر کی تھکاوٹ سے چور چور تھے۔ چھلانگیں مارتے یہ جاوہ جا۔ ناچار کچھ سامان بھائی نے اٹھایا اور ایک بھاری کم بیگ اس کے حصے میں آ گیا۔ ارادہ دس دن رہنے کا تھا باقی پیار محبت کی بات تھی۔ اندر آتے ہی اندھیرے نے استقبال کیا۔ بھائی نے موبائل کی روشنی سے راہوں میں روشنی کی۔

"اوہ، ایک تو اس شمع کی بچت کی عادت نے نالاں کیا ہوا ہے۔ رکو میں ایک منٹ لائیٹ جلاتا ہوں۔" بھائی نے آگے بڑھ کر لائٹ جلا کر ان کی آنکھوں کو منور کر دیا۔ صاف ستھرا چھوٹا سا گھر تھا۔

گھر کے اندر داخل ہوتے ہی ایک چھوٹا سا ہال تھا جس کے ایک سائیڈ پر کھانے کی ٹیبل اور فریج رکھا تھا۔ دوسری طرف چھوٹا سا اوپن کچن تھا۔ جس پہ ٹائیلنگ لگا کر چولہا رکھا گیا تھا۔ اوپر کچھ کیبن اور کچھ کھینچے تھے۔ جن کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے اور انہیں خوب صورت سینری کے مناظر لگا کر کور کیا گیا تھا۔

کرائے کے مکان چونکہ بدلتے رہتے ہیں اس لیے بندہ اتنا ہی ساز و سامان رکھتا ہے جو آسانی سے شفٹ کر سکے۔ لیکن باجی نے اب تک دو مکان بدلے تھے۔

"شکر ہے جو تم لوگ خیر و عافیت سے پہنچے، ٹرین پورے ساڑھے تین گھنٹے لیٹ ہوگئی ہم اور ہمارے بچے تو تھک گئے انتظار کرتے کرتے۔"

باجی کھڑے کھڑے ہی ان کا سارا انٹرویو کر رہی تھیں۔ اور وہ تھے لائن میں وہ سب ایسے کھڑے تھے گویا کلاس میں دیر سے پہنچنے پر ٹیچر سے ڈانٹ کھا رہے ہوں۔ شرمندہ شرمندہ سے۔

باجی نے آگے آنے کا راستہ چھوڑا تو وہ فوراً آگے کمرے کی طرف بڑھ گئے جو روشن تھا، دوسرا کمرا تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کمرے میں ایک عدد بیڈ اور صوفہ لگا ہوا تھا۔ وہ مہمان تھے اس لیے صوفوں پر ٹک گئے۔ پانی سے بھرے گلاس ان کے سامنے پیش کیے گئے۔

بچوں نے کولڈ ڈرنک سمجھ کر جھپٹ لیے۔ پانی کا ٹیسٹ آنے پر منہ کا زاویہ بناتے ہوئے ایک ایک گھونٹ لے کر رکھ دیے اور اسے مختلف قسم کی بوتلیں یاد آنے لگیں جو باجی کے آنے پر ٹیبل پر سجا دی جاتی تھی اور ان کے لیے سادہ پانی، موازنہ شروع ہو چکا تھا۔

"رانی! تمہاری پسندیدہ کڑاہی میں نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔ میں تمہارے لیے کھانا لگاتی ہوں۔ تم سب کو بھوک لگی ہوگی اور ہاں جو کھانا امی نے بھیجا ہے۔ وہ بھی نکال دو۔ میں فریج میں رکھ دوں کہیں خراب نہ ہو جائے۔"

گرم گرم کڑاہی، رائتہ اور ہاٹ پاٹ میں تندور کی رکھی روٹیاں ٹھنڈی ہو چکی تھیں باجی نے شاید ٹرین کے وقت کے حساب سے روٹیاں منگوائی تھیں بچوں۔

نے ربڑ کی روٹیاں کولڈ ڈرنک کی بوتل کے ساتھ حلق میں اتار لیں۔

باجی کی نگاہیں ان کے کھانے پر لگی ہوئی تھیں شاید انہیں جلدی تھی سونے کی۔ بس گھر والوں کا حال پوچھا حالانکہ رانی کا ارادہ ٹرین کی ساری روداد سنانے کا تھا۔

"رانی! بچوں کی یونیورسٹی کی چھٹیاں نہیں ہیں اس لیے وہ صبح جلدی اٹھتی ہیں۔ ہم نے گھر کا ٹائم ٹیبل ان کے مطابق سیٹ کیا ہوا ہے۔"

باجی نے یہ کہہ کر بات ہی ختم کر دی۔ باجی کی دو بیٹیاں یونیورسٹی جاتی تھی اور ایک بیٹا عبداللہ ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا انتہائی شرارتی جو ناک میں دم کیے رکھتا۔ ماں کا لاڈلا تھا اس لیے اسے کچھ کہنا بے کار تھا۔

اس کے چار بچے دس اور دو سال کے درمیان تھے جو اس کے عتاب کا شکار ہونے خود چلے آتے تھے کہ آ بیل مجھے مار۔

باجی نے اٹھ کر اسے اس کے باغی خیالات سے باہر نکالا اور سامنے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"رانی! میں نے بچوں کے ساتھ تمہارا کمرہ سیٹ کیا ہے۔ دو میٹرس نیچے بچھا دیے ہیں۔ زیادہ شور مت کرنا۔ بچوں کو سمجھا دینا۔ سامان یہیں پڑا رہنے دو صبح دیکھ لیں گے۔"

باجی نے زیرو بلب جلا کر ہمیں ہمارے بستروں تک پہنچا دیا اور پھر بند کر دیا۔ اندھیرے میں بچوں کی آنکھیں جنوں کی طرح گھوم رہی تھیں۔ چھوٹی تک خاموش رہ کر مشاہدے میں لگی تھی نہ جانے کب ہمیں نیند آئی کہ کب بچیاں چلی گئیں۔ پتا ہی نہ چلا۔ اٹھ کر باہر کی راہ لی۔

دس کا ٹائم تھا باجی چائے پی رہی تھیں سامنے رسک کا شاپر دھرا تھا۔

"اٹھ گئیں بڑی دیر کر دی۔ ہاں جی صبح ہے نیندیں پوری ہو رہی ہیں تمہارے بھائی تم لوگوں کے لیے اسپیشل نان چنے لائے ہیں۔ ہاٹ پاٹ میں رکھے ہیں۔ لاہوریوں کو نان چنے سے خاص شغف ہے۔ ملتان کا ایک اپنا مزا ہے پر لاہور بھی کسی سے کم نہیں" (ملتان والے تو بس پراٹھے بناتے بناتے ہی تعریف سن سن کر پک جاتے ہیں۔ ہائے رانی۔ ابی جی پراٹھا چنے تو اسے لاہور میں بھی یاد آتے رہتے ہیں۔ کہ کب ملتان آؤں اور یہ مزا چکھ سکوں...... لیکن یہاں تو اپنا راج چل رہا ہے وہاں کے بھی ٹھہرے گدی نشین۔ ہم تو کسی کھیت کی مولی نہیں لگ رہے تھے)"

"کن خیالوں میں کھو جاتی ہو تم۔" باجی نے زور سے اس کا کندھا نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے ہلایا وہ اوہ کرتے ہوئے ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

"نکال دوں ناشتہ؟ پھر نہ کہنا کہ بھابھی نے خدمت میں کوئی کسر چھوڑ دی۔"

"نہیں باجی میں لے لیتی ہوں۔ آپ بیٹھیے۔"

"کہاں بیٹھنا ہے میں نے۔ تمہارے بھائی مٹر دے گئے ہیں کہہ رہے تھے کہ مزیدار سا پلاؤ بنا لینا۔ میں نے کہا کہ رانی جیسا مزے کا تو نہیں بنا سکتی۔ آخر امی سے تم نے اتنا کچھ سیکھا ہے، ہمارے اندر تو وہ ہنر آ ہی نہ سکے۔ چھوٹی سی عمر میں ماں نے شادی کر کے بکھیڑوں میں ڈال دیا۔ اور آج تک سکون کا سانس ہی نہیں ملا تم سے بہتر میرے دکھوں کو کون جان سکتا ہے۔"

آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے بھرنے لگے جیسے اس نے اٹھ کر باجی کو گلے لگایا۔

"کیوں پریشان ہوتی ہیں آپ، میں ہوں نا آپ کی چھوٹی بہن۔ آپ جا کر آرام کریں میں بنا لوں گی پلاؤ۔"

اس نے ان کا غم کم کرتے ہوئے کہا۔ باجی نے دوپٹے سے منہ صاف ناک صاف کی۔

"ٹھیک ہے رانی! کچن میں ہر ڈبے کے اوپر مسالے کا نام درج ہے۔ تمہیں مشکل نہیں ہوگی۔ رانی

ہمارے گھر میں اصول ہے کہ ہر شخص اپنے برتن خود دھوتا ہے میں بھی اپنا کپ دھو کر رکھوں گی تم بھی خیال رکھنا یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔" اب مجھے سمجھ آ گئی کہ باجی رسک شاپر میں سے کیوں کھا رہی تھیں۔

"نہیں باجی آپ یہ بھی رکھ دیں میں دھولوں گی سب۔ مجھے تو عادت ہے" اسے ان کے آنے پر برتن کے انبار یاد آنے لگے جو صبح دوپہر شام دھوتی تھی۔

"اگر کہتی ہو تو میں مٹر چھیل دیتی ہوں۔" باجی نے تھکاوٹ بھرے لہجے میں احسان کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں باجی، یہ زینب تو ایکسپرٹ ہے مٹر چھیلنے میں، منٹوں میں چھیل لیتی ہے مٹر۔ آپ جائیں آرام کریں۔ ہم نان چنے کھانے کے بعد کھانا بھی بنا لیں گے۔"

باجی نے اندر کی راہ لی۔

اور اس نے شکر اور سکون کی سانس لی۔ باجی کو اندر جاتا دیکھ کر اور گھر کو صاف دیکھ کر لگتا تھا کہ کام والی صبح ہی کام کر کے چلی گئی ہے اور ہم کام کرنے سے بچ گئے۔

زینب نے چنے پلیٹ میں ڈالے۔ ٹھنڈے پانی کی بوتل فریج سے نکالی اور ہم ناشتہ کرنے لگے۔ تھوڑا دل خراب ہوا کہ ایسا ناشتہ بھی ہوتا ہے مہمانوں کا اندر اور باہر سناٹا سا چھا گیا۔

☆☆☆

چاولوں کو دم لگایا ساتھ ساتھ سلاد، رائتہ بھی تیار کر لیا۔ ایک نظر کچن میں دوڑائی ہر چیز اپنی جگہ پر تھی برتن دھل دھلا کر اپنی جگہوں پر چہچہا رہے تھے۔

دروازے کی بیل کی آواز پر تینوں بچوں نے دوڑ لگائی ایک منٹ بعد ہی تینوں کی چیخوں کی آوازوں نے اسے ڈرا دیا۔

بچوں کے پیچھے بھاگتے عبداللہ کو دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ اب ان کی شامت آئی ہے۔

باجی بھی شور سے اٹھ کر آ گئیں۔

"میرا شہزادہ آیا ہے۔ انہوں نے اتنا شور کیوں ڈالا ہوا ہے رانی۔"

عبداللہ ان کو دیکھ کر کرسی پر بیٹھ گیا معصوم سا منہ بنا کر اور باقی بچے وہیں ساکت و جامد ہو گئے مجسمے بن گئے۔

"رانی! ابھی تک تم انہیں تمیز نہ سکھا سکیں۔"

"جی باجی!" اس نے اپنی غلطی مانتے ہوئے کہا۔ بچپن سے جی جی کرتے سسرال پہنچ گئے تو ساسو ماں نے بھی جی، جی کی ہی ٹریننگ دی۔

"کھانا تیار ہو گیا ہے کیا؟" باجی نے دم لگے چاولوں کا ڈھکن اتارتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں جی باجی!"

"ٹھیک ہے تم لوگ بیٹھو میں کھانا لگاتی ہوں۔"

اب باجی کی راجدھانی شروع تھی۔

مٹر پلاؤ زور و شور تعریفوں کے ساتھ کھایا گیا۔

اور اسے کسی کا سنا ہوا واقعہ یاد آ گیا۔

"ایک شخص اپنے دوست کے گھر ملنے گیا کافی دیر بعد صرف بدمزہ چائے پینے کو ملی۔ جاتے وقت اس نے میزبان سے گلہ کیا تو میزبان نے کہا۔"

"کہ ایک بات یاد رکھنا کہ اگر تم اگلی دفعہ چائے کے ساتھ بسکٹ بھی کھانا چاہتے ہو تو تعریف کرو ورنہ آئندہ تم چائے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔" شاید باجی نے بھی یہ بات سن رکھی تھی۔

رات کے کھانے میں ان کے لائے گئے کھانوں کی چوائس تھی جو مرضی کھاؤ ساتھ میں تندور سے لائی گئی روٹیاں کھاؤ، پیٹو عیش کرو، مونوگرام کے ساتھ۔

☆☆☆

دو دن بعد ہی بچوں کا پھپھو کے گھر آنے کا نشہ ہرن ہو گیا۔

رات کے سناٹے میں زینب نے آہستگی سے اس کے پاس آ کر لیٹتے ہوئے کہا جو اس کی سوچوں کی ترجمانی ہی تھی۔

"مما! واپس چلیں گھر۔"

"اتنی جلدی بیٹا؟ ہم تو دس دن کا کہہ کر آئے

digest library.com

تھے۔ بس دو دن کے بعد ہی کیا کہیں کے گھر جا کر۔

"ممّا ہمارا دل نہیں لگ رہا۔ آپیاں یونیورسٹی چلی جاتی ہیں۔ تھکی ہاری آ کر سونا، کھانا اور اپنا کام کرنا انہیں بس یاد رہ جاتا ہے۔ اور عبداللہ کا تو جب تک اسکول ٹیوشن رہتا ہے امن و امان رہتا ہے گھر آ کر تو ہمیں مار مار کر کام کراتا رہتا ہے ملتان بھی اس کا یہی حال ہوتا ہے اور یہاں بھی، اتنا غصہ آتا ہے کہ دل کرتا ہے کہ دو، چار تھپڑ لگا دیں بس آپ کی وجہ سے ڈر لگتا ہے کہ آپ نے کہنا ہے کہ تربیت پر انگلی اٹھے گی۔ ممّا ڈرنا چھوڑ دیں اپنے بچوں کے لیے بولا کریں۔ ہم ڈر کر، رو کر آپ کی طرف دیکھتے ہیں اور آپ نظریں جھکا لیتی ہیں۔ ہم کدھر جائیں۔"

"بس کرو زینب کیا لیکچر شروع کر دیتی ہو ہر وقت نہ جگہ دیکھتی ہو اور نہ وقت جاؤ جا کر سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔"

زینب کو بھینچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بہنے لگے جو بے بسی کے تھے۔

☆☆☆

اگلے دن اس نے کوشش کی کہ بچوں کو اپنے آس پاس رکھے اور عبداللہ کے عتاب کا شکار نہ ہونے دے ایک دو بار باجی کے ادھر ادھر ہونے پر عبداللہ کو ڈانٹ بھی دیا، جس سے میرے بچوں کے چہروں پر رونق آ گئی۔ شکر تھا کہ اس نے واویلا نہیں کیا اور باہر چلا گیا۔

شام کو باجی کو اگلے دن واپسی کا بتایا تو وہ ہکا بکا رہ گئیں۔

"آئے ہائے اتنی بھی کیا جلدی ہے چھری کے تلے دم تو لو، کیا ہو گیا۔ ہماری خاطر داری میں کوئی کمی رہ گئی کیا۔ ابھی رہو کچھ دن اور اچھا لگ رہا ہے تمہارے آنے سے۔"

یہ تو ہم سے پوچھیے کہ ہمیں کیسا لگ رہا ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔

"نہیں باجی، زینب کو پانی موافق نہیں آ رہا اس کے پیٹ میں درد ہے۔" (آج سارا دن اس نے ایکٹنگ کی تھی) بہتر ہے گھر چلیں۔ ابی بھی گھر میں اکیلے ہیں مشکل ہوتی ہو گی (حالانکہ گھر کی مشکلیں اب آسان لگ رہی تھیں۔ اپنے گھر میں کام خوشی اور مرضی سے کیا جاتا ہے اور دوسرے کے گھر جبر اور زبردستی سے)"

"چلو ٹھیک ہے۔ تمہاری مرضی آج رات پیزا پارٹی میری طرف سے۔" باجی نے حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے کہا۔

رات کے کھانے میں پیزا کا پیس پیزے کے ڈبے کو پھاڑ کر ایک گتے کے کاغذ پر رکھ کر پیش کیا گیا۔ "رانی ہم یوں ہی کھاتے ہیں پلیٹوں کی دھلائی بچ جاتی ہے نہ۔"

بچوں کو بوتل چائے کے کپوں میں ڈال کر دی گئی کہ زیادہ بوتل مضر صحت ہے۔

(ایک بڑی سی ٹرے + پلیٹس + گلاس پیزا نکالنے کا چمچ سب سازوسامان کے ساتھ پیزا کھایا جاتا)

بھائی نے سیٹیں کروا دیں اور وہ ٹرین میں بیٹھے لوٹ کے بدھو گھر کو آئے کی تشبیہ بنے بیٹھے تھے۔

"ممّا آپ اتنی خدمت کرتی ہیں پھپھو کی لیکن انہوں نے تو یہاں بھی آپ سے ہی اپنی خدمت کروائی۔ ہمارا گھر ہے کون سا جہاں ہم عبداللہ کی طرح من مانی کر سکیں ان کے بچوں سے خدمت کرا سکیں۔"

زینب کے سوال چلتی ٹرین میں پھر شروع ہو گئے تھے۔

اس نے مسکرا کر زینب کو اپنے ساتھ لگایا۔ کیونکہ اس کے سب سوالوں کے جواب وہ اس کو ابھی نہیں دے سکتی تھی۔ جن کی مائیں زندہ ہوتی ہیں ان کی بیٹیاں یوں ہی راج کرتی ہیں۔ اور جن کی مائیں زندہ نہیں ہوتیں وہ اس کی طرح خوار ہوتی ہیں۔ میکے بیٹیوں کو آباد رکھتے ہیں رشتے ناتے مضبوط رکھتے ہیں۔

اللہ سب کے میکے مضبوط رکھے اگر میری ماں زندہ ہوتی تو شاید میرا رویہ بھی باجی جیسا ہی ہوتا۔ لیکن مجھے اپنے بیٹے کو وقت آنے پر سمجھانا تھا کہ بہنوں کو بوجھ نہیں سمجھنا عزت دینا ہے۔

☆☆

Digest Novels Lovers Group

سنیعہ عمر

کر چلے جاں نثار ہم

آخری قسط

باز بہت بہترین شکاری ہوتے ہیں۔ نظر ہو یا رفتار۔ دونوں مثالی۔ باز کی چونچ کے اوپری حصے میں ایک نوکیلا کٹاؤ ہوتا ہے۔ جس کی مدد سے وہ اپنے شکار کو ایک جان لیوا چٹکی کاٹ کر ختم کر دیتا ہے۔ شکار کے شوقین لوگوں کے لیے باز سے بہتر علامتی نشان کیا ہو سکتا ہے؟

محراب خان کے پاس بھی ایک باز تھا۔ جو اس کے وفاداروں نے ایک سخت علاقائی مقابلے میں دشمن کو شکست دے کر جیتا تھا۔ وہ محراب خان کی شان و شوکت اور جیت کی زندہ نشانی تھی۔ اس کے لیے ایک پرشکوہ پنجرہ بنایا گیا تھا۔ جو حویلی کے بڑے باغ کے بیچ و بیچ قائم تھا تاکہ لوگ آتے جاتے اس کو دیکھ سکیں۔

اس کو خوراک بھی اس کے رتبے کے مطابق دی جاتی تھی۔ ایک روز زمان خان اپنے دوستوں کے ساتھ اس جگہ کھیل رہا تھا۔

''یہ باز ہمیں مقابلہ جیتنے پر ملا تھا۔ ہارنے والوں کی شکلیں دیکھنے والی تھیں۔'' زمان نے سینہ چوڑا کر کے بتایا۔

''لیکن یہ قید کیوں ہے؟'' اس کے ساتھی بھی بچے تھے۔ بچگانہ سوال پوچھنے لگے۔

''یہ قید میں ہی رہتا ہے۔ ورنہ تو اڑ جائے۔'' زمان نے کہا۔

''پھر اس کے ہونے کا کیا فائدہ، تم اس سے کھیل بھی نہیں سکتے۔'' ایک نادان دوست نے سر کھجا کر کہا۔

بشار وہاں قریبی درخت پر چڑھ کر پھل توڑ رہا تھا [illegible] باز کے پنجرے [illegible] اور گرد دیکھ کر اس کی توجہ بھی ادھر ہی ہوئی۔

digest library.com

''یہ بہت خطرناک جانور ہوتا ہے ایک جھٹکے میں رگ کاٹ سکتا ہے۔ یہ بچوں کے کھیلنے کے لیے نہیں ہے۔'' ایک سمجھ دار لڑکا بولا۔

''میں بچہ نہیں ہوں'' زمان نے غصے سے کہا۔ ''میرے دادا یہ باز نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں۔ یہ میرے ہاتھ سے کھانا بھی کھاتا ہے۔''

زمان خان نے مزید اپنی بڑائی بتائی۔ تب محراب خان اس کے لیے دادا تھے۔ آہستہ آہستہ شفقت کا پہلو کم ہوتا گیا اور وہ باقیوں کی طرح اس کے لیے بھی خان صاحب بن گئے۔

''اچھا یہ تمہارے دادا کا پرندہ ہے۔'' پہلے والا دوست قائل ہو گیا۔ مگر مرعوب نہیں ہوا۔ زمان خان تو اسے مرعوب کرنا چاہتا تھا۔

''میرے دادا کا ہے، مطلب میرا ہے۔ جو کچھ ان کا ہے وہ میرا ہی ہے۔ وہ مجھ سے ہمیشہ یہی کہتے ہیں۔ رکو میں تمہیں نکال کر دکھاتا ہوں دیکھنا میرے ہاتھ پر بیٹھ جائے گا۔''

زمان خان لاڈلا بھی تھا اور بہادر بھی۔ بشار بھی درخت سے نیچے آ گیا۔ وہ ابھی اسی خیال میں تھا کہ زمان روکے یا نہ روکے کہ زمان نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ وہ اتنی تیزی سے اڑا کہ بچوں کے ہوش اڑ گئے۔ اڑتے ہی وہ ایک قریبی درخت پر جا بیٹھا۔ جس بچے نے اس کے خطرناک شکاری ہونے کی کہانی سنی تھی۔ وہ اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر زمین پر اوندھا لیٹ گیا کہ کہیں اس پر حملہ نہ ہو جائے۔ دوسرا بچہ گارڈز کی طرف بھاگا۔ سب اکٹھے ہو گئے۔

زمان ابھی بچہ تھا گارڈ نے اس کو گھبراہٹ میں ڈانٹ دیا۔ زمان خود بھی ڈر گیا۔ بشار تب آہستگی سے آگے بڑھا کہ جس درخت پر باز ہے اس پر چڑھ کر باز پکڑ لے۔ زمان نے بشار کو آگے جاتے دیکھا تو چلایا۔

''تم ہٹو، یہ میرا پرندہ ہے۔ اس کو میں پکڑوں گا۔'' زمان کا یہ کہنا تھا کہ باز نے اگلی پرواز بھرلی۔ اور سب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

digest library.com

اس کے بعد زمان خان کو اپنے دوستوں کی پرواہ نہ رہی۔ اسے تو اپنی فکر پڑ گئی، اسے کتنی ڈانٹ پڑے گی وہ یہ سوچ کر ہی روہانسا ہو گیا تھا۔ پھر سب مل کر محراب خان کے پاس پہنچے۔

''بڑے خان! وہ باز اڑ گیا۔ چھوٹے خان نے پنجرا ہی کھول دیا۔'' ملازم نے سارا الزام زمان پر دھرا۔ اسے اپنی جان پیاری تھی۔

محراب خان نے مڑ کر مجمعے میں سے زمان کو ڈھونڈا پھر ایک لمحہ غصے سے اس کو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ زمان خان کو لگا دنیا نے اس سے منہ پھیر لیا ہو۔

''باز کا پیچھا کرو۔ راستے میں جال بچھا دو۔ سب سے بہترین باز پکڑنے والا آدمی تو اسی گاؤں کا ہے جس کو ہرا کر ہم نے باز کو جیتا تھا۔ اس کو بلایا تو مخالف کو پہلے معلوم ہو جائے گا کہ ہم نے اپنا انعام کھو دیا ہے۔ اسے تم لوگوں نے ہی لانا ہے۔'' محراب خان نے حکم صادر کیا۔

زمان تب تک کھسک کر ان کے قریب آ گیا تھا۔ تا کہ براہ راست معافی مانگ لے۔ مگر محراب خان اس کو موقع دیے بغیر وہاں سے چلے گئے۔ زمان مزید اداس ہو گیا۔ اس ہی مجمعے میں بشار بھی تھا۔ جو سب دیکھ اور سن رہا تھا۔

☆☆☆

علی الصبح زمان خان نے اپنا گھوڑا نکالا اور کسی کو بھی بتائے بغیر جنگل کی اس سمت چلا گیا۔ جہاں پر اس کا اندازہ تھا کہ باز گیا ہو گا۔ وہ اکیلا اس باز کو پکڑ کر واپس لائے گا اور سب کے منہ بند کر دے گا۔ وہ بندوق نہیں لایا تھا، تیر لایا تھا۔ اس کا ارادہ تھا باز کو زخمی کر کے زمین پر گرا لے۔ پھر حویلی کے ملازم اس کا خیال رکھ کر دوبارہ صحت یاب کر لیں گے۔

اس نے گھوڑے کو روکا اور آسمان پر نظر اٹھا کر باز کو دیکھنے لگا۔ تیر کمان اس کے ہاتھ میں مچل رہا تھا۔ کچھ دیر کے سناٹے کے بعد اسے باز کی آواز آئی۔ اس نے کمان میں تیر کھینچ کر باز کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔

''شش۔ وہ ایسے مر جائے گا۔'' کسی نے اس سے سرگوشی کی۔

زمان گھوڑے سے اتر گیا۔ اور سرگوشی والی جگہ غور سے دیکھنے لگا۔ جھاڑیوں کے بیچ میں بشار چھپا بیٹھا تھا۔

''میں اسے ماروں گا نہیں، صرف زخمی کروں گا۔'' زمان نے اپنا ارادہ بتایا۔

''میں نے جال بچھایا لگایا ہے۔ وہ ایک دو بار اس کو دیکھ کر جا چکا ہے۔ اس کی تسلی ہونے دو کہ آس پاس کوئی نہیں پھر وہ اس جال میں ضرور آئے گا۔'' بشار نے تحمل سے کہا۔ وہ بہت دیر سے پنجرہ ڈالے بیٹھا تھا۔

زمان نے بھی دیکھا، وہ ایک فٹ کا چوہے کا پنجرا تھا جس کے نیچے جال بچھا تھا۔ پنجرے کے اندر چوہا تھا جو پھڑ پھڑا رہا تھا۔ باز چوہے کو کھانے کے لیے آتا تو خود جال میں پھنس جاتا۔

''اس باز کو میں نے اڑایا تھا۔ اس کو میں ہی پکڑوں گا۔'' زمان نے غرور سے کہا۔ پھر اس نے تیر کمان آسمان کی طرف تان لی۔

جیسے ہی اس کو باز نظر آیا۔ زمان نے تیر چھوڑ دیا۔ اس کا نشانہ چوکا اور باز چوکنا ہو گیا۔ وہ باز تھا مگر جنگلی نہیں تھا، اس کو ابھی اپنا شکار ڈھونڈنا نہیں آتا تھا۔ وہ شکاری باز ہوتا تو اسے شکار کے لیے رکھا جاتا۔ وہ نمائشی باز تھا اس لیے اسے ٹرانی کی صورت دے دیا گیا تھا۔ اب تیر سے بچ کر باز کو وہاں سے اڑ جانا چاہیے تھا لیکن وہ گھبرا کر زمین پر اتر آیا۔ اسی زمین پر جہاں پنجرہ پڑا تھا۔ زمان نے بھی دوسرا تیر چلانے کی غلطی نہیں کی۔ بہت مشکل صبر تھا، بہت لمبا انتظار۔ جوان دونوں نے اپنی اپنی جگہ پر ساکت ہو کر کیا۔ آخر باز چوہے کو حاصل کرنے کے چکر میں اتاولا ہو گیا اور اس کا پاؤں جال میں پھنس ہی گیا۔ بشار کے ہاتھ میں چمڑے کا دستانہ تھا۔ بشار نے باز کو احتیاط سے تھام کر جال سے آزاد کیا اور دستانے کی زنجیر سے باندھ دیا۔ باز بھی سدھایا ہوا پالتو تھا اس نے کوئی حملہ نہیں کیا۔

زمان کو سب یاد آ گیا۔ اپنے دوستوں کے سامنے اپنی بے عزتی، دادا کا منہ پھیر لینا، ملازموں سے جھڑکی کھانا اور اپنے ہی گھر میں مجرم بن کر رہنا۔ وہ سب ویسے کا ویسا رہنا تھا کیونکہ باز کو بشار نے پکڑا تھا اس نے نہیں۔

بشار خوشی سے باز کو اپنے ہاتھ پر بٹھائے حویلی کی طرف واپس جا رہا تھا اور زمان کا جلن سے برا حال تھا۔ وہ پہلا دن تھا جب زمان نے بشار پر غور کیا تھا۔ ہاں وہ ایک لڑکا تھا جو کچھ چیزوں میں بہت اچھا تھا۔ تربیت کے مرحلے میں اکثر وہ سب سے بہترین ثابت ہوتا تھا۔ لیکن وہ اس قدر اچھا ہے کہ باقی سب کو پیچھے چھوڑ دے گا۔ یہ زمان نے اس دن جانا تھا۔

زمان کا دل چاہا کہ اس کے ہاتھ سے باز کو چھین لے۔ بلکہ اسے چھیننے کی ضرورت بھی کیا تھی، وہ ایک حکم دیتا اور اس لڑکے کو اسے باز دینا ہی پڑتا۔ وہ زمان خان تھا۔ کوئی یتیم ملازم نہیں۔ لیکن یہاں اس کی اپنی انا آڑے آ رہی تھی۔ وہ غصے سے اس کو جاتا دیکھ رہا تھا۔ قسمت زمان کی بھی بہت اچھی تھی۔ اپنے جوش میں تیز تیز چلتے بشار نے یہ نہیں دیکھا کہ ایک جگہ پر پانی نے کیچڑ بنا دیا تھا۔ بشار کی رفتار اور وہ پھسلا ہوا اس کیچڑ میں آن گرا۔

اس اچانک افتاد پر باز بھی پھڑپھڑایا اور اس نے بشار کے بازو پر کاٹ لیا۔ تب زمان اس کی مدد کو آیا اور اس نے باز والا دستانہ بشار سے لے کر اپنے ہاتھ میں پہنا اور باز کو پرسکون کیا۔

کچھ دیر بعد حویلی والوں نے دیکھا۔ زمان اپنے گھوڑے کو شان سے دوڑاتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پہ وہی باز دیکھ کر سب دور سے ہی جشن منانے لگے۔ محراب خان بھی اس وقت باز کے پنجرے کے پاس موجود تھے۔ اپنے پوتے کو اس شان سے واپس آتا دیکھ کر ان کا سینہ چوڑا ہو گیا۔ اس کے کچھ پیچھے کیچڑ سے لت پت بشار بھی تھا۔

"آج تم نے ثابت کر دیا تم میرے ہی پوتے ہو میرے جانشین۔" انہوں نے زمان کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

سب زمان کی پیٹھ ٹھوک رہے تھے۔ کل اسے ڈانٹنے والے آج اسے سلام کر رہے تھے۔ اسی سب میں زمان نے دیکھا کہ بشار منہ نیچے کر کے جا رہا ہے۔

"خان صاحب اسے میں نے اکیلے نے نہیں پکڑا۔ اسے بشار نے بھی پکڑا ہے۔" زمان نے اشارہ کیا۔

جاتا ہوا بشار رک گیا۔

"شاباش بچے! ایسے ہی اچھا کام جاری رکھو۔" محراب خان نے بشار کو دیکھ کر کہا۔

ان کی شفقت کو ترستے بشار کے لیے یہی بہت تھا کہ محراب خان نے اس سے بات کی۔ وہ بے انتہا خوش ہو گیا۔

وہ تو بعد میں ملازموں نے اسے الگ بٹھا کر، سارا معاملہ پوچھ ہی لیا تھا کہ اصل میں تو پکڑا اس نے ہی تھا۔ کسی نے اس طرف اشارہ بھی کیا کہ جب پکڑا اس نے تو زمان خان نے ساری تعریف خود کیوں بٹور لی۔ مگر بشار کے لیے یہی کافی تھا کہ زمان نے اپنی بڑائی کروانے کے بعد اس کا نام بھی لے لیا۔

زمان کسی سے کمتر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کو یا آگے ہونا پسند تھا یا برابری کی سطح پر۔ یہ بات بشار بچپن سے جانتا تھا۔

☆☆☆

digest library.com

کبھی کبھی دل کرتا ہے دنیا آپ پر چلا لے۔ آپ کو برا بھلا کہہ لے یا کم از کم آپ سے سوال پوچھ لے۔ سب کر لے بس چبھتی مشکوک نظروں سے نہ دیکھے۔ پرنسپل کے آفس سے لے کر اپنے کمرے تک کا راستہ ان دونوں نے ایسی ہی چبھتی نظروں کے حصار میں طے کیا تھا۔

چہرے پر غصیلے تاثرات لیے وارڈن ان کے آگے چل رہی تھیں۔ نوکری کی مجبوری۔ ورنہ نظر آ رہا تھا کہ اگلے چند ہفتے انہیں ان دولڑکیوں کے پیچھے راتیں بھی جاگ کر گزارنی ہوں گی۔ درثمین نے تو نظریں جھکا لیں۔ اتنا کچھ ہو گیا تھا تو یہ بھی سہی۔ لیکن لائبہ سے نظر پھیری نہ گئی۔ وہ تو ان سب کی چہیتی ہوا کرتی تھی۔ اسے یاد تھا، اس کے سیکنڈ آنے پر اس کو اتنا دکھ نہیں ہوتا تھا جتنا باقیوں کو۔ کوئی بھی موقع ہو، ہر طرف سے یہی لڑکیاں تو لائبہ لائبہ کا شور مچاتی تھیں۔ کیونکہ لائبہ آتی تو رونق لگاتی۔ خیر رونق تو لائبہ نے اس بار بھی لگا دی تھی البتہ اس بار وہ تماشا تھی اور باقی سارے تماش بین، اپنے کمرے میں جا کر لائبہ نے دروازہ بند کیا، پھر دروازے سے چند قدم دور ہو کر بند دروازے کو دیکھنے لگی۔ وارڈن کے قدموں کی چاپ پلٹ گئی تھی۔

اب لائبہ منتظر تھی کہ کوئی اندر آئے گا۔ امبر؟ اس کی روم میٹس؟ ثنا ہی آ جائے۔ ویسے ہر دوسرے دن ان سے چائے کا سامان لینے آتی تھی، مگر کوئی نہیں آیا۔

''لائبہ بیٹھ جاؤ۔'' درثمین نے اسے پیار سے پچکارا۔

لائبہ سے رہا نہیں گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر خود ہی دروازے کے دونوں پٹ کھول دیے۔ تب اس نے دیکھا۔ باہر ٹولیوں کی صورت کئی لڑکیاں کھڑی ان کے دروازے کو دیکھ کر باتیں کر رہی تھیں۔ امبر اور لائبہ کی اپنی سہیلیاں بھی ایک گروہ میں کھڑی تھیں۔ لیکن لائبہ کے اچانک دروازہ کھلنے سے ساری ایک دم سے ایسے گھبرائیں کہ فوراً منہ چھپاتی ہوئی اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں، جیسے لائبہ نہیں کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

تب درثمین آگے بڑھی۔ اس نے لائبہ کا ہاتھ تھام کر اس کو اندر کیا اور دروازہ بند کر دیا۔

''سب ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔'' درثمین نے اسے تسلی دی حالانکہ وہ جانتی تھی کہ ابھی جو ہوا ہے، وہ ایسا ہی رہے گا۔ البتہ آگے جو ہو شاید وہ ٹھیک ہو سکے۔''

''یہ سب مجھے ایسے کیوں دیکھ رہی تھیں؟ میں تمہاری مدد کرنے گئی تھی۔ وہ تو اچھا کام ہوا ہے؟'' لائبہ نے حیرت سے پوچھا۔

''میں جانتی ہوں۔ باقی بھی سب سمجھ جائیں گے۔ ابھی بہت جلدی ہے۔'' درثمین نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

درثمین اس کو کیا بتاتی۔ وہ عمر کے جس حصے میں تھیں۔ وہاں تین چار لمحے کی لغزش بھی ساری عمر کی سزا بن جاتی ہے اور لائبہ تو تین چار دن غائب رہی تھی۔

''میرا سامان کہاں ہے؟ تمہارا معلوم نہیں لیکن مجھے تو سفر سے آ کر فوراً کپڑے بدلنے ہوتے ہیں۔'' درثمین پہلے سے بھی مضبوط ہو کر آئی تھی۔ اپنی ساری پریشانیوں کو پس پشت ڈال کر اسے اب لائبہ کے لیے مزید مضبوط بننا تھا۔

''تمہارا سامان بیگ میں ڈال کے رکھا تھا۔ آنٹی کو کہا تھا لے جائیں، انہیں یاد ہی نہیں رہا۔'' لائبہ نے بتایا۔ وہ وارڈن کی تحویل میں تھا۔ لائبہ کا سامان اویس نے کچھ دیر بعد بھجوانا تھا۔ اسی بات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کا آنا صرف جا کر واپس آنے کی بات نہیں تھی۔ وہ تو اجڑ کر دوبارہ بسنے کی بات تھی۔ درثمین نے اپنا سامان نکلوایا اور کمرے میں لے کر آئی۔

درثمین نے ایک جوڑا لیا۔ اپنا شیمپو اور تولیہ پکڑا۔ پھر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ باتھ روم جانے کا سب

digest library.com

سے طویل راستہ اپنا کر وہ بے مقصد اور غیر ضروری پھرتی رہی۔ جن سے بات کرنا اسے پسند نہیں تھا، ان کو بھی خود پکار کر سلام کیا۔ اسے فرق نہیں پڑتا تھا لیکن لائبہ کو فرق پڑتا تھا۔ جب وہ اس کے لیے دنیا سے لڑ سکتی تھی تو کیا در ثمین اس کے لیے ہاسٹل کی چند لڑکیوں کو رام نہیں کر سکتی تھی؟

در ثمین کے کمرے سے باہر جاتے ہی لائبہ نے اپنے گھر پر فون ملا لیا تھا۔

digest library.com

☆☆☆

محراب خان ایسے معاملوں میں بہت دھیان دیتے تھے کہ کون دیکھ رہا ہے۔ وار سر عام ہونا چاہیے یا چھپ کر۔ اس کا مقصد کیا ہے؟ مرنے والے سے مرنے سے پہلے کیا بات کہلوائی جائے جس سے ساری عمر کی ... کہ محراب خان کے آگے جھکنے میں ہی بہتری ہے۔ لیکن اس وقت وہ سب بھول گئے تھے کیونکہ اس بار مقابل بشار تھا۔

"میں تمہیں تخت پر بٹھانے کی تربیت دے رہا تھا۔ لیکن تم؟ تم نے یہ کیا کر دیا اپنے ساتھ؟" محراب خان اپنے کمرے سے خود چل کر آئے تھے۔ یاسین اور راز دونوں کو ان کے بندوں نے پکڑ کر گھٹنوں پہ جھکایا ہوا تھا۔ لیکن کسی میں ہمت نہیں تھی کہ بشار کو چھو بھی سکے۔

"تخت آپ کو پسند ہے۔ مجھ جیسوں کو وہ کچی مٹی کی زمین پسند تھی۔ جہاں میری ماں کے قدم پڑتے تھے۔"
بشار کی آنکھوں میں شکوہ، دکھ، بے یقینی کیا کچھ نہیں تھا۔

"کیڑوں کو مٹی ہی پسند ہوتی ہے۔" یہ جملہ زمان نے کہا تھا جو اسی وقت وہاں داخل ہوا تھا۔

"تمہیں ہم ایک بڑے مقصد کے لیے تیار کر رہے تھے۔ لیکن تمہیں بھی مرضی کا کیڑا لگ گیا ہے۔ شاید اس حویلی کے زمین بوس ہو جانے پر مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔ جتنا آج اس بات کا دکھ ہے کہ تم ناکارہ نکلے۔" محراب خان اس کی آنکھوں میں دیکھ کر تاسف سے کہہ رہے تھے۔

"آپ کو انسان نہیں ایک ہتھیار چاہیے تھا، تیز نوکیلا، فرماں بردار اور بے جان۔"

"وہ احسان کیسے بھلاؤ گے جو میں نے تم پر کیے ہیں۔"

"وہ تو کب کے آپ کے مظالم کی سسکیوں کی نذر ہو گئے۔"

"احسان بھولنے والے کو جانتے ہو، کیا کہتے ہیں؟" اس بار محراب خان کو صرف سسکیاں نہیں سنی تھیں۔ ...نت سنی تھی۔

"اپنے اندر کے طوفان کو چپ کروا کر آپ کے آگے سر جھکایا ہے۔ پھر بھی احسان فراموش کہلایا۔ اس لقب کے لیے ناانصافی چھوٹا لفظ ہے۔ ابھی بھی میں بھاگنے والا نہیں تھا۔ مجھے بس ان دونوں کو ان کی جگہ پہ پہنچانے دیں۔ میں خود ادھر آؤں گا۔ پھر چاہے کھال اتروا دینا یا سر۔" بشار نے کہا۔

زمان سمیت ادھر موجود کسی شخص کو اس کی زبان پر شک نہیں گزرا۔ سب جانتے تھے اس وقت بشار کو چھوڑ دیا گیا تو وہ اپنا کام پورا کر کے دوبارہ آئے گا کیونکہ اس نے کہا تھا اور وہ اپنی بات پوری کرتا تھا۔

"خان! اس کو جانے دیں۔ یہ اب آپ کے کام کا نہیں رہا۔" زمان نے کہا۔

سالوں سے ان کے بیچ جوان دیکھا مقابلہ چل رہا تھا۔ آج راستے الگ کر کے بشار خود ہی اس سے دست بردار ہو گیا تھا۔

"ایک میرا قاتل اور دوسرا غدار۔ تم ان دونوں کو بچانا چاہتے ہو؟" محراب خان اس بار تضحیک سے بولے۔

"زندگی میں اگر آپ کو پانچ قاتل ملے تھے تو پانچ سو وفادار بھی ملے تھے۔ جو آپ کے نام پر کٹ مرنے کو

تیار تھے۔ اسی خوشی میں ان نادان بچوں کو معاف کر دیتے۔ وہ قاتل نہیں بچے تھے۔''

بشار خود نہیں جانتا تھا، یہ باتیں اس کے اندر سے کیوں نکل رہی تھیں۔ لگ رہا تھا کہ اس نے آج ہی بولنا سیکھا ہو۔

''اگر تم مجھے میرے سر کا صدقہ اتارنے کا کہہ رہے ہو تو ٹھیک ہے۔ جاؤ۔ تم جاؤ۔ جہاں جانا چاہتے ہو جاؤ۔ پلٹ کر آؤ، نہ آؤ میں کبھی تمہارا پیچھا نہیں کروں گا۔ لیکن ان دونوں کے لیے معافی نہیں ہے۔ یاسین نے میرے قتل کا منصوبہ بنایا تھا اور ارباز نے وہ کنواں کھولا تھا جس میں برسوں پہلے خود بند کروا تو کہ میرے پانی میں کسی کی شراکت [illegible] نہ ہو۔''

digest library.com

بشار نے اس لمحے سر اٹھا کر ان سارے آدمیوں کو دیکھا۔ جواب سے پہلے اس کا حکم بجا [illegible]

[illegible]

[illegible] سے محراب خان کو۔ کیونکہ وہ یہ جانتے تھے کہ بشار محراب خان کی زبان بولتا ہے۔

''میں نے تو نیا نیا بولنا سیکھا ہے، مجھے بولنے دیں۔ لیکن آپ سے گزارش ہے کہ آپ اپنے الفاظ تھام لیں۔ ابھی ابھی آپ نے ان تمام لوگوں کے سامنے خود ہی یہ بتا دیا ہے کہ ارباز کے خاندان کے ساتھ جو کچھ ہوا۔ آپ نے کروایا تھا۔ ارباز کے بھائی کے قتل کے پیچھے بھی آپ کا ہاتھ تھا، اور وجہ پانی کی شراکت تھی۔''

بشار خان نے با آواز بلند کہا۔ اردگرد موجود سارے بندوں نے جب یہ سنا تو وہ ہل گئے۔ اندرونی ہلچل تو ہوئی ہی ہو گی لیکن وہ بچ میں ہل گئے۔ وہ سب پہلے بشار کے اردگرد گھیرا بنائے ہوئے تھے۔ اب وہ ہل کر محراب خان کا چہرہ تکنے لگے، شاید کہ کوئی تردید آئے۔

محراب خان بس غصے سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ان ادنیٰ درجے کے لوگوں کو وضاحت دینا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ محراب خان سوچنے لگے جب بشار خان کا سر تلوار کی نوک پر ہو سکتا ہے تو ان کی اہمیت ہی کیا تھی۔

ان کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی ارباز اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی لمحے اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کا بھائی نہیں رہا۔

محراب خان غصے سے سرخ ہوئے اور اگلے ہی لمحے انہیں ایسا لگنے لگا کہ وہ دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ بساط یوں پلٹتی ہے۔ انہوں نے زمان خان کو دیکھ کر آنکھوں سے اشارہ کیا۔

زمان کا ہاتھ اپنی جیب میں موجود بندوق کی طرف گیا۔ وہ بچپن تھا جب اسے بشار سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ بعد میں اسے بشار کے وجود سے نفرت ہو گئی تھی۔ اچھا تھا اگر بشار کا انجام بھی اس کے ہاتھ لکھا تھا۔ ایک گولی بس لیکن پھر وہ رک گیا۔ وہاں موجود لوگ یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں گے کہ زمان خان نے نہتے بشار کو مار دیا۔ اسے اس کو نیچا دکھانا پسند تھا۔ لیکن اس کی جان لینا وہ صحیح نہیں لگ رہا تھا۔ بشار کو ہرانے کے اور بھی طریقے تھے۔

''خان، اس کی ضرورت نہیں اسے جانے دیں۔ اسے اس زمین کے علاوہ کچھ معلوم نہیں۔ یہاں سے جلا وطن کرنے سے بڑی سزا اس کے لیے کیا ہو گی؟ یہ تڑپ تڑپ کر جیے گا۔ آپ کو اب اس سے کوئی خطرہ نہیں۔''

زمان نئی سوچ کا حامل تھا۔ جب سیدھی انگلی سے بات بن رہی ہو تو انگلی ٹیڑھی کرنے کی ضرورت کیا تھی۔

''حکمران کو خطرہ تلواروں سے نہیں، خیالوں سے ہوتا ہے۔ بشار وہ باغی خیال ہے جس کو میں سانس لینے نہیں دے سکتا۔ تم میں ہمت نہیں تو میں خود قصہ ختم کروں گا۔''

محراب خان نے وقت ضائع کیے بغیر۔ ہاتھ بڑھا کر زمان کی جیب سے اس کی بندوق نکالی۔

''خان! میں سمجھ سکتا ہوں جب کوئی اپنا فرماں بردار دھوکہ دیتا ہے تو کتنا برا لگتا ہے۔ کیونکہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جب فرماں بردار وقت پر کام آ جائیں تو کتنا اچھا لگتا ہے۔'' بشار نے کہتے ہی ایک سیٹی بجائی۔

محراب خان کے ہاتھ اس کا جملہ سمجھنے میں لحہ بھر کو ست ہوئے تھے۔ اگلے ہی لمحے چیختے چنگھاڑتے ہوئے کتے دوڑتے ہوئے آئے اور محراب خان پر حملہ کر دیا۔ یہ وہ گوشت خور کتے تھے۔ جن کو بشار نے بچپن سے پالا

تھا۔ جن کی مدد سے وہ نئے لڑکوں کو تربیت دیتا تھا۔ وہ اس کا ہر اشارہ سمجھتے تھے اور اس کے کہنے پر جان بھی لے سکتے تھے۔ محراب خان کے ہاتھ سے بندوق دور جا گری۔ وہ زمین پر بہت قوت سے گرے۔ تینوں خون خوار کتے ان کے سینے پر کھڑے ہو کر رال ٹپکا رہے تھے۔

digest library.com

☆☆☆

''جس اویس کا نام تم اتنے استحقاق سے لے رہی ہو کہ وہ تمہارے ساتھ تھا۔ یاد رکھنا پہلا پتھر مارنے والا بھی وہی ہوگا۔ جب مرد شوہر بنتا ہے تو صرف شوہر ہی رہتا ہے۔ اور تب جب وہ تم سے کہے گا کہ تم تو ایسی تھیں کہ ماں باپ کو بنا بتائے نکل گئی تھیں۔ تب تمہیں احساس ہوگا کہ تم نے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔'' اس کی ماں نے کہا۔ یہ بددعا نہیں تھی، ایک ماں کا خدشہ تھا۔

وہ فون اتنا طویل ہو گیا تھا کہ ایک بار کٹ کر دوبارہ ملا تھا۔ درثمین نہا کر کمرے میں آئی تھی پھر کسی بہانے سے دوبارہ باہر چلی گئی۔ لیکن فون اب تک جاری تھا۔

''آپ ناراض رہیں گی تو میرے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہوگا، آپ معاف کر دیں۔'' لائبہ پہلے دلیلیں دے رہی تھی، اب معافی پر آ گئی۔

''ماں ہوں۔ تمہارے لیے برا نہیں سوچ سکتی لیکن معاف کیسے کروں؟ ایک بار معاف کیا تو تم دوبارہ ایسی حماقتیں کرو گی۔'' ان کا غصہ بھی جائز تھا۔

''آپ دعا دینا نہیں چھوڑیں گی تو میں بڑی سے بڑی مشکل سے بچ کر نکل آیا کروں گی۔''

اب وہ ننھی بچی کی طرح ہو گئی تھی جس کا مقصد صرف ماں کو منانا تھا۔

''ایسی مشکلیں سر پر لیتی ہی کیوں ہو۔ میری سمجھ سے باہر ہے تم کیا سوچ کر نکل گئی تھیں؟ پڑھائی تمہیں شعور دینے کی بجائے بے عقل کیوں کر رہی ہے؟ دل کر رہا ہے ابھی تمہیں واپس بلا لوں۔ پر کیا فائدہ میں گھر میں ہی رہتی ہوں۔ دروازے کھڑکیاں یہاں بھی ہیں۔''

خاندان میں یہ بات، ان ماں باپ تک محدود رہی تھی مگر یہ بات اتنی بڑی تھی کہ ماں باپ ہونے کے باوجود معاف کرنا آسان نہیں تھا۔ لائبہ مناتی گئی۔ یہ سوچ کر کے تب تک مناتی رہے گی جب تک اسے معاف نہ کر دیں۔

''شکر کرو اویس نے تمہارا پردہ رکھا ہے، اپنی ماں کو کچھ نہیں بتایا۔ ورنہ سوچو، تمہارا کیا تاثر جاتا۔''

لائبہ نے اسی لمحے شکر کیا، تب اسے لگا۔ وہ کس کس چیز کا شکر کرے۔ اویس کا پردہ رکھنے کا، اس کے بچانے کا، یا اس کے بن کہے سمجھ جانے کا؟

☆☆☆

محراب خان کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ زمین پر بے بسی سے گرے وہ کتوں کی رال خود پر ٹپکتے دیکھ رہے تھے۔ اب تک انہوں نے زندگی میں ڈرایا تھا۔ آج وہ ان تمام ڈرنے والوں کی بے بسی محسوس کر رہے تھے۔

بشارت نے اپنے قریب کھڑے آدمی سے بندوق اچک لی۔ اب وہ ہر طرح سے مضبوط تھا۔ وہ آدمی اس پر پہلے بھی گولی نہیں چلانا چاہتے تھے۔

اب انہیں وجہ مل گئی تھی۔ محراب خان کو موت سے پہلے ایک مردہ نظر آیا۔ ان کو اس پہلے شخص کی صورت نظر آئی جس کی انہوں نے جان لی تھی۔ پھر دیکھتے دیکھتے وہ منظر مجمعے میں بدل گیا۔ محراب خان کو لگا کتنے نہیں وہ سارے مردے خوں خوار ہو کر ان کو نوچ کھانے آ گئے ہیں۔ وہ کانپنے لگے۔ وہ بے بس تھے چاہ کر بھی ہل نہیں پا رہا تھا۔ موت سے پہلے جان کیوں نکل گئی تھی؟

digest library.com

"بشار میرے بچے! تم تو میرے اپنے ہو، تم میرے ساتھ ایسے نہیں کرسکتے، مجھے معاف کر دو۔ میں تمہیں دل سے اپنا مانتا ہوں۔ تمہیں کیا چاہیے نام لو۔ سب ملے گا۔ تم تو میرے پیارے ہو۔" وہ منت کرنے لگے۔

وہ منظر منت کا متقاضی تھا۔ لیکن کسی نے نہیں سوچا تھا منت محراب خان کریں گے۔

"کچھ بھی مل جائے کیا فائدہ۔ ان سارے بندوں نے دیکھ لیا ہے کہ میری حیثیت بدل گئی ہے۔ ان سب کے جیتے جی میرا مقام پہلے جیسا نہیں ہو سکے گا۔" بشار نے کتوں کو اشارہ کیا وہ آگے ہوئے۔ ایک نے دانت محراب خان کے گوشت میں گاڑے۔

"یہ سب یہاں سے زندہ نہیں جائیں گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں، مجھے چھوڑ دو۔" محراب خان چلائے۔ ان کے وہی آدمی جواب بھی ہتھیار سے لیس تھے ڈگمگا گئے۔ وہ کیا بھیڑ بکریاں تھیں؟ جو محراب خان ان کو مارنے کی بات کر رہے تھے۔

زمان خان نے اپنی گری ہوئی بندوق اٹھائی۔ وہ بشار کو نہ سہی کتوں کو تو مار سکتا تھا۔

لیکن اس کے کچھ کرنے سے پہلے بشار نے ایک مختلف انداز سے سیٹی بجائی۔ جس کے بعد کتے خود ہی پیچھے ہو گئے۔

"خوف کے مینار پر کھڑے ہونے والے ایسے ہی گرتے ہیں۔" اس نے آگے ہو کے محراب خان کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

ان آنکھوں میں جن میں اس وقت دنیا جہان کی بے بسی اور خوف سمایا ہوا تھا۔ اب بشار کے ہاتھ میں بندوق بھی تھی۔ اس کے فرماں بردار ساتھی، اس کے کتے بھی تھے اور سچائی کی طاقت بھی تھی۔

"میں نے آپ کو اپنا سب کچھ اس لیے مانا تھا کیونکہ آپ سے بہتر مجھے کوئی نہیں جان سکا تھا۔ آپ جانتے تھے، میں پیار کا بھوکا ہوں۔ آپ جانتے تھے ذرا سی توجہ پر میں جان نثار کر دوں گا اور آپ یہ بھی جانتے تھے کہ میں کچھ بھی ہو سکتا ہوں مگر قاتل نہیں۔" یہ کہہ کر بشار نے بندوق وہیں پھینک دی۔

اس نے ارباز اور یاسین کو اشارہ کیا۔ ان کو لیے وہ قریب موجود جیپ میں بیٹھا اور تیز رفتاری سے جیپ چلا دی۔ جیپ چلنے کے دو لمحے بعد ہی اس نے ایک اور مخصوص سیٹی بجائی جس کو سن کر کتے واپس اپنے ٹھکانوں پر جا گھسے۔

محراب خان کا دل پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ اپنے ہی بندوں کے سامنے یہ ذلت۔ موت کا خوف اتنا خوں خوار تھا تو موت کتنی تکلیف دہ ہوتی ہوگی۔ زمان نے آکر ان کو اٹھایا۔ ورنہ وہ تو زمین پر لیٹے ڈرے لرزتے رہتے۔

"اس کے پیچھے جاؤ۔" زمین پر قدم جماتے ہی محراب خان کو وہ سب تنبیہات بھول گئیں جو زندگی نے انہیں ابھی سمجھائی تھیں۔

کوئی آدمی نہیں ہلا۔ سب نے محراب خان کی اصلیت دیکھ لی تھی۔

"خان صاحب! وہ آندھی بن چکا ہے، اس کو دور جانے دیں۔" زمان نے انہیں سمجھانا چاہا۔

محراب خان تو اپنی چند لمحوں پرانی حالت بھول گئے تھے۔ لیکن وہاں موجود سب کو محراب خان جیسے مضبوط بندے کو لرزتے دیکھنے کا منظر ساری عمر نہیں بھولنے والا تھا۔ سب کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ زمان کی بھی۔ لیکن محراب خان اب بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ منظر سے نظر چرا لیں گے تو منظر بدل جائے گا۔ وہ خود بھول جائیں گے تو دوسرے بھی بھول جائیں گے۔

"تم نہیں جاؤ گے تو میں جاؤں گا۔ جو میرے ساتھ وفادار ہے، وہ بھی میرے ساتھ جائے گا۔" محراب

خان نے چلا کر کہا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر سوار ہو گئے۔ چار اور لوگ بھی تھے۔ جنہیں اب بھی اللہ سے زیادہ محراب خان کا خوف تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ اسی جیپ میں سوار ہوئے۔ ان میں علیم بھی تھا۔

محراب خان نے جیپ تیز رفتاری سے چلا دی۔ دیسی خوراکوں پہ پلا ہوا جسم، بدلے کی آگ میں تڑپتی ہوئی روح۔ وہ گاڑی کو اڑاتے ہوئے لے کر گئے تھے۔ بشارکی جیپ ابھی ان کے ہی علاقے میں تھی جب انہیں جیپ نظر آگئی۔

digest library.com

☆☆☆

کیفے ٹیریا میں شدید شور تھا۔ پلیٹیں کھڑک رہی تھیں۔ چمچ بج رہے تھے۔ آوازیں لگ رہی تھیں اور باتیں ہو رہی تھیں۔ جیسے ہی وہ دونوں اندر داخل ہوئیں سناٹا ہو گیا۔ انہیں جاننے والوں نے آنکھیں نیچے کر لیں کہ کہیں سلام لینا نہ پڑ جائے۔ نہ جاننے والیوں نے انہیں گھورنا شروع کر دیا۔

''میں سب کے بیچ کھڑے ہو کے اعلان کر دیتی ہوں کہ میں کہاں گئی تھی اور کیوں گئی تھی، کم از کم یہ ٹارچر تو بند ہو گا'' لائبہ نے درثمین سے کہا۔

اسی وقت ان دونوں کے پیچھے وارڈن بھی وہاں داخل ہوئیں۔ وارڈن کا کیفے ٹیریا میں آنا معمول نہیں تھا۔ لیکن اب سے کچھ بھی معمول کے مطابق نہیں ہونے والا تھا۔

''یہاں کیوں کھڑی ہیں، بیٹھ جائیں آپ دونوں۔'' وارڈن نے ان سے کہا اور خود بھی ان کی ہی میز پر بیٹھ گئیں۔

ہاسٹل کا ماحول عجیب ہو گیا تھا اور سب اس کے لیے لائبہ اور درثمین کو قصوروار سمجھ رہے تھے۔ درثمین نے صبح امبر کو جا کے براہ راست بتانے کی کوشش کی تھی کہ لائبہ کی حرکت جذباتی ضرور تھی لیکن مخلص تھی۔

ان چار سالوں میں اس نے اپنے خاندان کے بارے میں کبھی کسی کو نہیں بتایا تھا۔ اب وہ خود سب کو بتا رہی تھی کہ اس کے اغوا ہونے کے پیچھے اس کا اپنا خاندان تھا کوئی عادی مجرم نہیں۔

وہ بتانا چاہتی تھی کہ وہ کیوں گئی تھی اور لائبہ کا اس کو بچانے میں کتنا اہم کردار تھا۔ شاید ایسے ہی لائبہ کے لیے سب پہلے جیسا ہو جائے۔ لیکن امبر نہیں مانی اس کی بات بھی ٹھیک تھی کہ جہاں بدنامی کا ڈر ہو، اچھے گھروں کی لڑکیاں وہاں سے گزرتی تک نہیں۔ لائبہ کا وہاں جانا ہی ان کے نزدیک جرم تھا۔

سب خاموشی سے کھانا کھانے لگیں۔ کیفے ٹیریا میں دو ہی آوازیں آرہی تھیں۔ ایک اکرم کی جو کچن سے میز پر کھانا لگانے والا چھوٹا لڑکا تھا۔ دوسری کوئی بھی آواز اکرم کو بلانے کے لیے ہی ہوتی۔ تب بھی ایک آواز آئی تھی کہ اکرم سوپ لے آؤ۔ اس کے بعد اگلی آواز جو آئی وہ اتنی دردناک تھی کہ سب نے کھانا چھوڑ دیا۔ گرم پیالہ لاتے ہوئے اکرم کا پاؤں پھسلا تھا اور سوپ اس نے اپنے ہی سینے پہ گرا لیا تھا۔

اب کیفے ٹیریا میں اکرم کی چیخوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ کسی اور کے بھی حرکت کرنے سے پہلے لائبہ وہاں پہنچ گئی تھی۔ اس نے اکرم کی مدد کرنا شروع کر دی۔

اس نے قمیص زخم سے جدا کی۔ گیلی پٹیاں لگانے تک باقی لڑکیاں بھی آگئیں اور لائبہ کی مدد کرنے لگیں۔ لائبہ نے کچھ کہے بغیر سب کو یاد کروا دیا تھا کہ وہ وہی لائبہ ہے جس کے لیے انسان اہم ہیں۔

اکرم کے زخم کی بچت ہو گئی تھی۔ اس رات امبر اور دوسری لڑکیاں ہمت کر کے اس کے کمرے میں آئیں۔ ان کو لائبہ کی خیریت پوچھنے کا خیال آ ہی گیا تھا۔

☆☆☆

محراب خان جیپ کو ہوا کی رفتار سے چلا رہے تھے۔ بشار علاقہ چھوڑ کر جا نہیں سکتا اور زندہ تو ہرگز نہیں۔

"خان! برا نہ مانیں تو میں کہتا ہوں۔ اسے جانے دیں وہ کہہ کر گیا ہے تو واپس ضرور آئے گا۔" علیم کو لگ رہا تھا۔ بشارت تک پہنچنے سے پہلے گاڑی تیز رفتاری سے الٹ جائے گی۔

"وہ نافرمان ہو گیا ہے، اسے اب اس کی اپنی موت چننے کا بھی موقع نہیں دوں گا۔"

دوسری طرف بشار نے بھی دیکھ لیا تھا کہ محراب خان اس کے پیچھے آ رہے ہیں۔ اس نے جیپ کو پل پر ڈال دیا۔ وہ ناتواں پل ڈولنے لگا۔

digest library.com

"خان اس کی جیپ ہے، ہماری بڑی گاڑی ہے۔ آپ خطرہ مول نہ لیں۔" علیم جانتا تھا کہ اس وقت بولنے سے جان جا سکتی ہے۔ لیکن موت تو ویسے بھی نظر آ رہی تھی۔

محراب خان نے اس کی بات نہیں سنی اور رفتار مزید بڑھا کر خود بھی پل پر چڑھ گئے۔ یہ وہی پل تھا جس کے بارے میں حکومتی عہدے داران کے پیر چھونے کو تیار تھے کہ اس کو دوبارہ بنوا دیا جائے۔ لیکن محراب خان اس پل کی خستگی کو اپنی طاقت جانتے تھے۔ پل کی مرمت کے کاغذ تلا تلا کر پڑھنے والی درخشین یونی ورسٹی سے پاس ہونے والی تھی لیکن وہ پل اب بھی ویسا ہی تھا۔

"مجھے یہاں کسی سے خطرہ نہیں ہے۔ میں خطرہ ہوں، میں حکم ہوں اور میں ہی تعمیل۔ میرے ہاتھ اس زمین کو بناتے ہیں۔ میری زبان سے یہاں کی تقدیر لکھی جاتی ہے۔ سب میرے آگے جھکتے ہیں۔ میں کسی کے آگے نہیں جھکتا۔ مجھے کوئی جھکا نہیں سکتا مجھے کوئی توڑ نہیں سکتا۔ میں لازوال ہوں۔ میں محراب خان ہوں۔"

ان جملوں کے ساتھ اس پل میں پہلی دراڑ آئی۔ پھر دوسری، پھر تیسری۔ ننھی ننھی دراڑیں بڑے بڑے شگافوں میں بدل گئیں۔ بشار کی جیپ کے پل سے اترنے کے دس لمحوں کے اندر اندر پل درمیان سے ٹوٹ گیا۔ بڑے بڑے وزنی پتھر بہتے دریا میں گرے تو دریا کا پانی چٹانوں کی مانند اچھلا۔

بشار نے آگے جاتے ہی جیپ روک لی۔ وہ اتر کر فکر مندی سے پل کی طرف بڑھا تھا۔ لیکن تب تک کوئی پل ہی نہیں بچا تھا کہ جس پر قدم دھرا جائے۔ محراب خان کی گاڑی دریا میں گری اور دیکھتے ہی دیکھتے بہتے دریا میں ڈوبنے لگی۔

بشار عادت سے مجبور اس تیز دھارے والے دریا میں بھی کودنے کو تیار تھا کہ کسی کی جان بچا لے۔ ارباز نے اسے بہت مشکل سے روکا۔

پل کا ٹوٹنا کوئی چھوٹا امر نہیں تھا، زلزلے جیسا شور اٹھا تھا۔ لوگ دکانوں سے باہر آ گئے تھے اور دونوں اطراف پل کے کنارے جمع ہو گئے تھے۔ پھر صلاح کر کے کچھ لوگ دریا میں اترے بھی، ان میں بشار بھی تھا۔ لیکن خود کو لازوال کہنے والوں کا زوال ہو چکا تھا۔ اس ساری چھان بین کے بعد جب بشار کنارے پر حیران کھڑا تھا تو اس نے دیکھا دوسرے کنارے پر زمان بھی موجود تھا۔

☆☆☆

موسم بدل رہا تھا۔ دن لمبے ہونے لگے تھے۔ سورج دیر سے ڈھلتا اور اس کے ڈھلنے کے بعد بھی کچھ دیر روشنی رہتی۔ اویس نے گاڑی تنگ گلی کے سامنے روک دی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ سے اترا اور ساتھ والی سیٹ سے لائبہ اتری۔

"آپ نے اپنی امی کو بتایا ہے کہ آپ کہاں جا رہی ہیں؟ بلکہ مجھے بتا کر کدھر جا رہی ہیں؟" گاڑی بند کر کے دونوں چلنے لگے۔

"جی میں نے اپنا سبق سیکھ لیا ہے۔ اب میں امی کو بتائے بغیر کوئی کام نہیں کرتی۔ میں نے انہیں کل ہی فون کر کے بتایا تھا۔ پھر ان کا ڈانٹنے کے لیے دوبارہ فون آیا۔ پھر میں نے ایک بار پھر فون کر کے کہا کہ میں نے تو

جانا ہے۔آپ دعا کرنا۔" لائبہ کی پرانی بے وقوفانہ بے فکری واپس آرہی تھی۔
"مطلب کہ آپ اپنی امی کی اجازت کے بغیر ادھر آئی ہیں؟" اویس نے سر کو ناگواری سے جنبش دی۔
"انہوں نے دی تھی اجازت۔ بہت ساری بحث کے بعد آخرامی نے تنگ آ کر کہا، جاؤ جو دل میں آتا ہے کرو۔ بس اجازت مل گئی۔" لائبہ نے معصومیت سے کہا۔
"یہ اجازت نہیں ہوتی، یہ تو آپ نے ان کو مجبور کر کے الفاظ نکلوائے ہیں۔" اویس نے کہا۔
وہ خود بھی وہاں نہیں جانا چاہتا تھا، اس لیے باتوں میں وقت ضائع کر رہا تھا۔
"ارے پاکستان میں یہی اجازت ہوتی ہے۔ میری خالہ کا رشتہ آتا تھا۔ وہ شادی سے انکار کرتی تھیں۔ نانو نے اتنا دباؤ ڈالا آخر خالہ نے بھی تنگ آ کر کہا کہ جائیں جو دل کرتا ہے کریں۔ نانو نے شور مچا دیا، ہاں ہو گئی ہاں ہو گئی۔ [illegible] " لائبہ کی توجیہ [illegible] ایک ہی تھی۔
اویس رک گیا۔ گھر آ گیا تھا۔
"چلیں۔ ہمت تو کرنی ہے۔" لائبہ نے اس کی طرف دیکھا اور خود ہی بیل بجادی۔
"کون؟" اندر سے ایک ٹین ایج لڑکی نکلی۔
"یہ ظفر صاحب کا گھر ہے؟ ہم ان کی بیگم سے ملنے آئے ہیں۔" لائبہ نے کہا۔
کچھ دیر بعد وہ اندر بیٹھے تھے
"ان کی طبیعت میں ہمیشہ سے تجسس تھا۔ میں انہیں کہتی تھی، آپ کوئی ایسی ہی نوکری کر لیتے جس میں دوسروں کی خبر گیری ہوتی تو آپ خوش رہتے۔ تجسس ہی لے ڈوبا۔" بیگم ظفر ایک سمجھدار خاتون تھیں۔ انہوں نے قسمت کے لکھے کو قبول کر لیا تھا۔ اب صبر سے بچیاں پال رہی تھیں۔
"آپ کو خرچے میں کوئی مدد چاہیے، بچیاں خیریت سے ہیں؟" لائبہ گنے چنے سوال سوچ کر آئی تھی وہی پوچھ رہی تھی۔
"باقی تو سنبھل گئی ہیں لیکن ثنا۔ وہ تو اسکول بھی نہیں جا پا رہی۔ بولنا کم کر دیا ہے۔ وہ باپ کی بہت لاڈلی تھی۔" بیگم ظفر کی آواز بھر آئی۔
اسی وقت اویس نے دیکھا کہ اس کمرے کے باہر برآمدے میں ایک میز پوش سے ڈھکی میز کے نیچے کوئی چھپا ہوا ہے۔ اس نے دو ننھے ہاتھ دیکھے تھے جن میں ایک موبائل تھا۔ جس پہ ویڈیوز چل رہی تھیں۔
اویس، لائبہ اور مسز ظفر کو بات کرتا چھوڑ باہر چلا آیا۔ گھٹنے کے بل بیٹھ کر اس نے میز پوش سرکایا۔ وہاں ایک معصوم بچی بیٹھی تھی۔ بچی کی آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ جس سکرین کو کھوئی کھوئی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی اس کے منظر جیسے اس کے ذہن تک پہنچ ہی نہیں رہے تھے۔ اویس نے ہاتھ بڑھا کر بے مقصد بدلتے منظر والے موبائل کو بند کر دیا۔ بچی کو تب احساس ہوا کہ کوئی قریب آ گیا ہے۔ اس کی کی آنکھوں میں گھبراہٹ ابھری۔ اویس نے فوراً ہی میز پوش نیچے گرا دیا۔
"ٹھک ٹھک ٹھک۔" پھر اویس نے مصنوعی آواز نکالی۔ جیسے میز پوش نہ ہو، کوئی دروازہ ہو اور وہ اندر آنے کی اجازت لے رہا ہو۔
کچھ دیر لگی لیکن ثنا نے ہمت کر کے میز پوش اس بار خود اٹھایا۔
"میں اویس ہوں، آپ سے ملنے آیا ہوں۔ اور آپ؟" اویس نے اپنا تعارف کروایا۔
ثنا کچھ نہیں بولی۔ وہ اپنے فراک کے ربن کو مروڑتی رہی جیسے بہت ضروری کام ہو۔
"ارے آپ یہاں کیوں بیٹھ گئے۔ ادھر آئیے۔ چائے لیجیے۔" ثنا کی بہن چائے کا کپ لے کر ادھر ہی

آ گئی۔

"میں ثنا سے بات کر رہا تھا۔" اویس نے اس سے کہا۔ ساتھ لائبہ کو بھی اشارہ کر دیا۔

نہ جانے کب سے تعلق ایسا ہو گیا تھا کہ ایک دوسرے کے اشارے پل بھر میں سمجھ میں آنے لگے تھے۔

"انہیں بات کرنے دیں۔ پولیس والے ہیں ثنا کی چپ بھی ٹوٹ جائے گی۔ آپ آیئے۔"

لائبہ نے اس لڑکی کے ہاتھ سے چائے کا کپ پکڑ کر اویس کو تھمایا۔ اور اسے باتوں میں لگا کر اندر لے گئی۔

مسز ظفر کو ڈرائنگ روم کے صوفے سے ثنا اور اویس صاف نظر آ رہے تھے۔ بہن کے جاتے ہی ثنا نے میز پوش دوبارہ نیچے کر لیا۔ اویس نے چائے کا کپ اٹھایا اور بسکٹ والی پرچ میز کے نیچے کھسکا دی۔

خود بھی ایک بسکٹ چائے میں ڈبو کر منہ میں ڈالا۔

[illegible]

"ام ام۔۔۔ مزے [illegible]"

تھوڑی دیر میں ہی ایک ننھا سا ہاتھ میز پوش کے نیچے سے نکلا اور بسکٹ لے کر اندر واپس چلا گیا۔ اویس مسکرا دیا۔ اس نے سکون سے چائے کا گھونٹ بھرا۔ اتنے میں وہ ہاتھ دوبارہ باہر نکلا اور آدھا کھایا بسکٹ واپس رکھ دیا۔

"کیا ہوا، اچھے نہیں؟" اویس کو افسوس ہوا۔

"یہ اچھے نہیں ہوتے۔ وہ اچھے ہوتے تھے جو بابا لاتے تھے۔" ثنا نے کہا۔

اویس کے دل پر گھونسا پڑا۔

وہ اب اس بچی سے کیا کہتا۔ وہ کچھ دیر وہیں رہا۔ نہ میز پوش کے نیچے سے آواز آئی نہ اس سے کچھ مزید کہا گیا۔ پھر اویس چائے کا کپ لے کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

"اتنا معصوم سا نوالہ کس نے لیا ہے؟" لائبہ نے اس کے کپ کے ساتھ بسکٹ کو دیکھ کر کہا۔

"ثنا نے کھایا تھا، پسند نہیں آیا۔"

"ظفر اس کو بیکری سے بسکٹ لا کر دیتے تھے۔ اس کو وہی پسند تھے۔" مسز ظفر نے بتایا۔ "اس دن بھی بسکٹ لیے تھے۔ گھر میں پرسا دینے والے تھے۔ کھائے گئے۔ ثنا اس پر بھی ناراض ہوئی۔ اسکول پارٹی میں بھی نہیں گئی اور بسکٹ بھی نہیں ملے۔"

"چلیں؟" اویس نے لائبہ کو ایسے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو تم، فالتو میں مجھے یہاں لائیں۔ کچھ نہیں بدلنے والا۔ لائبہ نے بھی چائے کا خالی کپ رکھ دیا۔

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں اور اویس ایک کال دور ہیں۔ وہ حادثہ تھا مگر ہم خود کو آپ کا مجرم سمجھتے ہیں۔" لائبہ نے وہ کہا جو اویس محسوس کرتا تھا۔

"آپ کا کیا قصور، آپ تو اپنا کام کر رہے تھے۔ ان ڈاکوؤں کو ہم سادہ انسانوں کا علاقہ ہی ملا تھا بسیرا کرنے کو۔ مجھے سوچ کر جھرجھری آتی ہے، ہم بچیاں لے کر ڈاکوؤں کے اتنا قریب بیٹھے تھے۔ ہم محلے والے تو پولیس کے احسان مند ہیں۔ جب بھی خیال آتا تھا یہی آتا تھا کہ ظفر آگے نہ گئے ہوتے۔ تو آج۔" آواز میں آنسوؤں کے ساتھ غم بھی جھلکا۔

لائبہ نے اویس کو دیکھا شاید کچھ بہتری آئی تھی۔

"چلیں اب اللہ حافظ۔ مجھے کباب کی ترکیب ضرور میسج کر دیجیے گا۔" لائبہ نے یہاں بھی دوستی کر لی تھی۔

"ثنا کو کون سی بیکری کے بسکٹ پسند ہیں؟" اویس کو خیال آیا۔

"ہمارے پاس ہی ہے۔" انہوں نے کہا۔

"اگر آپ ساتھ چلیں تو میں اور لائبہ ثنا کو بسکٹ دلوانا چاہتے ہیں۔" اویس نے کہا۔

digest library.com

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو گھر سے نکلنے کا نام نہیں لیتی۔ میں منگوا دوں گی کسی سے۔ مجھے بس یہی تو رہا تھا۔'' انہوں نے ٹال مٹول کرنا چاہی۔

پھر لائبہ بھی اصرار کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ ان ماں بیٹی کے ساتھ بیکری میں تھی۔ لگ رہا تھا شاید باپ کی وفات کے بعد اب باہر نکلی ہے۔ اس نے اپنی پسند کے بسکٹ لیے۔ پھر ماں کو دیکھ کر مسکرائی۔ اویس نے وعدہ کیا، اگلی بار وہ اس کو پیسٹری لے کر دے گا۔ باپ کی کمی کوئی پوری نہیں کر سکتا۔ وہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو بس اس کو دوبارہ مسکرانا سکھا رہا تھا۔

digest library.com

☆☆☆

''اچھا لگ رہا ہے نا؟'' گاڑی ہاسٹل کے سامنے رکی تو لائبہ نے پوچھا۔

''بہتر لگ رہا ہے۔'' اویس نے اقرار کیا۔

''[illegible] ہوگا'' لائبہ نے اعتماد سے کہا۔

[illegible]

[illegible] سے بہت بہتر [illegible]

''اچھا، اتنا یقین کیسے؟'' اویس نے اس لڑکی سے پوچھا جس سے اس کی بات پکی ہو چکی تھی۔

''یقین اس لیے کیونکہ اب میں آپ کی زندگی میں آ چکی ہوں۔ اب سب اچھا ہی ہوگا۔ کچھ برا ہوگا تو میں ہوں نا۔ اگلی بار کچھ اس سے بھی برا کر دوں گی کہ آپ کو پچھلی چیز اچھی لگنے لگے گی۔'' لائبہ نے اپنے ہی ہاتھ پر تالی مار کر کہا۔ اویس ہنس دیا۔

''اللہ حافظ۔'' لائبہ گاڑی سے اتری اور اندر چلی گئی۔

ان کو واپس آئے تین ہفتے گزر چکے تھے۔ اور ان تین ہفتوں میں اس نے یہ سیکھا تھا کہ اپنی خوشی اس بات پر منحصر نہیں ہونی چاہیے کہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں۔

''باہر کے بڑے چکر لگ رہے ہیں۔'' وہ اندر آئی تھی۔

لان میں لڑکیوں کا ایک گروپ بیٹھا تھا۔ ان میں سے ایک نے اسے چڑانے کے لیے کہا۔

لائبہ ان کے پاس رک گئی۔ امبر سمیت اس کی اپنی سہیلیاں تو اس کے ساتھ اچھی ہو گئی تھیں۔ پہلی جتنی دوستی نہ سہی پر اس سے خوش اخلاقی سے ملتی تھیں۔ پہلے کی طرح سب مل کر پڑھتے بھی تھے اور کبھی شغل بھی لگا لیتے تھے۔ مگر اب بھی کافی لڑکیاں تھیں جن کو لائبہ کو دیکھ کر طعنے یاد آتے تھے یا چسکے۔

''تمہیں معلوم ہے۔ پولیس سیکرٹ ایجنٹس ہائر کرتی ہے۔ جو کیس حل کرنے میں پولیس کی مدد کرتے ہیں۔ پولیس ان کے خلاف کیس نہیں بننے دیتی۔ مزے کی نوکری ہے۔ میں جو مرضی جرم کر لوں، میری پکڑ نہیں ہوگی۔'' لائبہ نے کہانی گھڑی۔

''سچ؟ چاہے چوری کر لو؟'' لڑکیاں حیران ہو گئیں۔

''چوری؟ چاہے بندہ پھڑکا دوں؟ یا چاہے بندی ہی پھڑکا دوں۔'' لائبہ نے لہک کر کہا اور اتراتی ہوئی چل دی۔

جن لوگوں نے باتیں کرنی ہیں سو کرنی ہیں۔ اس نے سوچا کہ ان لوگوں کو نیا مواد دے دیا جائے، اب کتنے عرصے پرانی باتیں دہرائیں گے۔

وہ ایسے ہی ہواؤں میں اڑتی کمرے میں آئی۔

☆☆☆

درثمین کا پڑھائی میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ کتاب کھول لیتی تھی اور ان لفظوں میں کچھ اور دیکھنے لگتی تھی۔ کبھی کبھی تو نوٹس لکھتے ہوئے وہ پھول بوٹے بنانے لگتی۔ ویسے ہی جیسے حویلی کے قالین پر ہوتے تھے۔

وہ بول نہیں رہی تھی اس لیے وہ بہت سوچ رہی تھی۔ خیالات تھے کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتے تھے۔

لائبہ جب کمرے میں آئی تو اس نے دیکھا درثمین نے میز کے اوپر دو کتابیں کھڑی کی ہوئی ہیں۔ ان دونوں کتابوں پر اس نے چند پنسلیں ایسی ترتیب سے رکھی ہیں جیسے کوئی پل ہو۔ پھر وہ اس پل کو آزمانے لگی۔ اس نے اس پل کے اوپر پہلے ربڑ رکھا وہ نہیں گرا۔ پھر اس نے اس پہ ایک شاپنر رکھا۔ پل ڈولا ضرور لیکن وہیں قائم رہا۔ کچھ دیر اس کو دیکھنے کے بعد اس نے ننھا اسٹیپلر اٹھایا اور پل کی ایک طرف سے اس کو چلانے لگی۔ جیسے کوئی گاڑی ہو۔

"یہ تم کیا کر رہی ہو؟ لائبہ نے اسے پکارا۔

درثمین گھبرائی۔ اسٹیپلر، پل پنسلیں کتابیں سب دھڑام ہو گئیں۔

"کچھ نہیں۔ میں تو پڑھ رہی تھی۔" درثمین نے کہا۔

"تمہیں جھٹلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم [illegible] بہت بڑی تبدیلی سے گزر کر آئی ہو۔ یہ سب ایڈجسٹمنٹ [illegible] ہے۔ لائبہ اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

digest library.com

"حقیقت اور جھوٹ میں فرق نہیں مل رہا۔ ایسا لگتا ہے کوئی خواب دیکھا تھا۔ پل ٹوٹ گیا۔ محراب خان وہاں کے بے تاج بادشاہ تھے۔ ان کی لاش تین دن بعد ملی۔ اور وہ بھی بستی دریا سنگ کے بہت دور۔" درثمین نے ایسے کہا۔ جیسے پہلی بار ذکر کر رہی ہو۔

جبکہ ان میں سے زیادہ تر معلومات انہیں اولیس کے ذریعے ہی ملی تھی۔

"دفن تو وہ وہیں پر ہوئے۔ ان کا ذکر وہاں بہت عرصے رہے گا۔ لیکن صرف ذکر چلے گا۔ ان کا حکم، ان کا قبضہ اس علاقے سے ختم ہو چکا ہے۔" لائبہ نے تسلی دی۔

"یہاں ہمیں احساس نہیں ہو رہا کہ وہاں پر محراب خان کیا دہشت کا نام تھا۔ یہاں بیٹھ کر کہنا کتنا معمولی لگ رہا ہے کہ محراب خان کی موت ہو گئی۔ وہ اتنا بڑا وجود منٹوں میں ختم ہو گیا۔ وہاں ہوتے اور یہ سننے میں آتا تو ایسا لگتا، پہاڑ لرز گئے ہیں۔ حویلی چلا اٹھی، درخت سہم گئے ہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔" درثمین کے چہرے پر اب بھی دہشت تھی۔

لائبہ اسے بغور دیکھنے لگی۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم خوف زدہ ہو یا اس جگہ کو مس کر رہی ہو؟" لائبہ نے سائیکالوجی کی اسٹوڈنٹ ہونے کے ناتے تجزیہ دیا۔

درثمین چونک گئی۔ کیونکہ یہ بات تو وہ خود سمجھنے کی بہت کوشش کر رہی تھی۔ وہ وہاں سے بچ کر آ جانے پر خوش تھی یا اس بات پر افسردہ کہ وہاں اچھے حالات میں کیوں نہ جا سکی۔

"میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی۔ اگر سب اسی طرح ہونا تھا اور اتنی جلدی، دنوں میں سالوں کی بنی سلطنت کا ختم ہونا لکھا تھا تو پھر میں بیچ میں کیوں آئی؟ مجھے کیوں اذیت ناک طریقے سے وہاں لے جایا گیا؟ مجھے وہ سب کیوں دکھایا گیا۔ یہ سب پہلے کیوں نہیں ہوا۔ میں وہاں ویسے کیوں نہیں گئی جیسے میرا جانے کا حق تھا۔ اپنی باپ کی زمین پر۔ خوب صورت پہاڑوں کے بیچ، وہاں جہاں جا کر بس جانے کا دل چاہتا ہے۔ مجھے وہاں سے چوروں کی طرح بھاگ کر کیوں آنا پڑا؟"

یہ پہلی بار نہیں تھا۔ وہ ایسا تقریباً ہر روز بولتی تھی۔ پر الجھتی تھی۔ کبھی بہت شکر گزار ہو جاتی تھی کہ وہ زندگی جو اس کو ملنے جا رہی تھی۔ اس سے بچ کے آ گئی ہے۔ تو کبھی ایسے ہی جو ہو گیا، اس پر چیخنی چلاتی۔ لائبہ بہت تسلی سے اس کی ہر بات سنتی تھی۔

digest library.com

''اس لیے کیونکہ تمہیں جانا ہی تھا۔تم ہی تھیں جو جا کر اس دنیا کو جڑوں سے ہلا سکتی تھیں۔محراب خان کی موت ایسے ہی نہیں ہوئی۔وہ پل ایسے ہی نہیں ٹوٹا۔وہ گاؤں ایسے ہی نہیں بدلا۔وہ سب اس لیے ہوا کیونکہ تم وہاں گئی تھیں۔تم نے سالوں کے فرسودہ نظام پر سوال اٹھائے تھے۔تم نے اس گونگے بہرے اندھے جانثار کو بتایا تھا کہ مرضی بھی کوئی چیز ہے۔''لائبہ نے تسلی دی۔

یہاں درثمین چپ ہوگئی۔سوچنے لگی۔سوچا تو پھر بولنے لگی۔

''کبھی میں سوچتی ہوں،وہ کیا کرتا ہوگا؟اپنی مرضی پا کر؟اب کوئی محراب خان نہیں ہے جو اس کو حکم دے۔اب وہ کیسے جیتا ہوگا؟''درثمین نے یہ باتیں نظریں چرا کر کہیں۔

''میں نہیں جانتی اور تم بھی نہیں جانتیں۔تم اس کو نہیں جانتیں کیونکہ وہ جو تم نے دیکھا تھا یقیناً اب وہ ویسا تو نہیں رہا ہوگا۔اس لیے بہتر ہے تم بھی وہ سب نہ سوچو۔اور اس بات پر فوکس رکھو کہ تم کیا ہو۔تم پہلے خود کو ڈھونڈو۔پھر اس کی سوچنا۔''

لائبہ نے اٹھ کر اس کی ٹھوڑی کو چھوا۔پھر میز پر بکھری ہوئی کتابیں،پنسلیں سمیٹنے لگی۔

''میں آج لائبریری گئی تھی۔''درثمین نے انکشاف کیا۔

لائبہ حیران رہ گئی۔

''اکیلی اور اکیلی واپس آئیں؟''لائبہ نے اس سے ایسے پوچھا جیسے وہ ایک گلی چھوڑ کر کالج کی لائبریری نہ گئی ہو بلکہ ہمالیہ سر کر کے آئی ہو۔

''ہاں اکیلی گئی تھی۔کچھ دیر رکی بھی۔بس پھر واپس آگئی۔اب اگلی بار اندھیرے میں جاؤں گی۔مجھے اپنے ڈر کو قابو کرنا ہے۔اب میں وہاں سے آگئی ہوں۔کوئی بھی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا۔تو اس ڈر کو بھی میرے ذہن میں نہیں ہونا چاہیے۔''درثمین نے بہت اعتماد سے کہا۔

لائبہ کا دل چاہا کہ خوشی سے اس کا ماتھا چوم لے۔اس ہی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

''درے میڈم!آپ کو وارڈن نے بلایا ہے۔آپ سے بستی دریا سنگ سے کوئی ملنے آیا ہے۔''

آواز پر درثمین اور لائبہ دونوں کی روح فنا ہوئی۔

☆☆☆

جب کسی نظام کو آہنی شکنجے سے پکڑ رکھا ہو۔تو شکنجا چھوٹنے پر سب بکھر جاتا ہے۔تین دن تک تو سب لاش کو ایسے ڈھونڈتے رہے کہ جیسے زندہ محراب خان مل جائے گا اور سب کچھ پہلے جیسا چلنے لگے گا۔کسی کو یہ نہیں سوچنا پڑے گا کہ اسے کیا کرنا ہے۔اسے بتایا جائے گا اور وہ اس پر آنکھیں بند کر کے چلے گا پہلے کی طرح۔

پھر جنازہ ہونے کے بعد شدت سے احساس ہوا کہ کچھ کمی ہے،بہت بڑی کمی ہے۔اب سب کیسے چلے گا؟سنگ تراش جو اس خاندان کی قبریں بناتا تھا۔وہ جانتا تھا کہ جیسے زرینہ بی بی کی قبر کا چوبارہ تھا۔جیسے یونس خان کی چار ستونوں اور چھت والی قبر تھی۔ویسی ہی قبر محراب خان کی بھی بن جائے گی۔اس نے یوسف خان سے پوچھا اور [illegible] پر کام شروع کر دیا۔[illegible] مرمر تراشا جانے لگا۔کتبے کا متن لکھا گیا۔تب حویلی میں بھی خالی جگہ پر [illegible] نے سی۔کچھ ذمہ داریاں یوسف [illegible] نے خود ہی اٹھالیں۔کچھ زمان لیتا چلا گیا۔

الائچی کے باغ کا نگران ان سے ایک مسئلے کا حل لینے آیا تو یوسف خان نے پلٹ کر اس سے ہی پوچھ لیا کہ کیا کرنا چاہیے؟کیونکہ ان میں فیصلہ کرنے کی اتنی صلاحیت نہیں تھی۔بس پھر باہمی صلاح مشورے سے مسئلے کا حل نکال لیا گیا۔

بستی کے لوگوں نے اپنی مرضی سے اسکول کا ایک کمرہ جانوروں سے صاف کروا دیا۔بچے وہاں پڑھنے

digest library.com

گے۔ کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ [illegible] ضروری بات [illegible]

پھر قبر کا کتبہ بن گیا۔ مینار کھڑے ہو گئے۔ چھت پڑ گئی۔ سب نے باری باری فاتحہ پڑھی۔ جن کا محراب خان کی بیٹھک میں جانا معمول تھا وہ بھی اسی روز حاضری کو پہنچے۔ جن کے لیے محراب خان کی بیٹھک میں بیٹھنا اعزاز تھا، وہ بھی قطار در قطار آئے۔ پھر شام ہوگئی۔ سورج ڈھل گیا۔ رات ہوگئی۔

پھر اگلا سورج طلوع ہوا اور زرینہ بی بی کی قبر کی چھت پر گھونسلے سے بلبل نکلی۔ اپنی صبح کے معمول میں چہچہاتی دانہ چنتی وہ محراب خان کی قبر کی چھت پر جا بیٹھی۔ نیا نیا اجلا سنگِ مرمر اور وہ ننھی سی سیاہ بلبل۔

"کووو، کووو، کووو۔" محراب خان کی قبر کی چھت پر وہ چہچہانے لگی۔

اب صبح سے شام وہ بلبل وہاں پر چہچہاتی تھی۔ اب اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

وہ وارڈن کا دفتر نہیں لگ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے عدالت ہو۔ پولیس کا ایک نمائندہ جو قریب ہی موجود رہتا تھا، اس کو بلا لیا گیا تھا۔ وارڈن بھی اکیلی نہیں تھیں۔ ساتھ ایک سینئر نگران ٹیچر بھی موجود تھیں۔ کالج کے دو سیکیورٹی گارڈز بھی کھڑے تھے۔ [illegible] میں موجود ایک کونے والا [illegible] تھا۔ لیکن اصل [illegible] صوفے پہ اکڑوں بیٹھا اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اس کے کروفر میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اتنے لوگوں سے اجازت حاصل کرنے کے بعد یوں انتظار میں بیٹھنا اس کی طبیعت پہ گراں گزر رہا تھا۔ مگر وہ پھر بھی بیٹھا تو۔ وہ درثمین کے آنے پر اٹھ کر کھڑا نہیں ہوا۔ وہ آ گیا تھا یہ بہت بڑی بات تھی۔

درثمین داخل ہوئی تو ایک لمحے کو اسے لگا، وارڈن کا کمرہ محراب خان کی حویلی میں بدل گیا ہے۔ وہی گھٹن، وہی احساس بے بسی۔ آنے والا زمان خان تھا۔

"میں یہاں یہ بتانے آیا ہوں کہ محراب خان کے ورثا نے آپ کے اور آپ کی ماں کے لیے معافی کا اعلان کیا ہے۔"

زمان نے کہا۔ درثمین نے معافی کا لفظ سن کر سوچا۔ جب معافی مل رہی ہے تو لے لی جائے۔ اس بحث میں کیا پڑنا کہ وہ قصوروار ہے بھی کہ نہیں۔

"آپ جہاں رہیں۔ جیسے رہیں، اس سے اب ہمیں کوئی سروکار نہیں ہوگا۔ آپ بستی دریا سنگ آنا چاہیں تو وہاں یونس چچا کی زمین ہے۔ جو آپ کی ہے۔ باقی قانونی معاملات ہمارا وکیل آپ کو سمجھا دے گا۔ رہی بات اس منگنی کی جو ہمارے دادا محراب خان نے ہماری کی تھی۔۔۔"

درثمین نے اب اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ دروازے کے باہر کھڑی لائبہ نے بھی کان مزید قریب کیے۔

"میں آج اپنی مرضی سے اس رشتے سے انکار کرتا ہوں۔" اس نے پھر ٹھوس لہجے میں کہا۔ جبکہ سوال بنتا تھا کہ جب لڑکی رضامند نہیں تو تمہارے انکار کی کیا وقعت۔ لیکن یہاں بھی درثمین نے مصلحت سے کام لیا۔ وہ خاموش رہی۔

"یہ معافی کا اقرار نامہ ہے۔" زمان نے اسے ایک کاغذ پکڑایا۔

"اور یہ میرا نمبر۔ زمین کی منتقلی کروانی ہو یا فروخت، میں ہی محراب خان کے خاندان تک آپ کا پیغام پہنچا دیا کروں گا۔" اس کے بعد وکیل اگلے پندرہ منٹ بتاتا رہا کہ وہ درثمین کے لیے کیا کچھ کر سکتا ہے۔ وہ چپ ہوا تو زمان خان اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں چلتا ہوں۔ آپ کی ہمارے بارے میں جو بھی رائے ہو، یہ بات یاد رکھیے گا۔ کہ جب کوئی ہمیں دھوکا دے کر نکل جاتا ہے تو ہم اس کا آخری سانس تک پیچھا کرتے ہیں۔ لیکن جب ہم ہی کسی کے لیے معافی کا اعلان

digest library.com

کردیں تو وہ بھی فولاد ہوتا ہے۔" اس نے آخری جملہ دھیمے لہجے میں کہا اور چلا گیا۔
اس کے جانے کے بعد درثمین نے سکھ کا سانس لیا۔ پھر نعیمہ کو فون کیا۔ بے یقینی وہاں بھی تھی۔
"مجھے لگتا ہے، اب وہ زمین بدل گئی ہے۔ اس لیے ان کی دل نرم ہو گئے ہیں۔" نعیمہ نے کہا۔
"بدل کر وہ زمین کیسی لگتی ہو گی؟" درثمین پھر سے کھونے لگی۔
"ویسی ہی۔ وہاں کے لوگوں سے امید نہیں تو زمین سے کیا واسطہ۔ تم بتاؤ۔ آگے کیا کرنا ہے؟ ہمارے ہوٹل میں بھی جابز نکلتی رہتی ہیں۔"
نعیمہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ درثمین جلد از جلد اس کے پاس آ جائے۔ آخر کو ان کو آزادی کا پروانہ ملا تھا۔ زندگی دوبارہ شروع ہوئی تھی۔ وہ خوش تھیں۔

☆☆☆

اس کی زمین پر پہلی فصل نے سر اٹھایا۔ اس کے ملازمین کام کر رہے تھے اور وہ وہاں چلتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اس کی زمین جو اس نے خود سینچی۔ اس کے اوپر پہلی پتیوں نے نکل کر زمین کو سبز کر دیا تھا۔ بہت خوشی کا موقع تھا، وہ اپنی اتنی بڑی خوشی کس کو بتاتا؟ کہنے کو وہاں سب اس کے ہی تو تھے جو اس کو لمحہ بھر کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑتے تھے۔ پھر بھی تنہائی تھی۔
وہ پل کے دوسرے پار والے گاؤں میں رہ رہا تھا۔ اہم تو وہ ان کے لیے پہلے بھی تھا۔ اب دیکھتے دیکھتے ان کے لیے لازم ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی فیصلہ کرنا ہو، کوئی مشورہ لینا ہو سب اس کو ہی پکارتے تھے۔ حکومتی عہدے داروں کی جتنی ٹیمیں آئیں ان سے بات کرنے کے لیے اس کو ہی آگے کیا جا رہا تھا۔ سب دیکھ رہے تھے کہ وہ سیر دردی بھی لے لے گا اور ان کو ہی فائدہ پہنچائے گا۔ بشار کو اپنا آپ کسی کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ اتنا اہم ہو گیا تھا کہ دوسرے اس پر ثابت کرتے تھے کہ وہ کتنے کام کے ہیں۔
زمین کا چکر لگاتے ہوئے بشار اس کرسی کے پاس پہنچا جہاں وہ بیٹھا کرتا تھا۔ اسے نہ جانے کیا سوجھی۔ اس نے حساب کے لیے نئی ڈائری لی تھی اس نے پہلا صفحہ کھول کر اس پر درثمین کا نام لکھ دیا۔ پھر فوراً وہ نام کاٹ بھی دیا۔
"السلام علیکم،
یاد نہیں پڑتا کہ کبھی آپ کو آپ کے نام سے مخاطب کیا ہو۔ اس لیے آج بھی یہ ہمت نہیں کر پا رہا۔
جاتے ہوئے میں نے آپ سے کہا تھا" کہ آپ اچھے وقتوں میں ہمارے علاقے آئی ہوتیں تو آپ کو بہت کچھ دکھاتا۔
اب کہنا چاہوں گا فرصت نکال کر ہمارے علاقے میں آئیں۔ اب یہاں کا وقت ہمیشہ اچھا محسوس ہوتا ہے۔ مجھے نہیں۔ لیکن دوسرے یہی کہتے ہیں۔ پل ٹوٹنے کے بعد سے میں حویلی اور بستی دریا سنگ نہیں گیا۔
وہاں جانے کا راستہ اب تھوڑا کٹھن ہو گیا ہے لیکن موجود ہے۔ میری دشواری راستے کی نہیں ہے۔
خیر وہاں جائے بغیر بھی میں جانتا ہوں کہ وہاں بھی اچھا وقت آ رہا ہے۔ بستی کے لوگ اور کھیتی باڑی کے کام یوسف خان دیکھ لیتے ہیں۔ زمان خان وہ کام دیکھتا ہے جو پہلے کسی کے ذہن میں بھی نہیں آئے تھے۔ فی الحال تو گاؤں میں پانی کے پائپ لگوانے شروع کیے ہیں۔ سوچیں کنوئیں سے پائپ تک آ گئے مطلب صدیوں کی ترقی کر لی۔ سوچتا ہوں شاید یہی ترقی ایک اکیسویں صدی کی لڑکی کو یہاں پہ واپس لے آئے۔
لیکن خدارا آپ یہاں واپس مت آیئے گا۔ پچھلی بار آپ کو یہاں سے نکالنے میں جان پر بن آئی تھی۔
ایک بار پھر آپ کو یہاں سے جاتا دیکھوں گا تو جان چلی ہی جائے گی۔

digest library.com

آپ کا۔"

اور لکھتے لکھتے اس کا قلم یہاں ایک بار پھر ڈگمگا گیا اس کا اپنا تعارف بھی تو کوئی نہ تھا پھر اس نے قلم لے کے آپ کا کے الفاظ کاٹ دیے۔

"خان! آپ ادھر ہیں؟ وہاں سارے آپ کو بلا رہے ہیں۔" ارباز اسے بہت دیر سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن بشارا تنا مصروف تھا کہ اس نے ارباز کو نہیں دیکھا۔

"کیوں مجھے کس لیے ڈھونڈ رہے ہیں؟" بشار نے ڈائری بند کر کے قریب رکھی۔

"اسلام آباد سے بندے آئے ہیں پل دوبارہ بنوانا ہے۔ ادھر سے ہم سب نے آپ کا نام دیا ہے۔" ارباز اب بشار کے لیے کام کرتا تھا اس کی زمینیں دیکھتا تھا۔ اس کے ساتھ کی وفاداری نبھاتے ہوئے وہ اس کا دایاں ہاتھ بنتا جا رہا تھا۔

"پھر چلو۔" بشار نے کہا اور اٹھ گیا۔

☆☆☆

سنا ہے کہ جس چیز کو آپ قوت سے اپنی طرف کھینچتے ہیں، وہ اسی قوت سے آپ سے دور جاتی ہے۔ درثمین نے ساری عمر گمنامی کو اپنے سے قریب کیا۔ پھر کچھ ایسا ہو گیا کہ ہر جگہ اس کا نام ہو گیا۔ گریجویشن کے بعد اس نے جن جگہوں پر نوکری کے لیے اپلائی کیا۔ وہاں اس سے پہلے اس کی شناخت پہنچ گئی تھی۔ ویسے تو اس بھلکو دنیا کو اپنے حقوق تک یاد نہیں رہتے۔ مگر انہیں درثمین اچھے سے یاد تھی۔ درثمین نے بھی زیادہ ہاتھ پاؤں نہیں مارے۔ وہ جلدی ہی نعیمہ کے پاس چلی آئی۔ پہلے ٹریننگ لی پھر وہ اسی ہوٹل میں کام کرنے لگی۔

شروع شروع میں اسے ہر آزاد سانس کی قیمت محسوس ہو رہی تھی۔ اسے سب اچھا لگ رہا تھا۔ نئے کام سیکھنا نئے لوگوں سے ملنا۔ دوست بنانا۔ پھر دن کے اختتام پر رات کو اپنی پرانی سہیلی کو ساری روداد سنانا۔ لیکن جس زندگی میں مقصد نہیں ہوتا وہ بہترین بھی ہو تو بے معنی لگتی ہے۔ آج وہ بہت اچھی جاب کر رہی تھی لیکن آگے کیا؟ جب آپ کو اپنے مستقبل کے ارمان نہیں ہوتے تو حال بھی اپنی کشش کھو دیتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہونے لگا۔

وہ بنی بندھی روٹین اس کے سر پر سوار ہونے لگی۔ ایسا لگتا تھا پلک جھپکتی ایک ہفتہ گزر جاتا۔ ہوٹل کے قریب ایک جگہ تھی جہاں ہوٹل کے ملازمین رہتے تھے۔ درثمین نے بھی وہاں پر ہی ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ روز اپنی شفٹ ختم ہونے کے بعد وہ کچن میں بیٹھ کر اچھا پیٹ بھرنے والا کھانا کھاتی۔ پھر نعیمہ کے کمرے میں چلی جاتی۔

نعیمہ کی پوزیشن سینئر تھی اس کو ہوٹل میں ہی کمرہ ملا ہوا تھا۔ وہ روز اپنی ماں سے بھی ملتی۔ کہنے کو سب بہترین تھا۔ لیکن جیسے ہی وہ اپنے کمرے میں آتی اسے دنیا کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ وہ گرم دودھ میں ایک چمچ چاکلیٹ پاؤڈر ڈال کر پی لیتی تاکہ نیند جلدی آ جائے۔ اس نے جاگ کے کرنا بھی کیا تھا۔ اکیلے اور تنہا۔ اس سب کے باوجود وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ زندگی کہاں جا رہی تھی معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ زندگی تھی بھی کہ نہیں۔

"زندگی اچھی ہی ہے۔ تم اس کو صحیح سے جی نہیں رہیں۔ تنخواہ ملی ہے گھومو پھرو، اڑاؤ۔ کوئی نئے کورسز جوائن کر لو۔ گھومنے چلی جاؤ۔ آگے داخلہ لے لو۔"

لائبہ نے اس کو سمجھایا تھا۔ اس نے بھی لائبہ کا مشورہ بہت دل سے مانا تھا۔ وہ اگلے ہی دن اپنے کام کی سہیلیوں کے ساتھ شاپنگ پر نکل گئی۔ اس نے بہت اچھا دن گزارا۔ ایک اچھے ریسٹورنٹ کا مزیدار کھانا پیک کروایا۔ وہ اپنے

کمرے میں جانے کے بجائے واپس ہوٹل ہی آ گئی۔ اس نے سوچا اب اپنی ماں کے ساتھ بیٹھ کر خوب پارٹی کرے گی۔ کمرے میں جاتے ہوئے اس نے دیکھا۔ نعیمہ اپنے شوہر کے ساتھ ہوٹل کے سب سے بہترین ریسٹورنٹ میں بیٹھی تھی۔ گو کہ وہ وہاں ہی رہتی تھی اس کے باوجود وہ بہت تردد سے تیار ہوئی تھی۔ غالباً ان دونوں کے لیے کوئی خاص دن تھا۔ جس کا تعلق اس ہوٹل سے ہی تھا۔ اس لیے انہوں نے باہر جانے کے بجائے اندر وہ دن منانے کا فیصلہ کیا۔ دریشین ان دونوں کو خوش دیکھ کر مسکرائی۔ وہ وہیں سے پلٹ کر اپنے ٹھکانے پر آ گئی۔ شاپنگ کے لفافے اس نے کونے میں سلیقے سے رکھ دیے۔ اپنا لایا ہوا کھانا اس نے فریج میں سنبھال دیا۔ پھر اس نے ایک کپ دودھ گرم کیا اور اس میں چاکلیٹ پاؤڈر ڈال کر اسے گول گول گھما دیا۔

digest library.com

☆☆☆

''میں اور ندیم گھر دیکھ رہے ہیں تاکہ ہم تینوں ساتھ رہ سکیں۔ مجھے اب اچھی طرح سے تسلی ہو گئی ہے کہ وہ ہمارے پیچھے نہیں آئیں گے۔ انہوں نے ہمارا پیچھا چھوڑ دیا ہے۔'' نعیمہ نے اسے خوشی سے بتایا۔

''پھر آ گئے؟'' دریشین کو گھر کا سن کے خوشی نہیں ہوئی۔

''پریشان ہو؟ کام میں کوئی مسئلہ ہے؟'' نعیمہ کی زندگی کو ایک راہ مل گئی تھی۔ اسے بھٹکے ہوؤں کی تکلیف سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی تھی۔

''نہیں دکھی نہیں ہوں۔ بس بوجھل پن ہے جیسے کچھ کھو گیا ہو۔''

یہ کہتے ہوئے دریشین کی نگاہوں میں ایک چہرہ ابھرا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ شخص اس نے کھو دیا تھا بلکہ اس لیے کیونکہ وہ جانتی تھی کسی اور کے پاس ہو، نہ ہو اس شخص کے پاس اس کا جواب ضرور ہوگا کہ اس نے کیا کھویا تھا اور وہ شخص بشار تھا۔

''میں ماں ہوں دعا کر سکتی ہوں اور وہ میں کرتی رہوں گی، دیکھنا تمہیں اتنی خوشیاں ملیں گی کہ تمہیں اب تک کی زندگی کے غم یاد بھی نہیں رہیں گے۔'' نعیمہ اپنے تجربے کی بنا پر کہہ رہی تھی۔

پھر خوشیوں کی دستک ان تک پہنچی۔ اگلے ہی روز اویس اور لائبہ کی شادی کا کارڈ انہیں موصول ہو گیا۔

☆☆☆

''میں نے پل بننے کی منظوری اس لیے دی ہے کیونکہ یہ میرے علاقے کے لیے بہتر ہے۔ تم یہ نہ سمجھنا تمہارے لیے راستہ کھولا ہے۔''

زمان اور بشار کچھ دیر پہلے حکومتی عہدے داروں سے ملے تھے۔ سب معاملات طے ہوئے تھے۔ پل کب بنے گا۔ کتنی لاگت آئے گی۔ کیا کام بستی والوں کی ذمہ داری ہے اور کیا حکومت کی۔ چونکہ یہ پل ان دو علاقوں کے بیچ بن رہا تھا، اس لیے ان لوگوں کو مطلع کرنا ضروری تھا۔ میٹنگ ختم ہوتے ہی زمان، بشار کو اس کی حیثیت اور مقام یاد دلانا نہیں بھولا۔

''لیکن تم جب چاہو پل پار کر کے اس طرف آ سکتے ہو۔ آ کر دیکھنا، ملکیت کیا ہوتی ہے۔ گردنیں کاٹے بغیر راج کیسے کیا جاتا ہے۔'' بشار نے مخلصانہ مشورہ دیا۔

زمان کو غصہ آیا۔ وہ شخص جو غلامی کے لیے پیدا ہوا تھا راج کیسے کر رہا تھا؟

''تم اس زمین کے مالک نہیں ہو۔ پہلے تم کام کرتے تھے، اس کی قیمت لیتے تھے۔ اب تم سے سارے کام لیے جاتے ہیں اور تمہیں قیمت بھی نہیں دی جاتی۔ تم اب بھی ملازم ہو۔'' زمان نے گردن اکڑائی۔

''اور تم اب بھی مقابلے بازی میں پھنسے ہوئے ہو۔ اب بھی تم یہ دیکھتے ہو کہ میں کہیں تم سے آگے تو نہیں نکل گیا۔ اتنا بے کار وقت کہاں سے لاتے ہو؟ اگر تمہارا وقت بے کار نہیں تو مان لو میں تمہارے لیے اہم ہوں۔''

بشارنے ترکی بہ ترکی جواب دے کر اس کا منہ بند کیا۔

"تم یہ پل بننے دو۔ پھر اس کو پار کر کے آنا اور دیکھنا میرا علاقہ کیسے ترقی کر رہا ہے۔ ہے ہمت؟ یاد ہے یہ پل اگر دس سیکنڈ پہلے ٹوٹا ہوتا تو اس میں ڈوب کر تمہاری جان جاتی۔" زمان نے اسے معجزہ یاد کروایا۔

بشارنے ہمت ٹٹولی جو اسے نہیں ملی۔

"مقابلہ بازی کرنے کا شوق تمہیں ہے، مجھے نہیں۔" بشارنے کہا۔

"ٹھیک ہے میں بستی دریا سنگ کے معاملات دیکھتا ہوں۔ تم پل کے پار کے علاقے کے معاملات دیکھ لو۔ [illegible] تم اپنے علاقے کے لیے کرو۔ میں تمہارے معاملے میں ٹانگ نہیں [illegible] اڑاؤں گا۔ تم میرے معاملے میں دخل نہ دینا۔" زمان کی طرف سے یہ صلح کا معاہدہ زبانی ہی سہی لیکن بہت بڑی بات تھی۔

"تم میں بڑا بننے کا ظرف ہے تو امن کی یہ کوشش مجھے قبول ہے۔" بشارنے اپنے ہاتھ کو جنبش دی کہ اگر زمان مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتا تو وہ ضرور تھام لیتا۔

لیکن زمان کا ظرف ابھی اتنا بڑا نہیں ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے ایک قدم پیچھے ہوا۔ پھر جانے سے پہلے بولا۔

"پل بننے تک ہمت جمع کر لو۔ پھر آنا اور دیکھنا۔ میں نے بستی کو کیا سے کیا بنا دیا ہے۔" زمان کے لیے زندگی اگر مقابلہ تھی تو یہ مقابلہ وہ جیت چکا تھا۔

بشار کو اس کی جیت سے کوئی مسئلہ نہیں تھا کیونکہ اس کے لیے زندگی اب بھی رشتے تھے۔ جو اس کو کبھی نصیب نہ ہوئے۔

☆☆☆

وہ اس عمارت کے درخت کے نیچے تھا جس عمارت کو اسکول کا درجہ حاصل تھا۔ وہ دیکھ سکتا تھا۔ یاسین لنگڑا لنگڑا کر ایک کلاس روم سے دوسرے کلاس روم جا رہا ہے۔ کمزوری کے باعث یاسین کی ایک ٹانگ میں لنگ آ گیا تھا۔ کچھ عرصے آرام کر کے وہ زندگی کی طرف دوبارہ آیا تھا۔ وہ اسکول کے بچوں کو پڑھانے کے ساتھ انہیں جسمانی تربیت بھی دیتا تھا۔ گو کہ اب اس کا جسم پہلے جیسا نہیں رہا تھا لیکن ذہن اس کا اب بھی تیز تھا۔ بشار فارغ وقت میں بھی ادھر آ نکلتا تھا۔ اب آیا تھا تو یاسین مصروف تھا۔ اس لیے اس نے درخت کے نیچے بیٹھ کر ڈائری نکال لی۔

"در ثمین دختر یونس خان!"

ہماری بستی میں کوئی اچھا اسکول نہیں تھا۔ لیکن ہم جانثاروں کو حویلی میں اچھا پڑھنا لکھنا سکھایا گیا۔ پھر بھی میں کبھی انگریزی نہیں سیکھ سکا۔ انگریزی سیکھی ہوتی تو حکومت کی طرف سے آنے والے کاغذات کو آسانی سے پڑھ لیتا۔

خوش قسمتی سے پل کے پار اس گاؤں میں اسکول تھا۔ یہاں میرے ہم عمر جوڑ توڑ کر کے کچھ انگریزی پڑھ بھی لیتے ہیں۔ باقی یہاں پر کام کرنے والے انہیں سمجھا دیتے ہیں۔

اب کے آپ آئیں تو ارباز کو دیکھ کر حیران رہ جائیں گی۔ وہ اب سبز موتی کی مالا پہن کر قبریں صاف کرنے والا لڑکا نہیں رہا۔ میرے ساتھ کام کرتا ہے۔ اپنا بھی کاروبار شروع کر لیا ہے۔ جلد اپنی پک۔اپ بھی لے لے گا تاکہ سامان لانے لے جانے میں آسانی رہے۔

معلوم ہے، میں کیا سوچ رہا تھا؟ میں سوچ رہا تھا لوگ محلوں کی خواہش کرتے ہیں جبکہ رہتا انہوں نے

digestlibrary.com

ایک کمرے میں ہی ہوتا ہے۔لوگ رزق کا لالچ کرتے ہیں۔دستر خوان کھانوں سے بھرا ہو۔ جبکہ معدہ ان کا وہی چند گنے چنے نوالے ہضم کر سکتا ہے۔ اسی طرح لوگ آزادی کا ارمان کرتے ہیں کہ دنیا ان کے سامنے بچھی ہو اور وہ اس کو پار کرتے جائیں۔
دنیا کا چکر کاٹ کر انھیں احساس ہوتا ہے کہ گھر تو وہی ہے جو وہ چھوڑ کر نکلے تھے۔
میں نے یہ بات یہاں سے نکلنے سے پہلے ہی سیکھ لی ہے۔ کچھ کام کے سلسلے میں اکثر شہر جانا ہوتا ہے تو جلد مجھے واپسی کی یاد ستانے لگتی ہے۔ پہلے کچھ عرصہ تو میں نے ایک کرائے کے مکان میں گزار دیا۔
پھر اراز کہنے لگا کہ مجھے اپنا گھر بنا لینا چاہیے۔ وہی زمین جو میری اپنی ہے اس کی پشت پر ایک چھوٹا سا گھر بنایا ہے۔وہ چار دیواری گھر نہیں لگ رہی تھی۔ اس لیے اس میں پھول اگائے۔پھر بھی کچھ کمی تھی تو خوبانی کا درخت لگا دیا۔ اب سوچ رہا ہوں ایک جھولا ڈال لوں۔ گھر کو گھر تو لگنا چاہیے۔
کل رات میں کھلی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میں آپ کے شہر آیا ہوں۔ ہاسٹل کے باہر جا کر میں نے ملاقاتی ہونے کا اقرار کیا ہے۔ پھر آپ کو بلایا گیا۔میں نے تعارف کروایا کہ مجھے محراب خان نے بھیجا ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ حویلی بلا رہے ہیں۔ پہلے تو آپ غصہ ہو گئیں۔ اور تب میرا دل مسکرا اٹھا۔ مجھے آپ کا غصہ کرنا یاد آ گیا۔
پھر اپنے خیال میں، میں بار بار وہاں گیا۔ آپ کو منانے۔ آپ کو قائل کرنے۔میرے خیالوں میں خان صاحب بھی ویسے ہی نرم اور شفیق آتے ہیں جیسا میں نے انہیں سوچ رکھا تھا۔ اس خیال میں محراب خان آپ کے لیے بھی ایک شفیق دادا تھے۔ میں نے سوچا میرے پاس ان کا دیا ایک شفقت بھرا خط ہوتا تو اس کو پڑھ کر آپ واپس آنے پر مان جاتیں۔
پھر وہی ہوا۔ میں جاگتی آنکھوں سے سوچ رہا تھا۔ ہم ساتھ نکلے تھے ہم نے ساتھ بس پکڑی تھی۔ ہم اس گھر میں بھی رکے تھے جس میں آگ لگ گئی تھی۔ اس بار بھی آپ نے ہی آگ لگائی تھی۔ لیکن میرے لیے کھانا پکاتے ہوئے۔ مجھے کھانا پکانا بھول گیا ہے۔ڈیرے کا ایک ملازم ہے وہی کھانا پکا دیتا ہے۔
اس بار اگر آپ کا یہاں آنا ہوا تو اس کے ہاتھ کی پکی سبزی کھلاؤں گا۔ پھر آپ کو باغ میں لے کر جاؤں گا۔ آپ نے کبھی بادام کا پیڑ دیکھا ہے؟ اس کا پھل آپ کی آنکھوں جیسا ہوتا ہے۔ کبھی میرا بادام کے باغ سے گزر ہوتا ہے تو مجھے لگتا ہے وہ سارے پھل آپ کی آنکھوں میں بدل گئے ہیں اور مجھے گھور رہے ہیں۔ مجھ سے خفا ہیں۔
پھر میں سوچتا ہوں آپ کا بھی دم گھٹتا ہو گا تو میں یاد آتا ہوں گا۔ میں آپ کو اچھی یادیں بھی نہیں دے سکا۔
اس لیے میں کہتا ہوں یہاں کبھی مت آنا ہماری ابتدا غلط ہوئی تھی۔ اختتام اچھا کیسے ہو سکتا ہے؟ بس جہاں ہیں اپنا خیال رکھنا۔
"بشارت"

☆☆☆

اس کی شادی پر سہیلیوں کی حاضری پوری تھی۔امبر، ثنا اور جویریہ نے ایم۔فل میں داخلہ لے لیا تھا۔وہ اب بھی ہاسٹل میں تھیں۔ دو لڑکیوں نے نوکری کر لی تھی۔لیکن اسی شہر میں تھیں تو آ گئیں۔بس درثمین تھی جو باقاعدہ ٹکٹ کٹا کر سامان پیک کر کے اس کے شہر آئی تھی۔ کیونکہ لائبہ کی شادی تھی۔ برائیڈل روم میں لائبہ مشکل سے منہ بند کیے تھی۔ ابھی ابھی شاکرہ پھپھو کہہ کر گئی تھیں کہ "بولنے والی دلہن پر روپ نہیں آتا۔"
لائبہ نے چپ کا روزہ رکھا تو سب نے موقع کو غنیمت جانا۔

digest library.com

''شکر ہے اپنی تمام حرکتوں کے باوجود آخر کار یہ لڑکی عزت سے رخصت ہونے جارہی ہے۔'' امبر نے اس کا دوپٹہ سیٹ کرتے ہوئے کہا۔ لائبہ کا منہ غصے سے کھل گیا۔

''اس کی امی بھی یہی کہہ رہی تھیں۔'' ثنا ہنسی۔ لائبہ نے آنکھیں دکھائیں۔

اس کے ابو نے صحت یاب ہونے کے بعد لاہور میں کام شروع کیا تھا۔ ان کا اصل مقصد اس گھٹے ہوئے ماحول سے نکلنا تھا جس میں ہر وقت رشتہ داروں اور ان کی باتیں سر پر سوار رہتی تھیں۔ لیکن ان کو یہ نیا کام راس آرہا تھا۔

''صرف شادی ہو رہی ہے۔ اس کی یادداشت تو نہیں گئی۔ لائبہ سے کیا امید کہ شادی کے بعد بدل جائے؟ اس نے اپنی حرکتیں نہیں چھوڑنی'' جویریہ بولی۔ لائبہ نے اب مکا دکھایا۔

''اسی لیے تو پولیس والے کے ساتھ بیاہ رہے ہیں۔ اب اس کو قانونی، معاشرتی سارے تحفظ دینے کی ذمہ داری اویس بھائی کی۔'' درثمین نے نظروں ہی نظروں میں اس کی بلائیں لیں۔ وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔

''میں دلہن بنی ہوں مجسمہ نہیں جو تم لوگوں کی باتیں نہ سن سکوں۔'' لائبہ آخر بول پڑی۔

''ہم تو خوشی میں اظہار کر رہے ہیں۔ ہمارا ضمیر مطمئن ہے۔ کہ لڑکے کو پہلے ہی تمہاری اصلیت کا پتا ہے۔''

امبرا سے چھیڑنے سے باز نہیں آرہی تھی۔

''دیکھو غنڈوں سے نپٹنے کے لیے غنڈا بننا پڑتا ہے اور پولیس سے مقابلہ کرنے کے لیے ان سے دو قدم آگے چلنا پڑتا ہے۔ میں بس ایسی ہی ہوں۔''

''مجھے لگتا ہے تمہاری پھپو صحیح کہہ کے گئی تھیں۔ تم کم ہی بولو۔ بلکہ اگلے دو سالوں کے لیے بولنا بند کر دو۔'' درثمین کو بھی اس سے زبان کی پریشانی رہتی تھی۔

''فکر ناٹ میری فرینڈ۔ لائبہ اپنی بھی دوسروں کی بولتی بند کرنے والی ہے۔'' اس نے زعم سے کہا۔

☆☆☆

پچھلی رات تک وہ یہ سوچتا رہا تھا کہ یہ معاملہ یہاں تک کیسے پہنچ گیا۔ اگر وہ تفتیشی انداز میں غیر جانب داری ہو کر سارے حالات کو دیکھتا تو اس رشتے میں اتنی لال جھنڈیاں تھیں کہ وہ کب کا بھاگ چکا ہوتا۔ شاید اسی لیے اللہ جذبے پیدا کر دیتا ہے۔ انسان نفع نقصان بھول کر وہ کرتا ہے جس پر دل آمادہ ہوتا ہے۔ اور اصل معاملہ تو دل کو خوش کرنے کا ہی ہے۔ وہ خوش تھا۔ اور جتنا ایک دولہا کو اپنی شادی پر گھبرایا ہوا ہونا چاہیے۔ اتنا گھبرایا ہوا بھی تھا۔ وہ بارات سے پہلے اکیلے ہال آیا تھا۔ باہر لان میں فوٹو شوٹ کروا کر اسے سہرا بندی کے لیے گھر واپس جانا تھا۔

''ادھر دیکھیں، مسکرائیں۔'' فوٹو گرافر اس کی اکیلی تصویریں لے رہا تھا۔

''ہم چاہتے ہیں جب آپ پہلی بار برائڈ کو دیکھیں تو آپ کے تاثرات کیمرے میں کیچر ہوں۔'' فوٹو گرافر اب اسے سمجھانے لگا۔ ''دلہن پیچھے سے اپنی سہیلیوں کے ساتھ آرہی ہیں۔ لیکن آپ نے مڑ کر نہیں دیکھنا۔ جب وہ قریب آئیں گی تب آپ دیکھیے گا اور ہم تصویریں لیں گے۔'' فوٹو گرافر نے اسے بتایا۔

''اف اتنا پریشر۔'' اویس گھبرانے لگا۔ پیچھے آتے قدموں کی ہر آواز کے ساتھ اس کی گھبراہٹ بڑھنے لگی۔

''برائڈ آپ پہلے اپنا ہاتھ ان کے کندھے پر رکھیے۔'' فوٹو گرافر نے کہا۔

اویس کو اپنے کندھے پر سرسراہٹ ہوئی۔ ایک کے بعد ایک تصویریں کھنچنے لگیں۔ اویس سے انتظار نہیں ہو رہا تھا اسے مڑ کر لائبہ کو دیکھنا تھا۔ اسے اپنے اور لائبہ کے علاوہ اس وقت سارے لوگ برے لگ رہے تھے۔ کیا فرق پڑتا ہے تصویر ہو نہ ہو۔ بس اسے یاد رہنا چاہیے کہ اپنی دلہن کو پہلی بار دیکھ کر اس نے کیا محسوس کیا۔

کندھے پر ہاتھ، بازو پر ہاتھ، ایک قدم آگے ایک قدم پیچھے کرتے ہوئے فوٹو گرافر سے اسے کوفت ہو رہی

digest library.com

digest library.com

تھی۔ تب اسے محسوس ہوا کہ اس کے بازو پر جو ہاتھ ہے، وہ بن مانس کی طرح کالے بالوں سے بھرا ہوا ہے۔ اویس جھٹکا کھا کر مڑا۔ پیچھے لال دوپٹے میں ایک داڑھی مونچھوں والا لڑکا تھا۔ جو دانت نکال کر ہنس رہا تھا۔

فوٹو گرافر نے فٹافٹ تصویریں کھینچتے ہوئے یہ منظر بخوبی قید بھی کر لیا تھا۔

''السلام علیکم بھائی! میں لائبہ باجی کا کزن۔'' لڑکے نے ہنستے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔

''لگتا ہے وہ پھر بھاگ گئی۔'' قریب دلہن کی سہیلیوں میں سے ایک بولی۔

اویس نے گھبرا کے ادھر ادھر دیکھا۔ اسی بوکھلاہٹ میں اسے دوسری طرف سے آتی ہوئی لائبہ نظر آئی۔ دلہن کا سرخ جوڑا، شرم وحیا کا گھونگھٹ۔ موتی جیسی جلد اور گلابی ہونٹ۔ اس شاندار پہناوے میں بھی وہ جانتا تھا کہ اندر اس کی چلبلی لائبہ ہی ہے۔ اس کو ایسے آتا دیکھ کر اویس نے جو سکون کا سانس لیا وہ بھی فوٹو گرافر نے بہت اچھی طرح سے کیمرے میں مقید کیا تھا۔

پھر اس کا سکون کا سانس مسکراہٹ میں بدلا اور چہرے پر مصنوعی غصہ آیا۔ فوٹو گرافر جو اس پلان میں شامل تھا، اس نے ہر لحہ صفائی سے کیمرے میں قید کیا۔

اب اویس نے آگے بڑھ کر خود لائبہ کا ہاتھ تھاما۔

''میرا ہاتھ ایسا محسوس ہوتا ہے؟ اتنی دیر سے وہ آپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کھڑا تھا۔ آپ کو پتا ہی نہیں تھا کہ میں ہوں۔'' لائبہ نے معذرت کرنے کے بجائے الٹا گلہ کیا۔

''آپ کو میں مجرم کی نظر سے نہیں دیکھتا اس لیے آپ پہ شک دیر سے ہوتا ہے۔ لیکن یاد رکھیے گا مجھ سے کبھی بھاگنا نہیں۔ میں ڈھونڈ لوں گا۔'' اویس نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب کیا۔

''آپ بھی یاد رکھنا۔ میں ان میں سے نہیں ہوں جسے پیچھے چلنا پسند ہو۔ میں قدم سے قدم ملا کر چلتی ہوں۔ ہمیشہ آپ کا ساتھ دوں گی۔'' لائبہ نے مضبوطی سے کہا۔

ان کی نئی زندگی کا ہر منظر کیمرے میں قید ہو کر امر ہو رہا تھا۔

☆☆☆

''یہ ڈائری اب ختم ہونے والی ہے۔ اس سے اتنی باتیں کر لی ہیں کہ اس سے جدا ہوتے اچھا نہیں لگ رہا۔ لگ رہا ہے آپ سے جدا ہو رہا ہوں۔ جبکہ یہ کاغذ کے سوا کچھ نہیں۔ اور آپ؟ آپ تو کبھی میرے پاس تھیں ہی نہیں۔ جو جدا ہو جاؤں۔ یہ وہ لفظ ہیں جو نہ کبھی کہے جائیں گے نہ پڑھے جائیں گے۔ ان میں ماضی کے کتنے آسیب میں نے بیان کیے ہیں اور آپ نے تحمل سے سنے۔

میں روز بستی دریا سنگ کی خبریں سنتا ہوں۔ آہستہ آہستہ وہاں کے لوگوں کو جینا آ رہا ہے۔ محراب خان کو طاقت قائم رکھنے کا شوق تھا۔ زمان کو بڑھانے کا جنون ہے۔ اس کے جنون میں کچھ اس کا بھلا ہو رہا ہے کچھ لوگوں کا۔ لوگ مضبوط ہو رہے ہیں۔ خیر ابھی تو ہر بات بہت قبل از وقت ہے۔ دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔

لوگ بدلتے نہیں ہیں۔ لوگ سدھرتے نہیں ہیں۔ زمان کو دیکھ کر بھی میں یہی سوچتا تھا۔ اس کا طاقت کا نشہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ یوسف خان بھی کبھی دوسروں کی تکلیف میں اپنی بڑائی ڈھونڈنا نہیں چھوڑیں گے۔ لیکن اب لگ رہا ہے کہ وہ بدل رہے ہیں۔

آپ بتائیں؟ انسان بدل سکتا ہے؟ اگر اپنی غلطیاں جان لے؟ راستہ درست کر سکتا ہے کہ نہیں؟ اب اکثر اسکول جانا ہوتا ہے تو میں قصے سنتا ہوں۔ ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کر لی تھی۔ جانتی ہیں ان سارے قصوں میں ایک بات کیا مشترک ہے۔ گناہوں کو چھوڑنے کے بعد گمنامی ملتی ہے۔ ورنہ لوگ آپ کے پرانے طریقے آپ کو بھولنے نہیں دیتے۔ مجھے تو نیک نامی ہی مل رہی ہے۔ یہاں لوگ میری بہت عزت کرتے ہیں۔

لاہور سے بستی دریا سنگ آنے کی بس جو ہم نے کچھ صفحوں پہلے پکڑی تھی۔ وہ پکڑ کر جب آپ اس علاقے میں اتریں گی۔ تو کسی سے بھی بشارخان کا نام لے کر پوچھ لینا۔ اسکول کے بچے تو بہت شوق سے آپ کو راستہ دکھاتے ہوئے میرے پاس لائیں گے۔ لیکن آپ یہاں مت آنا۔ گولیاں ابھی بھی یہاں چل پڑتی ہیں۔ چیزیں بدلی ہیں لیکن اتنی نہیں۔

کبھی میں سوچتا ہوں آپ سامنے آئیں تو آپ کو بتادوں گا۔ مجھے آپ سے محبت تھی۔ آپ کو بے ہوش کر کے گاڑی میں ڈالنے سے پہلے سے آپ سے محبت تھی۔ شاید وہ محبت اس جھولے پر شروع ہوئی تھی جس پر میرا خطا کار نشانہ گیا تھا۔ اسی لیے میں خود کو معاف نہیں کر پا رہا۔ کیونکہ میں نے محبت ہوتے ہوئے آپ کا خیال نہیں کیا۔ فرماں برداری نبھائی محبت نہیں۔

میں نے اپنے جذبوں کی سچائی کو بہت دیر بعد جانا۔ جان کر بھی انہیں بس خاموشی سے نبھاتا گیا۔ آپ سے پہلے کہنا غلط ہوتا اور بعد میں یہ سب اس لیے نہیں کہا کیونکہ یہ سوچ ہی مجھے امید دے دے گی۔ مجھ جیسا آدمی اب اس قسم کی امید کا حقدار نہیں ہے۔

اس لیے میں آپ سے خاموشی سے محبت کرتا رہوں گا۔ اپنے دل کے چھپے ہوئے خانوں میں اس محبت کو چھپا کر رکھوں گا۔ آپ کے جانے کے بعد بھی آپ کو اپنے اردگرد محسوس کرتا رہوں گا۔ آپ سے خود ہی سوال پوچھوں گا اور خود ہی جواب سوچ لوں گا۔

آپ نے مجھے ہتھیار سے انسان بنا دیا۔ محبت تو ہر انسان کا حق ہوتی ہے۔ بس اس محبت کا اقرار کر کے اس کو پرایا نہیں کروں گا۔ یہ میری ہے اور میرے دل میں رہے گی۔ بالکل ان خطوط کی طرح جو کبھی پوسٹ نہیں ہوں گے۔

''بشار۔''

digest library.com

☆☆☆

درثمین اور اویس کا تعلق بھی عجیب ہی تھا۔ کہنے کو تو وہ اس کے محافظوں میں سے تھا۔ جان پر کھیل کر تو وہی اس کو بچا کر لایا تھا۔ لیکن ان دونوں کے بیچ ہمیشہ لائبہ موجود رہی تھی۔ اب وہ چند دنوں کے لیے لاہور آئی تھی تو پہلی بار اویس نے اس سے براہ راست بات کی تھی۔

''تم سی۔ ایس۔ ایس کی تیاری کرو۔ پھر پولیس میں بھرتی ہو جانا۔ تم بہت لائق ہو، تم یہ کر سکتی ہو۔ جو تجربے تم نے دیکھ لیے ہیں۔ اس سے بہتر پیشہ تمہارے لیے میرے ذہن میں نہیں آتا۔''

شادی کے بعد ایک دن وہ لائبہ سے ملنے گئی تھی۔ تب اس نے اویس کا ان سب باتوں کے لیے شکریہ کیا جس کو اب وہ کم ہی یاد کرتے تھے۔

''آئیڈیا تو اچھا ہے میں نے پہلے اس بارے میں سوچا نہیں۔ لیکن میں وکٹم رہ چکی ہوں کہیں میرے اپنے تجربات میرے کام پر اثرانداز نہ ہوں۔''

''آگے بڑھو گی تو ماضی خود ہی بھول جائے گا۔ یہی بات میں نے بشار سے بھی کہی تھی۔ خیر وہ سی۔ ایس۔ ایس نہیں کر سکتا تھا۔ پولیس فورس میں آ سکتا تھا۔ بس کچھ امتحان پاس کرنے تھے۔ وہ مانا نہیں۔'' اویس نے بے خیالی میں کہا۔

''آپ اس سے رابطے میں ہیں؟'' درثمین کو حیرت ہوئی۔

''پہلے تھا۔ اب تو کافی عرصے سے بات نہیں ہوئی۔''

''وہ کیسا ہے؟'' درثمین نے جذباتی ہو کر پوچھا۔

پھر اویس نے ٹیڑھی نظر سے دیکھا تو اس نے خود ہی اپنی بات سنبھالی۔

''میرا مطلب ہے۔ سدھر گیا؟ یا اب بھی محراب خان کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔''

''وہ بگڑا ہوا نہیں تھا۔ وہ بھٹکا ہوا تھا۔ سیدھے راستے پہ وہی سب سے اچھا چلتا ہے جو کبھی بھٹکا ہوا ہو۔ ایسے لوگوں کو بار بار غلط رستے کی طلب نہیں ہوتی۔ وہ غلط راستے کے خطرے جانتے ہیں۔ اجالے کی قدر اسی کو ہوتی ہے جس نے اندھیرا دیکھا ہو۔ میں تو ایسے لڑکے بہت دیکھ چکا ہوں۔ ابھی تو میں چھٹیوں پہ ہوں، اگلی بار تمہارا آنا ہوا تو تمہیں 'بچہ جیل' لے کر جاؤں گا۔ وہاں کے کورس ڈیزائن ہی اس لیے ہوتے ہیں کہ بچے غلطیاں سدھار کر آگے نکلیں۔ بلکہ انگریزوں کے دور میں تو اسے جیل کہنا بھی منع تھا۔ وہ ریفارم کی جگہ کہلائی جاتی تھی۔ اب تو میں ضرور کہوں گا کہ تم سی۔ ایس۔ ایس کرو۔ تم سسٹم کو جج کرنے کے بجائے اس کو ٹھیک اسسٹ کرو گی۔'' اویس نے بہت یقین سے کہا تھا۔

☆☆☆

اس کا اس شہر سے جانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ واپسی کا ٹکٹ اس کے ہاتھ میں تھا لیکن بس اسٹیشن جانے کے بجائے وہ اپنے کالج آ گئی۔

''میں جانتی ہوں، میرے یہاں سے جانے کے بعد آپ کو ذہنی سکون ملا ہو گا کہ ایک کام ختم ہوا۔ میں بھی اس لیے جلدی سے گئی تھی۔ تب آپ کا شکریہ نہیں کیا تھا۔ آج کرنے آئی ہوں۔ آپ نے بہت بڑا کام کیا تھا مجھے واپس یہاں [illegible] لیکن آپ نے صحیح معنوں میں استاد [illegible] میں ساری عمر آپ کی ممنون رہوں گی۔'' درثمین پرنسپل کے پاس آئی تھی۔

digest library.com

''سچ پوچھو تو اس وقت بہت مشکل فیصلہ تھا۔ مجھے ڈر تھا لوگ ہمارے کالج میں داخلہ لینا بند کر دیں گے۔ لڑکیوں کی بدنامی ہو گی میڈیا اس بات کو اچھالے گا۔ لیکن اس وقت مجھے صرف تمہاری فکر تھی۔ میرے ہوتے ہوئے ایک بھی لڑکی کا مستقبل خراب ہو جائے یہ میں نہیں ہونے دے سکتی تھی۔ مجھے بہت خوشی ہے اپنے فیصلے پر، تمہیں آج دیکھ رہی ہوں تو سکون ہو رہا ہے۔ بدنامی کے بعد گمنامی واحد راستہ نہیں۔'' پرنسپل اس کے آنے پہ بہت خوش تھیں۔ انہوں نے اس کو چائے بھی پلائی۔

اس کے بعد بھی وہ بس اسٹیشن تک نہیں گئی۔ پھر وہ ہاسٹل آ گئی۔

''جتنا میں نے اور لائبہ نے آپ کو ستایا ہے۔ خالی ہاتھ آنا بنتا تو نہیں تھا لیکن میرے آنے کا کوئی پلان نہیں تھا۔ بس میں یہ دعائیں لے کے آئی ہوں کہ ہماری جانشینوں میں کوئی ہم جتنا تنگ کرنے والا نہ ہو۔ تاکہ آپ کا وقت سکون سے گزرے۔'' پرنسپل کے مقابلے میں وارڈن سے اس کی اچھی بے تکلفی تھی اس لیے وہ ہنس ہنس کر کہہ رہی تھی۔

''تم تو پھر ٹھیک تھیں۔ واپس آ گئی ہو تم مجھے اچھا ہی لگ رہا ہے لیکن وہ لائبہ۔ وہ بھی اچھی تھی بس نادان تھی۔ اب وہ بدلی ہے کہ اب بھی آ بیل مجھے مار ہے؟'' وارڈن اس کو دیکھ کر سچ میں خوش ہوئی تھیں۔

''وہ نادان عقل مندی کے بہت بڑے بڑے مرحلے طے کر رہی ہے اس کی فکر نہ کریں۔''

''تم سناؤ تم، کیا کر رہی ہو۔ تمہارا تو کوئی اتا پتا بھی نہیں تھا۔ تمہارا ایک پارسل آیا پڑا ہے مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ کہاں بھجوانا ہے۔ رکو میں لاتی ہوں۔''

☆☆☆

دو نوجوان لڑکے ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے اور ایک دوسرے کو گھور کر دیکھ رہے تھے۔ دونوں کے بیچ میں ایک رومال تھا۔ ایک لڑکے نے دائیں طرف سے حملے کا اشارہ کیا اور بائیں ہاتھ سے رومال جھپٹ کر بھاگا۔ دوسرے لڑکے نے اس کو تھام کر گرا لیا۔ پھر ٹانگوں کی قینچی میں اس کو قید کر لیا۔ وہ لڑکا پھر بھی نکلنے کی کوشش کرتا رہا۔ کسی طرح گھسیٹتا خود کو چھڑاتا اپنے ساتھ دوسرے لڑکے کا وجود بھی کھینچتا ہوا وہ اختتامی لائن پر آ گیا۔

بشار نے سیٹی بجائی۔ پوائنٹ، لائن پر آنے والے لڑکے کا ہوا تھا۔ اب دونوں لڑکوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور نظروں سے سلام کیا۔ پھر وہ اپنی اپنی ٹیم میں چلے گئے۔ اگلی باری دوسری ٹیم کی تھی۔

زمین کی دیکھ بھال کرنے کے لیے اس کے پاس لوگ موجود تھے۔ اپنی کسرت کے لیے اس نے اپنی زمین سے کچھ دور ایک جگہ لی تھی۔ زمان خان سے ایک بار پھر اس کی بات ہوئی تھی۔ اس بار اس نے سودا کیا تھا۔ زمان خان چاہتا تھا وہ بستی کے لیے نئے گارڈز کو تربیت دے، اس کے بدلے وہ منہ مانگی قیمت دینے کو تیار تھا۔ یہ بات زمان خان نے زعم میں کہی تھی۔ وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ کوئی بھی قیمت دینے کی استطاعت رکھتا ہے۔

بشار نے یہ بات اس لیے مانی تھی کیونکہ اسے بھی مصروفیت چاہیے تھی اور یہ کام اسے پسند تھا۔ قیمت میں اس نے اپنے وفادار کتے واپس مانگے تھے۔

بشار بستی دریا سنگ نہیں گیا۔ سیکھنے والے لڑکے دریا پار کر کے اس کے پاس آتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بشار کی زمین سے کچھ دور ایک ٹریننگ سینٹر بن گیا۔ جہاں یہ جانور تھے، ان کو سنبھالنے والے تھے۔ کسرت کرنے کی جگہ بھی تھی۔ یاسین بھی اکثر اس سے ملنے یہیں آتا تھا۔ کبھی اسے محراب خان یاد آتے تو اسے کچھ خاص محسوس نہیں ہوتا۔ غصہ بھی نہیں۔ وہ کسی دوسرے کے حصے کی معافی نہیں دے سکتا تھا لیکن اپنا قصور اس نے محراب خان کو معاف کر دیا تھا۔ اسی لیے وہ کوئی بوجھ سینے میں لادے نہیں پھر رہا تھا۔ اس کے سینے کا ہر سیاہ خانہ اب ختم ہو گیا تھا۔

digest library.com

☆☆☆

گھر پہنچ کر وہ سادہ لباس میں آیا۔ اس نے ایک خالی صفحے پر خط لکھ کر درشین سے اس خوشی کا اقرار کیا جو اس کو بچوں کو تربیت دینے میں ملتی تھی۔ پھر اپنے بستر کے پاس پڑی چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اسے اپنی ڈائری نہیں مل رہی تھی۔ اس نے باہر نکل کر ملازم کو آواز دی۔

"وہ ڈائری تو ختم ہو گئی تھی، میں نے پھینک دی۔" ان پڑھ ملازم سے اور توقع بھی کیا کی جا سکتی تھی۔

"ختم نہیں ہوئی تھی بے کار تو تب تھی جب خالی تھی۔ اب تو خزانہ بن گئی تھی۔" بشار غصہ کرتا نہیں تھا لیکن اسے غصہ آ رہا تھا۔

"لکھنے کی جگہ بھی نہیں تھا۔ خان، مجھے معاف کر دیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ آپ کو چاہیے۔ وہ تو ارباز صاحب نے کہا۔" ملازم نے وضاحتیں دیں۔

بشار چونکا۔ "کیا کہا ارباز نے؟"

"ارباز صاحب نے کہا، یہ فالتو ہے، مجھے دے دو۔ میں نے منع بھی کیا۔ انہوں نے کہا، ردی میں نکل جائے گی۔ کیوں خان کا کمرہ گندا کرتے ہو۔"

"وہ ڈائری ارباز لے گیا؟" بشار کو یقین نہیں آیا۔ اسے اس سے کیا کام ہو سکتا تھا۔

ملازم کے جانے کے بعد بشار سوچ رہا تھا کہ "ارباز نے اس ڈائری کا کیا کیا ہوگا؟ ارباز تو ایسا بے وقوف نہیں کہ اس کے کام کی چیز ردی میں دے۔ کہیں وہ ڈائری اپنی بہنوں کے پاس تو نہیں لے گیا؟ ان سے پڑھوانے؟"

اسی لمحے بشار کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے ارد گرد دیکھا۔ وہ خط جو اس نے بغیر وزن کے رکھ دیا تھا کہیں اڑ گیا۔ وہ اس خط کو ڈھونڈتے ہوئے پھولوں کی کیاری کے قریب آیا۔

تب ہی بنگلے کی گھنٹی بجی کوئی اندر آیا تھا۔ آنے والی کے نازک قدموں کی دھمک اس نے مٹی میں محسوس کی۔

"اب آپ یہاں آئیں گی تو دیکھیں گی۔ لوگ اب بھی بہادر ہیں۔ لیکن اب نئی نسل محافظ ہے، ظالم نہیں۔ لیکن آپ یہاں مت آنا۔ پھولوں کو کھلا دیکھ کر آپ جانے کا دل نہیں کرے گا اور اگر آپ پھر بھی واپس چلی گئیں

تو میرا ان پھولوں میں پھر کبھی بھی دل نہیں لگے گا۔"

درثمین کے ہاتھ میں اس کا خط تھا۔ اس نے وہ باآواز بلند پڑھا۔

بشار اٹھ کھڑا ہوا۔ وقت تھم گیا تھا۔

"ہر خط میں مجھے نہ آنے کا کیوں کہتے ہیں؟" اس نے پھر بھی یہ سفر کیا تھا۔

بشار کو معلوم ہو گیا۔ اس کی ڈائری کہاں گئی تھی۔

"کیونکہ آپ کو مجھ سے ضد باندھنے میں مزہ آتا ہے۔ میں جانتا تھا۔ میں منع کروں گا تو آپ ضرور آئیں گی۔" وہ مسکرا دیا۔

digest library.com

"تم بدل گئے ہو۔ پہلے اس نظر سے کیا تم میں تو مجھے دیکھنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔" اسے شرم آئی پردہ چھپا گئی۔

"ہر روز آپ سے اتنی باتیں کی ہیں کہ اب سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ خواب ہے کہ حقیقت۔" اس نے مسکرا کر نظریں جھکائیں۔

وہ چل کر آگے آگئی۔

"ایک بات بتاؤ۔ مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کچھ کھو گیا ہو؟" اس سوال کا جواب اس کی زندگی کا فیصلہ کرنے والا تھا۔

"کیونکہ کچھ کھو گیا تھا۔ آپ کی نزاکت۔ آپ کا ڈر۔ آپ کا وہ وجود جس پر دوسرے حق جتا رہے تھے۔ آپ وہاں کی قید سے نکل کر دوسری قید میں آئی تھیں۔ آزادی تو آپ کو اب ملی ہے۔"

"تمہیں راستہ مل گیا؟" اس نے رشک سے پوچھا۔

"جی۔" اس نے دوبارہ نظر اٹھائی۔

"مجھے نہیں مل رہا۔" اس نے کہا۔

"پہلے کسی منزل کو چاہیں۔ پھر اس تک جاتا کوئی نہ کوئی راستہ مل جائے گا۔" بشار نے اب سنجیدہ انداز میں کہا۔

"تم نے کس منزل کو چاہا؟" وہ پھر سے پرانے بے فکر انداز میں آئی۔

بشار نے پھر نظر جھکائی۔ جو لکھا تھا، اس کو کہنا آسان نہیں تھا۔

"میں تو اس جگہ کو اتنا پرسکون اور خوبصورت دیکھنا چاہتا تھا کہ لوگ خوشی سے رہنے آئیں۔" خاص کر آپ۔ آخری تین لفظ اس نے دل میں کہے۔

"میں کیا کروں، کوئی ایسی مصروفیت ڈھونڈلوں جس سے مجھے یہاں رہنا اچھا لگے؟" درثمین اب منہ پھیر کر وادی کو دیکھنے لگی۔ اسے لگ رہا تھا اس کی منزل یہیں ہے۔

بشار نے جنگلے کا دروازہ کھولا۔ دونوں باہر آئے۔

"اب یہاں خون نہیں بہتا، پھول کھلتے ہیں۔" بشار نے کہا۔

"اور حویلی۔" درثمین کو اپنا آپ اب بھی سفر میں لگ رہا تھا۔ وہ حویلی نہیں گئی تھی نہ ہی بستی دریا سنگ پہنچی تھی۔ اس نے آگے ہو کر وہ جگہ دیکھی جہاں بستی دریا سنگ جانے کا راستہ ہوا کرتا تھا۔ وہاں اب پل نہیں تھا۔

"راستہ کہاں ہے؟"

"وہاں سے نکلنے کے بعد واپسی کا راستہ نہیں ہوتا۔ پل بن رہا ہے، بن جائے گا۔ لیکن واپس جانے کی ہمت مجھ میں تو نہیں۔" بشار نے اقرار کیا۔

"کیوں کیا اب بھی وہاں خطرہ ہے؟" وہ ڈری۔

"ماضی کے آسیبوں سے ڈر لگتا ہے۔" اس نے اقرار کیا۔

"رہنے کی نہ سہی صحیح۔ کیا دیکھنے جانے کی ہمت بھی نہیں؟" درثمین اب دوبارہ اس کو دیکھ رہی تھی۔ اسے پھر

سے بشار وہ ننھا لڑکا لگا، جس کو سمجھانا پڑتا تھا۔
''ابھی تک تو نہیں۔'' اس نے کہا۔
''میں ساتھ چلوں پھر بھی نہیں؟'' درثمین نے پوچھا۔
بشار حیران رہ گیا۔
''آپ پل بننے تک رکیں گی؟''
''معلوم نہیں شاید۔ شاید جا کر واپس آجاؤں۔ لیکن مجھے لگتا ہے ان تلخیوں کو دفنانے کا اس سے بہتر طریقہ نہیں ہوگا۔ کہ وہاں اچھے وقتوں میں واپس جایا جائے۔''
''پھر مجھے بھی ساتھ لے جایئے گا۔'' اس نے کہا۔ درثمین مسکرا دی۔ کیونکہ اس کا اپنے لبوں پر قابو نہیں تھا۔
''امی بھی آئی ہیں۔ انکل بھی ساتھ ہیں۔ وہ ارباز کے گیسٹ ہاؤس میں ہیں۔'' اس نے بتایا۔
''وہ ان کا اپنا گھر ہے، ضرورت پڑنے پر کرایہ پر دے دیتے ہیں۔'' بشار نے کہا۔
''اب یہاں باہر کے لوگوں کا آنا جانا شروع ہو گیا ہے تو ادھر ہوٹل بھی ہونا چاہیے۔'' درثمین نے مشورہ دیا۔
''میرے ابا کی زمین ہے لیکن وہ پل کے اس پار ہے۔ امی کا تجربہ بھی ہے۔ پہلا ہوٹل تو ہمارا اپنا ہی ہونا چاہیے۔''
''کیا خبر پل بننے تک ادھر کے حالات اور بہتر ہو جائیں۔ لیکن اس سلسلے میں آپ کو زمان کا سامنا کرنا پڑے گا۔''
رقابت کا ایک کانٹا بشار کے دل میں اب بھی کہیں تھا۔
درثمین نے اسے بغور دیکھا۔
بشار نے نگاہ نیچے کی۔
''کیا آپ نے میری پوری ڈائری پڑھی؟'' اس سے پوچھے بنا رہا نہیں گیا۔
''روز پڑھتی ہوں۔ ختم ہوتی ہے تو دوبارہ نکال لیتی ہوں۔'' یہ روپ کہاں چھپا رکھا تھا۔ اس نے بھی آخری الفاظ دل میں کہے تھے۔
''جس نے مرضی سکھا دی، اس نے یہ روپ بھی جگا دیا۔'' بشار کو اس بات میں سکون تھا کہ انکار نہیں ہوا۔
''میں نہیں جانتی۔ اس کا کیا جواب دوں۔'' درثمین نے سچ کہا۔
''میں نے جواب مانگا بھی نہیں۔'' وہ بھی پر سکون تھا۔
''پھر؟'' درثمین نے پوچھا۔
''پھر آپ کے مہمانوں سے ملتے ہیں۔ ان کو گاؤں دکھاتے ہیں۔ پل بننے کا انتظار کرتے ہیں۔ پھر دیکھیں گے، کون سی منزل ہماری ہے۔'' وہ مسکرایا۔
درثمین اس کے ساتھ چل دی۔ منزل نہ سہی راستہ اسے مل گیا تھا۔ اسے بشار کے ساتھ رہنا تھا۔ وہ جانتی تھی۔
اسے ژاہلہ یاد آئی، وہ ان ہی وادیوں میں پھل کھاتی تھی، کھیلتی تھی جھولا جھولتی تھی۔ برسوں بعد اسے ژاہلہ سے خوف نہیں آیا۔ وہ دونوں ماضی کو بھلا کر نہیں اسے سنوار کر جینے والوں میں سے تھے۔ ایک دوسرے سے بہتر ساتھ ان کے لیے اور کیا ہو سکتا تھا۔
''پرانے بھگشو کی روح آپ کے آنے کی خوشی میں گھنٹی بجا رہی ہے۔'' بشار نے کہا۔
''کہاں؟'' درثمین نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔
''میرے دل میں۔'' اس جانثار کا دل ایک بار پھر کسی دوسرے کی خوشی پر سب نچھاور کرنے کو تیار تھا۔
☆☆☆

digest library.com

digest library.com

حمیرا شفیع

''معزز سامعین!''

وہ دیوار گیر آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ ہاتھوں میں ایک ڈائری تھام رکھی تھی۔

''میری آج کی تقریر کا موضوع ہے ''ہمارے معاشرے کی فلاح و بہبود میں عورت کا کردار''۔ خواتین و حضرات! جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ عورت اور مرد دونوں کے وجود سے ہی معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ یہ دونوں ہی اس کے اہم ستون ہیں۔ مگر نجانے کیا بات ہے کہ ہمیشہ سے ہی مرد کے کردار اور کاوشوں کو سراہا جاتا ہے مگر عورت کی محنت، خدمت کو یکسر فراموش کر دیا جاتا ہے۔ آپ کسی بھی کامیاب مرد کی ہسٹری کھنگال کر دیکھ لیں۔ آپ کو اس کی ترقی اور خوشحالی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہی نظر آئے گا۔''

''اور اس کی تباہی اور بربادی کے پیچھے بھی ایک عورت کا ہی ہاتھ نظر آتا ہے۔ مرحا صاحبہ!''

بھاری سی مردانہ آواز پر اس نے خون خوار نظروں سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ روجان ہاتھوں میں لیپ ٹاپ تھامے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ چہرے پر تپا دینے والی مسکراہٹ تھی۔ اس نے اپنا غصہ ضبط کیا اور دوبارہ تقریر جاری رکھی۔

''ہاں تو سامعین آپ اپنے اردگرد نظر ڈالیں تو آپ کو حوا کی بیٹی کے کتنے حسین روپ نظر آئیں گے۔ وہ ماں بھی ہے۔ بہن، بیٹی اور بیوی بھی......''

''ہاں اس کے علاوہ نند، بھاوج، دیورانی، جٹھانی اور سوتن بھی۔'' پیچھے سے پھر روحان کی آواز آئی۔ اب کے اس کا صبر تمام ہوا۔ اس نے ڈائری ڈریسنگ ٹیبل پر پٹخی۔

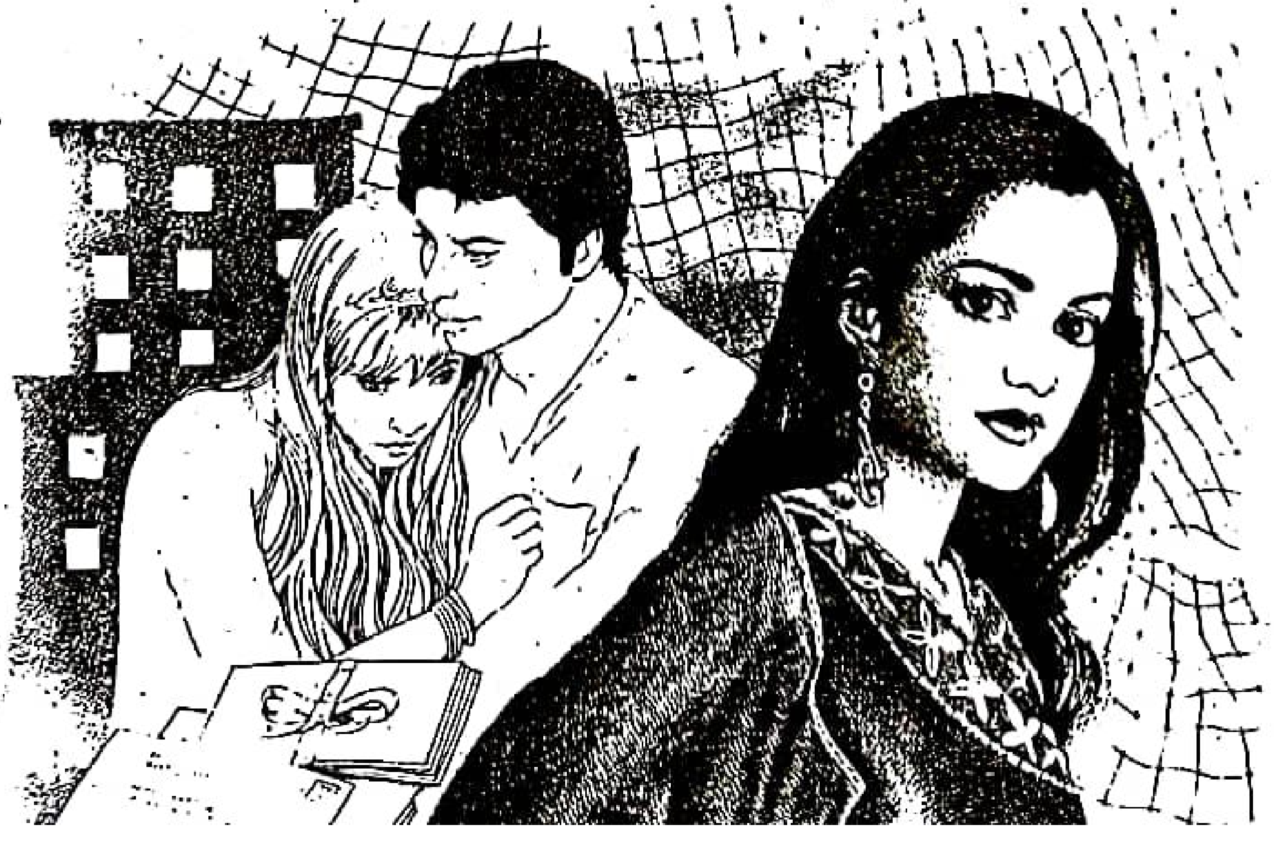

digest library.com

"نہ تم مجھے پریکٹس نہیں کرنے دو گے۔ پرسوں میری فائنل ریہرسل ہے اور میری بالکل بھی تیاری نہیں ہے۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"یہ کون سا طریقہ ہے تقریر کی تیاری کرنے کا۔ شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اور دیکھ کر بولنا تو آسان ہے۔ مگر جب ہال کھچا کھچ بھرا ہو گا تو تمہارے چھکے چھوٹ جائیں گے۔ اگر پریکٹس کرنی ہے تو چار بندوں کے سامنے تو کرو کہ اعتماد کا لیول معلوم ہو سکے۔"

جتنی تیزی سے اس کی زبان چل رہی تھی۔ اتنی تیزی سے وہ لیپ ٹاپ پر انگلیاں چلا رہا تھا۔ وہ اس کا نادر مشورہ سن کر جل گئی۔

"ہنہ چار بندے...... ہمارے گھر میں تو کل مل ملا کر آٹھ بندے ہیں۔ مگر وقت کس کے پاس ہے کہ دو گھڑی کے لیے میری تقریر سنے۔ جو گھر کے اندر لوگ ہیں وہ ہر وقت اپنے موبائل میں گھسے رہتے ہیں اور جو گھر سے باہر ہیں انہوں نے گھر آ کر کھانے کے بعد سونا ہوتا ہے۔ اب میں دیواروں کے سامنے ہی پریکٹس کروں گی نا۔"

دیواروں سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے
ہم بھی پاگل ہو جائیں گے ایسا لگتا ہے

عرضہ گنگناتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس نے شاید راستے میں آدھی پونی بات سن لی تھی۔

"ماشا اللہ...... ماشا اللہ...... تم دونوں یہاں تشریف فرما ہو۔ فردا آپی تو بتا رہی تھیں کہ تم سب نے آج باجماعت شاپنگ کرنے جانا ہے۔"

"آپی لوگ تو چلے بھی گئے ہیں۔ مگر مجھے تو اپنی تقریر تیار کرنی ہے۔" اس نے بے چارگی سے ہاتھوں میں تھامی ڈائری کو دیکھا۔

"اور تم......؟" اس نے سوالیہ نظروں سے روحان کو دیکھا۔

"نہ بابا نہ...... خالص زنانہ شاپنگ سے مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔ فراز بھائی کی شادی ہے۔ وہ جانیں ان کا کام۔ مجھے تو صرف جوتے لینے ہیں وہ میں اکیلا جا کر لے آؤں گا۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"مگر مجھے تو ان سب کے ساتھ جانا تھا مگر عین وقت پر چچی آ گئیں اور اماں نے مجھے چائے وغیرہ کے لیے روک لیا۔ مجھے اپنے لیے شال لینی تھی۔ ریڈش میرون کلر کی...... کل عاتکہ کی برتھ ڈے پر جانا ہے۔"

"ریڈش میرون تو نہیں مگر میرون کلر کی ایک شال تو ہے میرے پاس پچھلے سال فردا آپی نے کھدر کا سوٹ گفٹ کیا تھا۔ اس کے ساتھ کی ہے۔"

"اچھا تو میرون ہی نکال دو۔ میں اسی سے کام

چلالوں گی۔"

"مگر شالیں تو سب کی سب اسٹور روم میں پیٹی میں رکھی ہیں۔ ابھی نکالی ہی نہیں ہیں۔"

"ہیں...... کیا ابھی تک شالیں ہی نہیں نکالیں۔ دسمبر ختم ہونے کو ہے۔ جنوری میں تو سنا ہے کہ درجہ حرارت مائنس ون تک چلا جائے گا۔"

"شاید یہ خود بھی مائنس ون ہونے کے بعد نکالنا چاہ رہی ہے۔" روحان نظریں مستقل لیپ ٹاپ پر گاڑھے ہوئے بولا۔

"مجھے نہیں پتا مجھے تو میرون والی ابھی کے ابھی نکال دو۔" عرضہ ضدی بچے کی طرح روٹھ کر بولی۔

"اچھی بھلی میں تقریر تیار کر رہی تھی۔ پہلے روحان نے آکر ڈسٹرب کر دیا۔ اب تم تنگ کر رہی ہو۔ میں نہیں جا رہی۔ روحان! پلیز تم نکال دو۔" مرحا نے لجاجت سے کہا۔

"چلیے محترمہ!" روحان نے لیپ ٹاپ بند کر کے سائیڈ پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں یاد آیا وہ شالیں شاید پیٹی میں نہیں پیٹی کے اوپر رکھے سوٹ کیس میں پڑی ہیں۔ پیٹی میں تو اماں نے بامشکل لحاف ہی ٹھونسے تھے۔" مرحا نے دوبارہ ڈائری کھولتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو معزز سامعین! میں آپ کو بتا رہی تھی۔"

اس نے دوبارہ تقریر شروع کی عرضہ اور روحان نے اسٹور روم کا رخ کیا اسٹور روم میں جہازی سائز کی پیٹی کے اوپر ایک بڑا سا سوٹ کیس دھرا تھا جو کسی بھی قسم کے تالے وغیرہ کے تکلف سے پاک تھا۔ روحان نے کھینچ کر اس کا سخت کنڈا کھولا۔ اندر ترتیب سے کپڑے تہ کیے رکھے تھے۔ عرضہ نے اچک کر دیکھا۔ کپڑوں کے نیچے دبی میرون کلر کی شال کا پلو بالکل ذرا سا نظر آیا تو اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

"وہ رہی میرون شال...... روحان۔" وہ اندر جھانکتے ہوئے خوشی سے چلائی۔

"کیا یہ والی......" روحان نے ایک دوسری والی باہر کھینچی۔

"نہیں...... یہ والی نہیں وہ والی......"

اس نے خود ذرا سا اچک کر میرون شال کا پلو ہاتھ سے پکڑ کر باہر کھینچنا چاہا مگر شال اس کی رینج سے باہر تھی۔

روحان ابھی ادھر ادھر ہی ہاتھ مار رہا تھا۔ سامنے دھری میرون شال اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔ عرضہ کو تپ چڑھی کہ شاید وہ اسے چڑانے کے لیے ایسا کر رہا ہے۔ اس نے اچھل کر شال کا پلو باہر کھینچا شال تو باہر نکل آئی مگر زور کا جھٹکا لگنے سے وہ خود پیچھے الٹتے الٹتے مشکل سے بچی۔

"مگر عرضہ یہ تو براؤن ہے......" روحان بولا تو وہ چیخ گئی۔

"یہ براؤن نہیں میرون ہے کوڑھ مغز تم مرد ہمیشہ سے ہی رنگوں کے معاملے میں کورے ہوتے ہو۔"

"ہائے اللہ! کاش یہ ریڈش میرون ہوتی تو لیمن سوٹ پر کتنا اٹھتی۔" وہ شال کو خود سے لگا کر بولی۔

"تمہیں یہ کلر بہت پسند ہے۔" روحان سوٹ کیس بند کر کے اپنے ہاتھ جھاڑ رہا تھا۔

"پسند" ہنہ...... اس نے سر جھٹکا۔

"مجھے ریڈ اور میرون کلر کے ہر شیڈ سے عشق ہے۔ یہی تو زندگی کا رنگ ہے۔ تمہیں پتا ہے ان دونوں کلرز کو ملا کر کتنے نئے شیڈز بن چکے ہیں۔ اور یہ نیا سال آ رہا ہے نا 2026ء اس کا بھی سنا ہے کہ کلر اسی ریڈ اور میرون کا ہی کوئی شیڈ ہو گا۔ میں تو ویسا ہی سوٹ ضرور بنواؤں گی۔"

"اور وہ سرخی پاؤڈر...... میرا مطلب ہے کہ میک اپ بھی یقیناً اسی کلر کا ہو گا۔" اب کے وہ جل کر بولا۔

"نہ...... نہ میک اپ کا کوئی ایشو نہیں ہے۔ میں لپ اسٹک اور بلش آن وغیرہ سب ہی کو پہلے سے موجود رنگوں کے ساتھ مکس کر کے اپنی مرضی کا کلر بنا لیتی ہوں۔" وہ فخریہ بتا رہی تھی۔

"پاگل لڑکی......" وہ افسردگی سے مسکرایا۔

digest library.com

☆☆☆

ٹی وی لاؤنج میں خوب رونق تھی۔ کل خریدی جانے والی بری ساری کی ساری کارپٹ پر ڈھیر تھی۔ ساتھ ساتھ چائے اور مونگ پھلیوں کا دور بھی چل رہا تھا۔ دونوں دیورانی جٹھانی صوفے پر براجمان خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔

"آپا! دیکھو نا ذرا! کہیں سے بھی یہ بری کے کپڑے لگ رہے ہیں۔ کوئی موتی ستارہ نہیں۔ کوئی گوٹا کرن۔ چمک دمک نہیں۔ رنگ بھی مدھم سے۔ ہلکے ہلکے سے۔ آخر کچھ تو شوخ لیتیں۔"

"بس قدسیہ! کیا بتاؤں یہ اپنی فروا اور آنے والی بہورانی نے میری ایک نہیں سنی۔ گھر سے ہی طے کر کے گئی تھیں کہ گولا گنڈا ٹائپ بری نہیں خریدنی۔ یہ تو ولیمہ کے لیے بھی آف وائٹ کا کوئی شیڈ دیکھ رہی تھیں وہ تو فراز نے اصرار کر کے کاسنی کلر کی میکسی کا آرڈر دلوایا۔"

"توبہ ہے بھئی تمہیں کپڑوں کے رنگ مدھم لگ رہے ہیں مگر دام دیکھو نا تو دنگ رہ جاؤ۔ آسمانوں کو چھوتے ہوئے۔"

"تمہیں اپنی اور میری بری یاد ہے نا۔ ساس اماں مرحومہ نے کتنے شوخ وشنگ لباس تیار کروائے تھے۔ آنکھیں خیرہ ہوگئی تھیں دیکھنے والوں کی۔" وہ ماضی کی یادوں میں کھوگئیں۔

"ہاں آپا میری اور آپ کی ایک جیسی ہی تھی بری۔ وہ مولاجٹ سلک کے غرارہ سوٹ آتشی گلابی رنگ کے اور مٹکا سلک کی مونگیا فراکیں جن کے دامن پر سلور گوٹے کا کام تھا۔"

"ہیں...... کیا مولاجٹ سلک اور مٹکا سلک۔" مونگ پھلیاں ٹونگتے فراز کی باچھیں چر گئیں۔

"ہاں...... ہاں وہ ساٹن اور بروکیڈ کی کرتیاں جن کے ساتھ جاپانی گڈی کی خوب گھیر والی شلواریں تھیں۔"

قدسیہ بیگم کو وہ سب کپڑے آنکھوں کے سامنے لہراتے نظر آ رہے تھے۔

"چچی جان! وہ پرانے اسٹائل آج کل بھی فیشن میں ان ہو رہے ہیں وہ آپ کی جاپانی گڈی والی خوب گھیر والی شلوار کا نیو ورژن آج کل کی فرشی شلوار ہے تو سہی......" فروا نے ان کے کپ میں مزید چائے انڈیلی۔

"آپ دونوں خواتین اداس نہ ہوں۔ باقی سب جو مرضی پہنیں مگر میں نے فراز بھائی کی شادی پر خوب شوخ رنگوں کے کپڑے بنوانے ہیں۔"

"اور وہ شوخ رنگ یقیناً سرخ رنگ کے ہی مختلف شیڈز ہوں گے۔" فروا اس کی دیوانگی سے بخوبی آگاہ تھی۔

"خبردار جو شادی کے روز سرخ پہنا، اس کا حق تو صرف دلہن کو ہی ہوتا ہے جب وہ نہیں پہن رہی تو تم بھی نہ پہنو۔" عرشہ کی امی روایتی سوچ کی مالک تھیں۔ "چچی جان! اب اس طرح کون سوچتا ہے۔ پہننے دیں نا جو یہ خوشی سے پہننا چاہ رہی ہے۔" فراز نے اس کی روتی صورت دیکھ کر دلاسا دیا۔

"بلکہ تم تینوں کا شادی کا ڈریس میری طرف

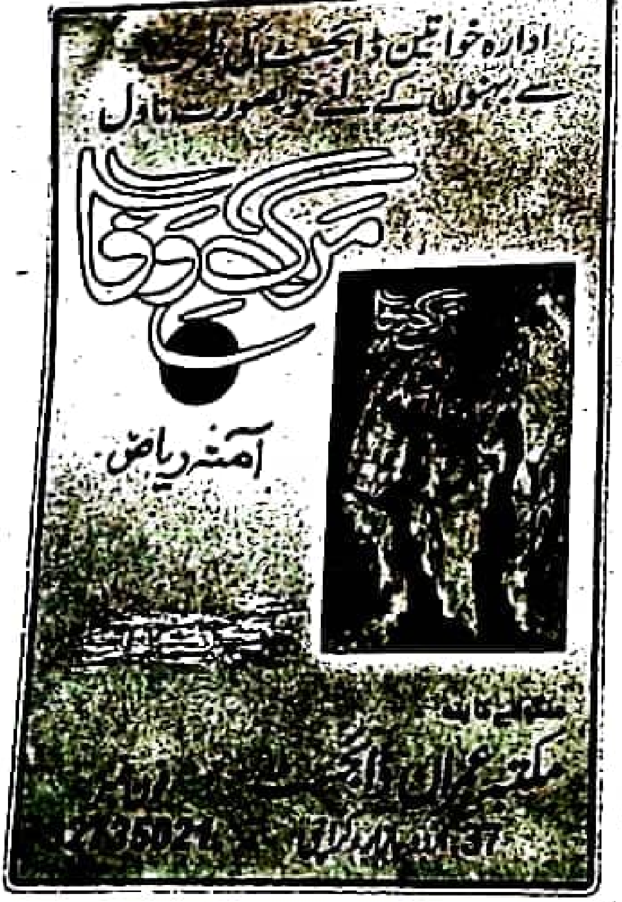

سے ہوگا۔ روحان اتم ان کو شاپنگ پر لے جانا ضرور اور اے ٹی ایم پیرالوز کر لینا۔" فراز بھائی بھی شادی کی خوشی میں حاتم طائی بنے ہوئے تھے۔

"ہرا......" فروا، عرضہ اور مرحا نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

"اور ہاں روحان! عرضہ کو اس کی پسند کے ریڈ کلر کا ہی ڈریس دلوانا۔" انہوں نے پیار سے اس کے سر پر چپت لگائی۔

"ہنہ...... اس کو تو ریڈ اور براؤن کا فرق ہی نظر نہیں آتا۔"

اس نے تائی اماں سے نظر بچا کر آہستہ سے روحان کو چڑایا۔

اس کے کمنٹ پر روحان کے چہرے پر تاریک سا سایہ لہرایا۔ پھر جلد ہی وہ اپنے تاثرات کو نارمل کرتے ہوئے دوبارہ موبائل میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

دسمبر کی ٹھنڈی یخ ہوا چل رہی تھی۔ عرضہ کالی شال اوڑھے لان میں عین گیٹ کے سامنے تیز تیز چکر کاٹ رہی تھی۔ سورج کی کرنوں میں تمازت کی کمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ پودوں کے پتے بھی غالباً سردی سے ہولے ہولے لرز رہے تھے۔

دسمبر کو شاعروں اور ادیبوں نے اداسی کا مہینہ قرار دیا ہے نجانے کیوں...... وہ سوچ رہی تھی کہ اسے تو یہ پل، یہ سماں...... سورج کی یہ الوداعی کرنیں، سبھی کچھ کتنا بھلا سا لگ رہا تھا۔

"ارے...... عرضہ کیا کر رہی ہو......؟" مرحا نے درمیانی دروازے سے اندر جھانک کر اسے پکارا۔

"ایوننگ واک کر رہی ہوں۔" مارننگ میں تو اٹھنے کی وہ بہت چور تھی۔

"روحان سموسے لایا ہے۔ میں چائے بنا رہی ہوں۔"

"میرا حصہ رکھنا۔ میں ابھی آتی ہوں۔" اس نے بھی اونچی آواز سے کہا۔ مرحا غائب ہوئی تو وہ دوبارہ پلٹی۔ عین اسی وقت ادھ کھلے گیٹ سے کوریئر سروس والے کی بائیک رکی۔ اس سے پہلے کہ وہ بیل پر ہاتھ رکھتا۔ عرضہ نے دو چھلانگوں میں فاصلہ عبور کیا اور پیکٹ اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر دوبارہ اندر گھس گئی۔ کوریئر سروس والا اتنی کوئیک پرفارمنس پر دنگ رہ گیا۔

☆☆☆

ماہ و سال کی
وہی کہانی ہے
رفتارِ وقت میں
کتنی روانی ہے
یادِ محبت کے سوا
کچھ یاد نہیں
ریت دل کی
بڑی پرانی ہے
تیرے ساتھ کی چاہ
جتنی دیوانی ہے
اتنی ہی سہانی ہے

سرخ گلابوں کے بکے کے ساتھ ننھی وشنگ کارڈ پر لکھی نظم کتنی خوب صورت تھی۔ وہ کتنی دیر تک لفظوں کے سحر میں کھوئی رہی۔ چہرے پر موہوم سی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں خواب جگمگا رہے تھے۔

اس نے صحیح ہی لکھا تھا ایک دوجے کے ساتھ کی چاہ سہانی سہی مگر تھی بڑی دیوانی۔ وہ مرحا کے ساتھ اس کی یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں گئی تھی۔ اس نے ایک تقریری مقابلے میں حصہ لیا تھا۔

اس نے تیاری تو بہت دل لگا کر کی تھی مگر سامعین میں موجود ایک شرارتی ٹولے نے اتنی ہلڑ بازی مچائی کہ کنفیوز ہو کر تقریر والا پرچہ ہی نیچے گرا بیٹھی۔ تقریر کو رٹے تو بہتیرے مارے تھے مگر اس وقت وہ چند جملے نہ ڈھنگ سے ادا کر پائی۔

منچلوں نے خوب ہوٹنگ کی۔ وہ سرخ چہرہ لیے اسٹیج چھوڑ آئی۔ وہ تو فوراً گھر جانا چاہتی تھی مگر تقریری مقابلے کے بعد شعر و شاعری کی محفل بھی

digest.library.com

تھی۔ عرصہ نے اس کا دل بہل جانے کے خیال سے وہاں ٹھہر جانے کا ارادہ کیا۔

مرحا کا دل تو خیر کیا بہلنا تھا الٹا وہ اپنا ہی لٹا آئی۔ تیسرے نمبر پر نظم پڑھنے والے نوجوان شاعر احمر مرتضیٰ کی شخصیت، بول چال اور انداز نے اسے یوں گھائل کیا کہ وہ آناً فاناً اس کے عشق میں ڈوب گئی۔

حالانکہ نہ تو اسے شعر و شاعری کی کوئی سمجھ تھی اور نہ ہی دلچسپی وغیرہ۔ وہ تو ایک شعر تک بھی اس کے درست تلفظ سے ادا نہیں کر پاتی تھی۔ مگر کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ جس چیز سے آپ کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا وہ ہی اچانک اپنی جانب کھینچنے لگتی ہے۔ جس راہ پہ آپ کبھی نہیں چلتے وہی راہ سہانی دکھتی ہے۔ وہ بھی ایسی ہی ایک شاہراہ پہ قدم دھر چکی تھی۔

احمر مرتضیٰ مرحا کا سینئر تھا۔ مرحا چونکہ ڈیبیٹ وغیرہ میں حصہ لیتی تھی اور ایسے پروگرام کا آرگنائزر وہی ہوتا تھا۔ مرحا کے ساتھ وہی جاتی تھی پہلے پہل تو اس کی حوصلہ افزائی کے لیے اور بعد میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر، اس دن بھی مرحا تو جاتے ہی اپنی تقریر کے پوائنٹ یاد کرنے میں ہلکان ہو رہی تھی اور اسے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ اسٹیج پر تیاری میں مصروف احمر مرتضیٰ سے ہم کلام کس بہانے سے ہو۔

خیر وہ ہمت کر کے اسٹیج تک آئی۔ کچھ جھجکتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔ مرتضیٰ کے لیے تو یہ روز مرہ والی عام بات تھی۔ لڑکیاں کسی نہ کسی کام کی وجہ سے اس کے پاس آتی رہتی تھیں۔ مگر اب گم صم سی عرصہ الجھن میں تھی کہ اپنی بات کرنے کی کیا وجہ بیان کرے۔

"آپ شاید اپنا کچھ لکھا دکھانا چاہ رہی ہیں۔ اس وقت تو میں بہت بزی ہوں۔ آپ ایسا کریں۔"

وہ اسے گومگو کی کیفیت میں دیکھ کر یہی سمجھا۔

"نہیں...... وہ دراصل۔" وہ بڑبڑائی۔

"وہ اس دن آپ نے نظم پڑھی تھی تو بہت اچھی لگی تھی۔"

"ہیں...... نظم...... نظم تو نہیں میں نے تو اپنی دو غزلیں سنائی تھیں۔ اب آپ پتا نہیں کون سی والی کی بات کر رہی ہیں۔"

اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اسے تو نظم اور غزل میں فرق تک پتا نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے ہونٹ کاٹتی رہی۔

"شاید شعر آپ کے ذہن میں نہیں آ رہے۔" وہ یہی سمجھا۔

"آپ اپنی کتاب دے دیں۔ میں پڑھ لوں گی۔" اس کے دماغ نے کام کیا اور اس نے فوراً کتاب کی فرمائش کر دی۔

"محترمہ! غریب بندہ ہوں۔ ابھی تک تو کوئی کتاب وغیرہ نہیں چھپوا سکا۔ ہاں یہ میرے پاس ڈائری ہے۔ اس میں وہ غزلیں لکھی ہیں۔ امید ہے آپ نوٹ کر کے ذمہ داری سے واپس کر دیں گی۔"

اس نے ایک نیلی ڈائری اس کے حوالے کی۔

☆☆☆

چار دن تک وہ اس ڈائری کو سینے سے لگا کر گھومتی رہی۔ کھول کر تو اس نے دیکھی بھی نہیں محض اس کی مہک ہی اندر اتارتی رہی۔ جب واپس کرنے گئی تو وہ پوچھنے لگا۔

"پھر کیسی لگیں آپ کو میری غزلیں......؟"

"جی! بہت اچھی۔"

"اچھا!" وہ ذومعنی انداز میں مسکرایا۔

"اور میرا تخلص وغیرہ؟"

"ہیں...... وہ کیا بلا ہوتا ہے۔" وہ دل ہی دل میں سخت پشیمان ہوئی۔ یہ لفظ سنا سنا تو لگ رہا تھا مگر اب بالکل ذہن میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ شاید کبھی اردو کی ٹیچر نے پڑھایا تھا مگر اب کہاں یاد تھا۔

"جی مجھے نہیں پتا......" اس نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

"سحاب...... تخلص ہے میرا اور اس کا مطلب ہے بادل۔" وہ اس کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے وضاحت کر رہا تھا۔

"اور کیا نہیں پتا آپ کو......" اس کھوئی کھوئی سی لڑکی کو کریدنے میں اسے ایک الگ سا احساس ہو رہا تھا۔

"جی...... وہ...... دراصل مجھے شعر و شاعری کا بھی کچھ نہیں پتا۔" اب وہ مزید اداکاری نہیں کر سکتی تھی۔ ویسے بھی سامنے کھڑے شخص سے چھپنا ممکن نہیں تھا۔

وہ سچ بول کر ہلکی پھلکی ہو گئی جبکہ دوسری طرف اس کی معصومیت نے احمر مرتضیٰ کا دل لوٹ لیا۔ وہ کانچ سی لڑکی سیدھے دل میں گھستی چلی گئی۔

یہیں سے ان کی دوستی اور محبت کا آغاز ہوا۔

مشکل سے پون گھنٹے کی ملاقات میں وہ دونوں یوں تھے جیسے صدیوں سے ایک دوجے کو جانتے ہوں۔ جب وہ جانے لگی تو بے اختیار اس کی ڈائری مانگ بیٹھی۔

"یہ آپ مجھے ہی دے دیں۔"

"اچھا...... یہ لیں۔" احمر نے فراخ دلی سے ڈائری اس کے حوالے کی۔

"ویسے محترمہ...... میں آپ کو بتاؤں اس دن عجلت میں، میں نے آپ کو شعر و شاعری کے بجائے ہوسٹل میں کھانے پینے کے حساب والی ڈائری تھما دی تھی۔"

وہ شرارت سے مسکرا رہا تھا۔ اور وہ شرم سے بلش ہو رہی تھی۔

☆☆☆

پھر اس نے آناً فاناً مرحا کے کیمپس سے ایم فل کا پروگرام بنا لیا۔ رو دھو کر بی۔ ایس کرنے والی نے جب ردحان کو ایم فل کا فارم لانے کے لیے کہا تو وہ بھی ششدر رہ گیا۔

"کیا تم واقعی وہاں، ایم فل کرنے جا رہی ہو......؟" اس کا لہجہ مشکوک تھا۔

"نہیں میں وہاں وہی بڑوں کی ریڑھی لگا رہی ہوں۔" وہ جل کر بولی۔

"دراصل ایک تو میں مرحا کی تقریروں سے بہت متاثر ہوں جس میں وہ عورت کو تعلیم حاصل کرنے کی اہمیت اجاگر کرتی ہے۔ دوسرا مجھے کیمپس کی خوب صورتی نے بہت مسحور کیا ہے۔ کیا لمبی لمبی کیاریاں ہیں سرخ گلابوں سے لدی پھندی...... نہر کنارے اگا ہوا سبزہ...... لمبے لمبے کوریڈورز...... قابل اور ذہین اساتذہ...... میں تو جب جاتی ہوں نا تو میری روح وہیں رہ جاتی ہے۔ کاش بی ایس بھی وہیں سے کر لیتی......"

وہ خوامخواہ اتنی لمبی وضاحت پیش کر رہی تھی۔

جب انسان کے اندر چور ہوتا ہے نا تو وہ خود کو اور دوسروں کو مطمئن کرنے کے لیے ایسے ہی طویل وجوہات بیان کرتا ہے۔ ورنہ ایم فل کرنے سے گھر میں اسے کون روک رہا تھا۔

☆☆☆

"معزز سامعین!"

میری آج کی تقریر کا موضوع ہے۔ "ہمارے معاشرے کا مرد۔"

مرحا پھر تقریری مقابلے کی تیاری کر رہی تھی اور آج پریکٹس ٹی۔ وی لاؤنج میں ہو رہی تھی۔ منظر کچھ یوں تھا کہ سامنے صوفے پر تائی جی نیم دراز اونگھ رہی تھیں۔ فردا آپی نیچے کارپٹ پر بیٹھی نیٹ سے ساڑھیوں کی کولیکشن دیکھ رہی تھیں۔ ایک کونے میں عرضہ اپنا جیولری بکس کھولے نئی اور پرانی جیولری چھانٹ کر نکال رہی تھی۔ کوئی بھی متوجہ نہیں تھا۔

سامعین پلیز...... سنیں ذرا۔

ہاں تو میں آپ کو بتا رہی تھی کہ ہمارے معاشرے کا مرد اس شعر کی مثل ہے۔

وہ مرد ہے اسے جائز ہے قتل تک
میں تو محض عورت ہونے کی سزاوار ٹھہری

"تالیاں......" اب وہ خود ہی تالیاں پیٹ رہی تھی۔ عرضہ ہڑبڑا اٹھی۔

"ہمارے معاشرے کا مرد ظالم بھی، کٹھور بھی، بے رحم اور سنگدل...... اور کیا کیا کہوں۔"

"بی بی...... تم رہنے دو۔ کچھ بھی نہ کہو۔ اب ایسا

digest library.com

بھی نہیں ہے۔"

عرضہ جل کر بولی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے چھم سے احمر مرتضیٰ کا شاندار سے سراپا آ گیا۔ وہ نرم مزاج، خوش گفتار اور بہت کیئرنگ سا مرتضیٰ ابھی کل ہی تو وہ اسے ایک کیاری کے پاس لے گیا تھا۔

"عرضہ ڈیئر! دیکھو یہاں کتنے خوب صورت ریڈ کلر کے گلاب کھلے ہیں۔ تمہارا فیورٹ کلر ہے نا۔ چند روز پہلے میں نے مالی سے یہ پودے نرسری سے منگوائے تھے۔"

اور وہ بھی ان گلابوں کو دیکھ کر مبہوت رہ گئی۔ جو تیز سرخ رنگ کے تھے مگر ان کی پنکھڑیاں ہلکے گلابی رنگ کی تھیں۔ پھر وہ دونوں کافی دیر تک وہاں ان گلابوں کا ہی فوٹو شوٹ کرتے رہے۔ مگر یہ مرحا نجانے کیوں اول فول بک رہی تھی۔ اپنی تقریر میں سامعین کی عدم دلچسپی دیکھ کر مرحا نے کلس کر ڈائری بند کر دی۔

☆☆☆

فراز کی شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ مہمانوں کی لسٹ بن رہی تھی۔ فراز اور روحان کاغذ قلم تھامے ناموں کا اندراج کر رہے تھے۔

"مرحا! تم اپنے سبجیکٹ فیلوز کو نہیں انوائٹ کرو گی......؟"

عرضہ نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ اس کا کتنا دل تھا کہ وہ احمر مرتضیٰ کو بھی شادی میں شرکت کی دعوت دے۔

"نہیں بابا...... توبہ کرو۔ اپنا خاندان ہی اتنا لمبا چوڑا ہے۔ یہ تیسری بار لسٹ بن رہی ہے۔ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا کس کو بلائیں اور کس کو نہ بلائیں۔"

وہ دل مسوس کر رہ گئی۔

"تم چھوڑو لسٹ کو۔ کل درزی کے ہاں چلتے ہیں۔ اس کا فون آیا تھا کپڑے سل گئے ہیں۔"

"مگر کل تو میں نے یونیورسٹی جانا ہے۔"

"چھٹی کر لو نا۔ شادی کتنی قریب ہے۔ ڈھیروں کام نمٹانے ہیں۔"

"کل نہیں کر سکتی چھٹی...... کل تو ضروری ٹیسٹ ہے۔ پرسوں چلیں گے نا۔" اب مرحا کیسے جانتی کہ ٹیسٹ تو اس کا کوئی نہیں تھا ہاں البتہ مرتضیٰ کا مشاعرہ تھا۔ اور وہ اس نے ضرور اٹینڈ کرنا تھا۔ بھلے سے اسے شاعری کی کوئی شدھ بدھ نہیں تھی۔ وہ ہونق پن سے پوچھتی مرتضیٰ! یہ آزاد نظم تھی یا غزل۔ یہ ردیف، قافیہ کیا ہوتے ہیں۔" شاعری کے تمام استعارے اس کی سمجھ سے باہر تھے۔ مگر وہ اس کی شاعری پڑھتی ضرور تھی۔ ایک بار اس نے پوچھا۔

"مرتضیٰ! تم جو اپنی غزل میں کئی بار آہو چشم یا غزالی آنکھوں وغیرہ کا ذکر کرتے ہو تو یہ میرا مطلب ہے کہ کس ٹائپ کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ مجھے تو صرف سموکی آنکھوں کا پتا ہے۔ آج کل آئی میک اپ میں اتنی ورائٹی آ چکی ہے کہ آپ اپنی آنکھوں کو خواہ وہ کتنی ہی چنی منی سی کیوں نہ ہوں، ہر طرح کی لک دے سکتے ہیں۔"

اس کی معصومیت پر مرتضیٰ کئی پل محبت سے اسے تکتا رہا۔

یہ سندر سی لڑکی اسے چند دن میں ہی کتنی عزیز ہو چکی تھی۔

☆☆☆

دسمبر کی بھیگی بھیگی سی شام تھی۔ فضا میں خنکی بڑھ چکی تھی۔ 2025ء کا سال اب چند دنوں کا مہمان تھا۔ وہ اپنی جھولی میں کئی تلخ و شیریں یادیں لیے۔ مستقبل کے کچھ خوش آئند خواب دے کر اختتام پذیر ہو رہا تھا۔

سورج کا سنہری تھال ڈوب رہا تھا۔ روحان تھکے ماندے قدموں سے اندر داخل ہوا۔ ساری دن کی بھاگ دوڑ کے بعد جسم و جان تھکن سے چور تھے۔ دل بھی بوجھل بوجھل سا تھا۔ چچی کا میسج آیا تھا کہ وہ آتے ہوئے میڈیکل اسٹور سے چچا کی دوائیاں لیتے ہوئے آئے۔ وہ وہی دینے سیدھا ان کے پورشن میں آیا تھا۔

ٹی وی لاؤنج سنسان پڑا تھا۔ درمیانی کوریڈور

سے عرضہ کی گنگناتی آواز آ رہی تھی۔ ساری کلفت جاتی رہی۔ وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور پھر اس کے کمرے کی دہلیز پر اس کے قدم جم گئے۔

اپنے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے وہ شہزادی ایک خوب گھیر والی فراک پہنے گھوم گھوم کر خود کو دیکھ رہی تھی۔ لمبی، کالی، گھنی چوٹی بھی اس کے ساتھ محو رقص تھی۔ روحان کے لیے ساری کائنات ایک پل کے لیے اس جگہ تھم سی گئی۔ وہ سحر زدہ سا اس مغلیہ شہزادی کو تکتا رہا یہاں تک کہ ٹی۔وی لاؤنج میں دھرے سیل فون کی تیز گھنٹی نے اس کا ارتکاز توڑ دیا۔

"ارے! روحان تم کب آئے۔" عرضہ نے چونک کر دروازے میں بت بنے روحان کو دیکھ کر حیرت سے کہا۔

"دیکھو! میری یہ انارکلی فراک ٹیلر سے سل کر آ گئی ہے۔ اچھی ہے نا۔ یہ ریڈش میرون کلر جس کی میں دیوانی ہوں۔"

وہ اپنی جھونک میں بول رہی تھی۔ روحان کے چہرے کا رنگ بدلا اور وہ تیزی سے نکلتا چلا گیا۔

"ہیں۔۔۔ اسے کیا ہوا......؟"

اس نے سر جھٹکا اور پھر سے فراک کی فٹنگ چیک کرنے میں مگن ہو گئی۔

☆☆☆

آڈیٹوریم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ نئے اور پرانے شعراء کی کھیپ اپنا کلام پیش کرنے کے لیے موجود تھی۔ تمام چہرے اس کے لیے اجنبی تھے سوائے احمر مرتضیٰ کے جو انتظامات میں مصروف تھا۔ وہ سخت بیزار ہو رہی تھی۔

"مرتضیٰ! کتنی دیر لگے گی۔" وہ اس کے پاس آئی۔

"ابھی تو مشاعرہ شروع بھی نہیں ہوا۔ اوہو...... تم غالباً بور ہو رہی ہو۔ آؤ میں تمہیں کسی سے ملواتا ہوں۔"

پھر وہ اسے لیے ہوئے ایک سائیڈ روم میں آیا۔ یہاں چند نئے شاعر اپنا کلام ایک دوسرے کو سنا رہے تھے۔"

"عرضہ ڈیئر! ان سے ملو یہ ابھرتی ہوئی شاعرہ ہیں...... گل رباب......"

وہ سنہرے بالوں والی ایک دلکش سی لڑکی تھی۔ جس کے چہرے پر بڑا نرم سا تاثر پھیلا ہوا تھا۔

"عرضہ! انہوں نے ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی شاعری کے میدان میں قدم رکھا ہے اور تیزی سے مقبول ہو رہی ہیں۔ ان کا تخلص گل ہے۔ اب تو تم تخلص بھی جانتی ہو نا۔"

"ہاں......" اس نے بھی دوستانہ انداز میں اس لڑکی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے سمجھداری سے سر ہلایا۔

"تم یہ مکھن بازی بند کرو مرتضیٰ۔ میں کوئی تیزی سے مقبول نہیں ہو رہی۔" وہ بھی اپنائیت سے عرضہ کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"فی الحال تو میں ان سے اپنے ہر کلام کی اصلاح لے رہی ہوں۔"

عرضہ اس کی صاف گوئی سے بے حد متاثر ہوئی۔ مرتضیٰ تو ان دونوں کو ملوا کر خود باہر نکل گیا۔ اور وہ دونوں تھوڑی دیر کی گپ شپ میں ہی ایک دوسرے سے گھل مل گئیں۔

☆☆☆

آج فراز کا ولیمہ تھا۔ اس نے آف وائٹ میکسی زیب تن کر رکھی تھی جس پر سرخ رنگ کا کام ہوا تھا۔ تیز سرخ دوپٹہ تھا۔ جس پر گولڈن موتی ستاروں کی مانند جگمگا رہے تھے۔ اتنے میں مرحا بھی اندر داخل ہوئی۔ اس نے ہلکے کاسنی رنگ کا شرارہ سوٹ پہن رکھا تھا جس پر سلور کام تھا۔

"عرضہ! پلیز مجھے اپنی سلور سینڈل تو دے دو۔ یہ والے جوتے تو مجھے اس شرارے کے ساتھ بہت پینڈو لک دے رہے ہیں۔"

"او کے...... میں ڈھونڈتی ہوں۔" وہ الماری کے نیچے جوتیوں والا دروازہ کھولنے کے لیے جھکی۔ عین اسی لمحے روحان اندر داخل ہوا۔ وہ آج اس

مختلف سے کلر میں کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ نظریں وہیں ٹھہر سی گئیں۔

"روحان! تم گاڑی لے آئے ہو۔ کیا بھائی اور بھابھی ہمارے ساتھ جائیں گے۔" مرحا نے اسے دیکھ کر سوال کیا۔

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ دولہا دلہن اماں ابا کے ہمراہ ہال میں پہنچ بھی چکے ہیں۔ اور اب دلہن بھابھی اسٹیج پر اکیلی بیٹھی ہیں اماں اور چچی تم دونوں کو ڈھیروں صلواتیں سنا رہی ہیں۔"

"عرضہ! جلدی کرو پلیز۔" مرحا نے بوکھلا کر جلدی جلدی جوتے پہننا شروع کیے۔

☆☆☆

مرحا تو ہال میں آتے ہی اپنی بھابھی کے ساتھ اسٹیج پر چپک کر بیٹھ گئی۔ جبکہ اسے ہوٹل کی ڈیکوریشن نے اتنا متاثر کیا کہ وہ اپنا موبائل تھامے فوٹو شوٹ کرنے لگی۔ ننھی ننھی آرائشی لڑیاں سفید دودھیا درو دیوار پر نگینوں کی مانند دمک رہی تھیں۔ خاص طور پر انٹرنس کو بہت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔

وہ باہر نکلی۔ ٹھنڈی یخ ہوا کے جھونکوں نے جسم میں کپکپی کی لہر سی دوڑا دی۔ یہ سردی بھی کتنے مزے کی ہوتی ہے۔ اس کا بھی ایک اپنا ہی لطف ہے۔ پچاس کا ہندسہ چھو لیتے درجہ حرارت کو جھیل چکے لوگوں کو تو یہ ایک سوغات کی مانند لگتی ہے۔ وہ چاردیواری پر نصب ننھے ننھے الیکٹرک دیوں کو مسحور سی دیکھ رہی تھی۔ مہمان ابھی بھی آرہے تھے۔

اچانک نظر سامنے اٹھی اور پھر پلٹنا بھول گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ سے بلیک ٹو پیس میں ملبوس مرتضیٰ باہر نکلا۔ اس کے ہمراہ ایک سوبر سے انکل بھی تھے۔

اس نے جلدی سے ایک ستون کی اوٹ میں ہو کر اس کا نمبر ملایا۔

"ہیلو ڈیر عرضہ! میں اپنے چچا کے ہمراہ ان کے دوست یاسر گردیزی صاحب کے بیٹے کے ولیمے میں آیا ہوں۔ گھر جا کر تمہیں فون کرتا ہوں۔"

"رکو مرتضیٰ! وہ یاسر گردیزی میرے تایا ابو ہیں۔" جوش سے دبی اس کی آواز پر مرتضیٰ نے جھٹ ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھا اور پھر انٹرنس پر اسے دیکھ کر بے اختیار ایک خوب صورت مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

شادی کے بعد وہ اتنا تھک گئی کہ کئی دن یونی ہی نہ جا سکی۔ سارا سارا دن وہ اور مرحا شادی کی تصویریں دیکھتیں گروپ میں شیئر کرتیں اور پھر کمنٹ پر تبصرہ کرتیں۔ اس دوران مرتضیٰ کا ایک بڑا مشاعرہ بھی ہوا۔ اس نے اس میں شرکت سے بھی معذرت کرلی۔

ایک دن ابھی وہ بستر پر رہی تھی جب اس کی ایک دوست نے اسے مشاعرے کی وڈیو سینڈ کی۔ مرتضیٰ کے ساتھ ساتھ گل رباب بھی نمایاں تھی۔

مرتضیٰ نے بالکل صحیح کہا تھا وہ واقعی ایک شاعرہ کی حیثیت سے نوجوانوں میں بہت مقبول ہو رہی تھی کیونکہ اسے اپنے ہر شعر پر سامعین کی جانب سے بہت تعریف اور ستائش مل رہی تھی۔

عرضہ نے نوٹ کیا تھا کہ گل رباب کی شاعری سے زیادہ اس کا شعر کہنے کا انداز دلکش تھا۔ آواز بھی مترنم سی تھی۔ الفاظ کی ادائیگی سے سماں باندھ دیتی تھی۔ اس نے ان دونوں کے ان بکس میں لائک کے ڈھیروں میسج بھیج دیے۔

☆☆☆

"تمہارے خط میں وہ اک نیا سلام کس کا تھا۔"

وہ گنگناتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ مرحا کارپٹ پر بیٹھی مونگ پھلیاں کھا رہی تھی۔ روحان لیپ ٹاپ لیے بیٹھا تھا۔

"وہ نیا سلام نیٹ والے کا ہے۔ اس نے وارننگ دی ہے کہ اگر دس تاریخ تک فیس جمع نہ کروائی تو نیٹ کاٹ دے گا۔ اور ابا اس بار بالکل فیس نہیں دے رہے۔ ہم سب کو اپنی پاکٹ منی سے ادا کرنی ہوگی۔"

روحان نے کچھ اس طرح وضاحت کی تو اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ویسے بھی آج کل اس کا موڈ بہت خوش گوار رہنے لگا تھا۔ خوامخواہ ہنسی ہونٹوں سے پھوٹتی

digest library.com

رہتی تھی۔

"یہ دولہا اور دلہن کہاں ہیں۔" اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

"وہ تو رات کو ہی ہنی مون کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ ملنے گئے تو تھے تمہاری طرف...... تم تو اس وقت گھوڑے گدھے بیچ کر سو چکی تھیں۔"

مرحا نے مونگ پھلیوں کا شاپر اس کی جانب بڑھایا۔

☆☆☆

آج وہ بہت عرصہ بعد یونی آئی تھی۔ اب پڑھائی سے مزید لاپروائی وہ افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ پہلے ہی شادی کی وجہ سے بہت سے دن ضائع ہو چکے تھے۔

آتے ہوئے اس نے مرتضیٰ کو میسج کر دیا تھا مگر ابھی تک اس کا ریپلائی نہیں آیا تھا۔ اس دن وہ یونی ہی نہیں آیا۔ مزید چار روز گزر گئے۔ پانچویں روز اس کی جھلک نظر آئی تو وہ بے تابی سے آگے بڑھی۔ وہ بہت عجلت میں تھا۔

"عرضہ! میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔ دراصل مجھے آج ہی اسلام آباد کے لیے نکلنا ہے۔"

"وہ کیوں......؟ خیریت۔"

"وہ دراصل دوبئی میں ایک بڑا مشاعرہ ہو رہا ہے۔ پاکستانی کمیونٹی کروا رہی ہے۔"

"تم دوبئی جا رہے ہو...... مجھے بتایا بھی نہیں۔"

"ابھی کچھ کنفرم تو نہیں ہے۔ دعا کرو سب ٹھیک ہو جائے۔"

وہ تیزی سے نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

اور پھر وہ دوبئی چلا بھی گیا۔ اس نے نیٹ پر مشاعرے کی وڈیو بھی دیکھ لی۔ گل رباب بھی شامل تھی۔ اس نے تو اس کے بھی جانے کا بتایا ہی نہیں تھا۔ شاید افراتفری میں بھول گیا تھا۔ وہ بدگمان نہیں تھی بس کیمپس میں ہونے والی چہ مگوئیاں سن سن کر اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ اکثریت کا خیال تھا کہ گل رباب

سرے سے شاعرہ تھی ہی نہیں اور نہ ہی وہ مرتضیٰ سے کوئی اصلاح وغیرہ لیتی تھی بلکہ اس کا سارا کلام ہی مرتضیٰ کا ہوتا تھا جسے وہ اپنا بنا کر پیش کرتی تھی۔

اس نے خود بھی محسوس کیا تھا کہ گل رباب کے اشعار میں مرتضیٰ کی شاعری کا عکس جھلکتا تھا۔ وہی انداز اور وہی استعارے مگر دل اب بھی دماغ کی نفی کرنے پر تلا تھا۔

اس دن مرحا کو تقریری مقابلے کی تیاری کے لیے کچھ بکس چاہیے تھیں۔ وہ اس کے ہمراہ بک اسٹال تک گئی۔ مرحا وہیں بیٹھ کر نوٹس بنانے لگی جبکہ وہ ادھر اُدھر جھانک رہی تھی۔ اچانک ایک کتاب کی بیک سائیڈ پر اسے مرتضیٰ کی تصویر نظر آئی۔ اس نے جھٹ وہ نکالی اور دیکھ کر حیران رہ گئی وہ تو مرتضیٰ کی اپنی کتاب تھی۔

"ہیں مرتضیٰ کی کتاب چھپ بھی گئی۔ اس نے تو مجھ سے تذکرہ تک نہیں کیا۔" اس نے خود سے ذرا بلند آواز میں کہا۔

"بی بی! ان کی تو دوسری کتاب بھی مارکیٹ میں آنے والی ہے۔" بک شاپ کا مالک اس کی بات سن کر کہنے لگا تو وہ ساکت رہ گئی۔

"ابھی چند روز تک وہ ایک بھی بک پبلش کروانا افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ اب اکٹھی دو کروالیں۔" وہ اسی 'ادھیڑ بُن' میں واپس آئی۔

☆☆☆

اس دن اس کی صرف ایک ہی کلاس تھی۔ وہ اٹینڈ کر کے لیکچر روم سے باہر آئی تو مرتضیٰ اسے لائبریری کی جانب جاتا نظر آیا۔ نکھرا ستھرا کریم شرٹ اور براؤن پینٹ میں ملبوس اس کا شاندار سراپا دور سے ہی نمایاں دکھ رہا تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے ہی چلی آئی۔ آج چونکہ ایک آدھ ہی کلاس تھی اس وجہ سے لائبریری میں اسٹوڈنٹ بھی خال خال ہی تھے۔

مرتضیٰ نے ونڈو سائیڈ والی چیئر سنبھالی تو وہ بھی ہولے ہولے چلتی ہوئی عین اس کے سامنے آ بیٹھی۔

"ہیلو عرضہ!" وہ چونکا۔ "میں بس تم سے ہی

ملنے کا سوچ رہا تھا۔"
"صرف سوچ رہے تھے۔"
"وہ دراصل مشاعروں کی وجہ سے پڑھائی بہت ڈسٹرب ہوئی ہے تو میں نے سوچا کہ پہلے نوٹس......"
"مرتضیٰ تمہاری کتابیں چھپ گئیں اور تم نے مجھے اپنی خوشی میں شامل بھی نہیں کیا......" وہ زیادہ دیر تک گلہ دل میں دبا نہ سکی۔
"یہ تو ممکن ہی نہیں تھا عرضہ...... وہ تو گل رباب اور اس کے بابا کی مہربانی ہے۔ وہ لوگ بہت قدر کرتے ہیں شعراء کرام کی۔ گل کے بابا خود بھی ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے سپورٹ کیا ورنہ میں کہاں سوچ سکتا تھا۔"
"اور یہ دوبئی کا وزٹ بھی انہی کی مہربانی ہو گا۔" وہ اسے گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
اب کے وہ خاموش رہا۔ یہ کترایا سا انداز احمر مرتضیٰ کا تو کبھی نہ تھا۔

☆☆☆

احمر مرتضیٰ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو محبت ضرور کرتے ہیں مگر ان کی محبت اندھی، بہری نہیں ہوتی۔ وہ دل کے ساتھ دماغ کی بھی سنتے ہیں اور مانتے بھی دماغ کی ہیں۔
عرضہ کی معصومیت اور خوب صورتی سے وہ گھائل ضرور ہوا تھا۔ اور اس کی محبت میں کوئی کھوٹ بھی نہیں تھا مگر اس کے کچھ خواب بھی تھے۔
اور یہ خواب عرضہ کی محبت سے زیادہ پرانے اور اسے شاید زیادہ عزیز تھے۔ گل رباب کی صورت اسے وہ سیڑھی نظر آئی تھی جس پر چڑھ کر وہ خوابوں کے چاند تارے توڑ سکتا تھا۔ دوسری طرف گل رباب نے بھی ایک طرح کی سودے بازی کی تھی۔ احمر مرتضیٰ نے کتنے کم وقت میں اسے کتنا لمبا شعری سفر طے کروایا تھا۔ وہ دھڑلے سے اس کے کلام کو بھی اپنے نام سے پیش کرتی رہی تھی۔
احمر مرتضیٰ اور عرضہ کی کہانی بہت عام سی تھی۔ اور یہیں پر ختم ہو رہی تھی۔ اس میں کوئی نیا پن نہیں تھا۔ وہ ہی ہیرو کا کس غرض سے ساتھ چھوڑ دینا اور ہیروئن کا تنہا رہ جانا مگر آگے کی کہانی اتنی عام نہیں تھی وہ بہت مختلف تھی۔ تو چلیں آگے کی کہانی تک چلتے ہیں۔

☆☆☆

فضا پر دھند اور سردی کا راج تھا۔ ہر شے دھوئیں کی سفید چادر میں لپٹی مبہم سی نظر آ رہی تھی۔ اس دھندلے دھندلے غیر واضح منظر کی اوٹ سے ہی 2026ء کے نئے نویلے سورج نے اپنا مکھڑا نکالنا شروع کیا۔
اس کی نرم، گرم کرنیں حرارت میں کمزور ضرور تھیں مگر چڑھتے دن کے ساتھ طاقت پکڑتی جا رہی تھیں اور تقریباً نو بجے کے بعد سے سورج اپنی پوری توانائی خرچ کر کے دھند کو بہت حد تک بھگا چکا تھا۔ اب درخت، پودے اور سڑکوں پر چلتے پھرتے انسان بھی منظر سے یوں واضح ہونے لگے تھے۔ جیسے کسی نے دن کے چہرے سے مہین سفید نقاب اتار دیا ہو۔ وہ ایک لمبے ٹریک سے تیز تیز چہل قدمی کرتی آ رہی تھی۔
گہرے نیلے رنگ کا ٹریک سوٹ پہنے جس کی ہڈ کو اس نے سر سے اتار کر اب خالی اسٹالر سے اسے لپیٹ رکھا تھا۔ ناک کی نوک سرخ تھی اور چہرا برف سا ہو رہا تھا۔ صبح اماں نے منع بھی کیا تھا۔
"اب چند روز کے لیے یہ واک چھوڑ دو۔ ٹھنڈ لگ جائے گی۔"
"نہیں اماں جانی! اس واک سے ہی تو میں سارا دن فریش رہتی ہوں۔"
مرتضیٰ سے بریک اپ کے بعد وہ اتنی آسانی سے دوبارہ زندگی کی طرف نہیں لوٹی تھی۔ اس نے بہت درد سہا تھا۔ اسے لگا تھا کہ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ کبھی ہنس بول نہیں سکے گی۔ کبھی کسی کا اعتبار نہیں کرے گی۔ مگر ایسا صرف چند ماہ کے لیے ہوا۔ جب انسان مایوس ہوتا ہے نا تو رب اس کے اندر سے

ہی امید کا ایک دیا جلاتا ہے۔ ضرورت صرف اس کو پکارنے کی ہوتی ہے۔ اس 2025ء کی آخری رات وہ سارا وقت روتی رہی۔ اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔

صبح کے وقت اس نے اذان کی آواز سنی۔ ایک انوکھا سا احساس ہوا۔ پہلی اذان کی آواز۔ اس سے پہلے تو اماں نماز پڑھ کر اسے جھنجھوڑ کر اٹھاتی تھیں۔ اس صبح وہ خود اٹھی۔ وضو کیا، نماز ادا کی۔ روح تک سکون اتر گیا۔

اس نے دیکھا کہ اللہ نے اسے کتنی نعمتیں عطا کر رکھی ہیں۔ وہ اپنے تمام اعضا سمیت تندرست اور توانا ہے۔ خوب صورت ہے۔ باشعور بھی ہے۔ زندگی میں تمام قیمتی رشتے بھی موجود ہیں تو پھر محض ایک محبت، ایک خود غرض انسان کی محبت کے پیچھے وہ ان سب کو کیوں گنوائے۔ وہ اپنا اور ان کا نقصان کیوں کرے۔

اس دن کے بعد سے اس کی زندگی بدل گئی۔

اس نے روٹین کی طرف آنا شروع کیا۔ اللہ کا شکر ادا کرتی تھی کہ اس نے بھی اس کا پردہ رکھا تھا۔ فراز بھائی کی شادی میں ہی ان کی چچی ساس کو مرحا اتنا بھائی کہ جھٹ اس کا رشتہ مانگ لیا۔ لڑکا یو کے میں سیٹلڈ تھا۔ یوں وہ بیاہ کر وہاں چلی گئی۔

روحان بھی مزید پڑھائی کے لیے مانچسٹر چلا گیا۔ اور اس کی ذہنی ابتری کو سب نے اداسی اور تنہائی سے محمول کیا۔

☆☆☆

مرحا پریگننٹ تھی۔ وہ خود بھی بوکھلائی ہوئی تھی اور اپنے میاں کو بھی ہولائے جا رہی تھی۔ اس غریب نے گھبرا کر اسے پاکستان بھیج دیا۔ خوب گول مٹول سی مرحا کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ وہ کافی دیر تک اس سے لپٹی رہی۔

آج کل مرحا کا کچھ کھٹا میٹھا سا کھانے کو بہت دل کرتا تھا۔ عرضہ نے اس کے لیے کڑھی چاول بنائے تھے۔ وہی دینے گئی تو بیڈ روم سے مرحا اور تائی کی باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ اپنا نام سن کر وہ ٹھٹک گئی۔

"اماں! آخر آپ روحان اور عرضہ کا کیوں نہیں سوچ رہیں؟"

"میں ضرور سوچتی اگر دونوں بچوں کا ایک دوسرے کی طرف رجحان دیکھتی تو۔ پھر میرا خیال ہے کہ تمہاری چچی عرضہ کے لیے اپنے بھانجے کا سوچ بیٹھی ہے۔"

"اماں! چچی جو بھی سوچے بیٹھی ہیں وہ غلط ہے۔ روحان تو عرضہ کو بہت پسند کرتا ہے۔ بہت پہلے سے۔"

"ہیں......" وہ چونکیں۔

"اس نے تم سے کب کہا......"

"کہا تو نہیں مگر اماں مجھے بارہا محسوس ضرور ہوا ہے۔ وہ اتنا گہرا ہے کہ کچھ ظاہر نہیں کرتا۔"

"وہ گہرا نہیں گھنا میسنا کہو...... اگر ایسی بات تھی تو جاتے جاتے مجھ سے اپنے منہ سے کچھ پھوٹ جاتا۔ گھر کی بچی ہے ہمیں اور کیا چاہیے۔"

"اب آ تو رہا ہے اگلے مہینے۔ دو بدو بات کر لیجیے گا۔"

عرضہ مزید نہ سن سکی۔ اس نے برتن کچن میں رکھے اور وہیں سے لوٹ آئی۔ دل کی عجیب حالت تھی۔ یہ انکشاف نیا تھا۔

جب وہ کسی اور کی محبت میں غرق تھی تو کوئی اور بھی عین اسی وقت اسی آگ میں تپ رہا تھا۔ عجیب کھیل ہیں ... ہے۔ پوری خوشی شاید کسی کے نصیب میں نہیں۔

☆☆☆

زندگی آگے بڑھ چکی تھی اور ابھی کتنا سفر باقی تھا۔ اسے بھی کسی کا ساتھ، کسی کی ہمراہی چاہیے تھی۔ اماں اپنے بھانجے کے لیے دباؤ ڈال رہی تھیں مگر وہ انہی رشتوں کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔

اس کی روح یہاں ہی سکون پاتی تھی۔ پھر جب کوئی اتنی پرخلوص محبت اپنے دل میں دبائے اس کا منتظر تھا تو وہ کیوں ٹھکراتی۔ اس لیے جب روحان

آیا تو وہ پوری طرح سے اپنی ذہن سازی کر چکی تھی۔
روحان کو آئے ہفتہ بھر ہو چکا تھا مگر ان دنوں وہ پی ایچ ڈی کے لیے اپنا ریسرچ ورک تیار کر رہی تھی اس لیے تائی جی کے پورشن میں بہت کم جانا ہوتا تھا۔ یا شاید وہ لاشعوری طور پر روحان کے لیے خود کو کچھ مزید وقت دینا چاہ رہی تھی۔
پھر اس دن کے انکشاف کے بعد روحان کے حوالے سے اس کے جذبات و احساسات بھی بدل چکے تھے۔ اب اسے اس سے عجیب سی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ مگر اسے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ عجیب سی جھجک ایک الگ سا لطف دے رہی تھی۔ یہ خیال کہ کوئی اسے کتنا چاہتا ہے بہت خوش کن تھا۔ اپنی طرف سے تو وہ اس سے کترا رہی تھی مگر ایک ہی گھر کے دو پورشنز میں رہتے ہوئے یہ کہاں ممکن تھا۔

☆☆☆

جنوری 2026ء کی نرم گرم سی سہ پہر تھی۔ دھوپ وسیع و عریض لان سے گزر کر اب سامنے والی دیوار پر چڑھ چکی تھی مگر اس کی تمازت ابھی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ آج بہت دن بعد کیاریوں کے پاس آ کر بیٹھی تھی۔ سامنے والی رو میں سرخ گلابوں کا پودا پھولوں سے بھرا تھا۔ اس نے کتنے پیار سے وہ پودا اگایا تھا۔ دیکھ بھال بھی بہت کی تھی۔
پھر حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ وہ اس طرف آ نکل ہی نہ سکی۔ آج بہت دن بعد آ کر بیٹھی تھی تو پھولوں پر نظر پڑی تھی۔ وہ منظر نگاہوں کو بھلا تو لگ رہا تھا مگر وہ پہلے والا دیوانہ پن اور جنون مفقود تھا۔ وقت کے ساتھ پسندیدگی کے درجے بھی بدل جاتے ہیں۔
پھر اسے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی اس نے پلٹ کر دیکھا۔
''تمہیں آج بھی ان گلابوں سے عشق ہے۔''
گرے شلوار سوٹ میں ہاتھ باندھے روحان کھڑا تھا۔ پتا نہیں اسے کیوں اس کی آواز میں نمی سی محسوس ہوئی۔

''ارے تم کب آئے......؟ آؤ بیٹھو......'' اس نے سائیڈ پر پڑی ایک کرسی کھینچی۔
وہ آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا عین اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا وہ پہلے سے زیادہ شاندار دکھ رہا تھا۔ بہت سنجیدہ اور گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا۔ ایک عجیب سا اسرار اس کی پوری شخصیت پر چھایا تھا۔ وہ خود بھی تو پہلے جتنی شوخ و شنگ نہیں رہی تھی۔
''کیا سوچ رہی ہو...... عرضہ؟''
اس نے دھیرے سے پکارا۔ وہ اسی کو تو سوچ رہی تھی۔ اس سوال پر شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔
کچھ دیر تک دونوں کے درمیان خاموشی کی دبیز چادر تنی رہی۔ اور ایسا اس وقت ہوتا ہے جب کہنے کو بہت کچھ ہو مگر کوئی کچھ نہ کہہ سکے۔
''عرضہ!'' اسے پھر اس کی سرگوشی سنائی دی۔
''اس بار میں آیا ہوں تو مرحا نے تمہارے حوالے سے مجھے کچھ کہا ہے۔'' وہ بلش سی سر جھکائے رہی۔
''مگر تم شاید بے خبر ہو کہ میں......''
وہ کہتے کہتے رک سا گیا۔ اس نے تیزی سے سر ہٹایا۔ اس کی آنکھوں کے رنگوں نے روحان کو سب بتا دیا کہ وہ بے خبر نہیں۔
اس نے گہری سانس بھری۔ کچھ دیر تک ہمت مجتمع کرتا رہا۔
''مگر عرضہ اب یہ سب ممکن نہیں ہے۔''
اس کے ایک غیر متوقع جملے نے اسے آسمان سے پاتال میں جا گرایا۔ کیا وہ ایک بار پھر ٹھکرائی جا رہی تھی۔ آخر یہ ریجیکشن اس کا مقدر ہی کیوں ٹھہری۔
اس نے بامشکل آنسوؤں کو آنکھوں کے سمندر میں اترنے نہیں دیا۔ اس جملے کا زہر اندر اتار گیا مگر لبوں پر ضبط نہ رکھ سکی۔
''کیوں......؟'' سرسراتا ہوا ایک لفظ منہ سے نکل ہی پڑا۔
''عرضہ! میں نے بہت سوچا اور یہی سمجھ پایا کہ

ہم دو مختلف دنیا کے باسی ہیں۔ ہم ایک ساتھ خوش نہیں رہ سکتے۔ تم رنگوں کی دیوانی میری کمی کے ساتھ شاید گزارا نہ کر پاؤ۔"

"کمی......؟ کون سی کمی......؟"

اس نے سوٹڈ بوٹڈ، لمبے چوڑے، صحت مند روحان کو شکی نظروں سے دیکھا۔

"ہرگز نہیں......! میری زندگی میں کوئی نہیں ہے عرضہ! نہ پہلے نہ اب۔" اس نے شاید اس کی سوچ پڑھ لی تھی۔

"وہ عرضہ...... دراصل۔" وہ چند لمحے ٹھہرا عرضہ گم صم سی اس کی صورت تکنے لگی۔

"وہ دراصل میں کلر بلائنڈ ہوں۔"

"کیا بلائنڈ......" عرضہ کے بت میں جان پڑی۔ وہ ایک چیخ مار کر کرسی سے اٹھی اور ہاتھوں سے اس کی گہری براؤن آنکھوں کو ٹٹولنے لگی۔

"ہائے اللہ روحان......! کیا تمہیں نظر نہیں آتا۔" وہ پاگلوں کی طرح اب اس کا چہرہ ٹٹول رہی تھی۔

"عرضہ......پلیز......؟"

اس نے اس کے ہاتھوں کو پکڑ کر اسے تھوڑا سا پیچھے ہٹایا اور نرمی سے دوبارہ چیئر پر بٹھا دیا۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔

"بیوقوف لڑکی......میں نے کلر بلائنڈ کہا ہے۔"

"کلر بلائنڈ......"

"ہاں کلر بلائنڈ...... مجھے خود بھی نہیں پتا تھا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ مجھے ایئرفورس میں جانے کا کتنا شوق تھا اور میں نے ٹیسٹ دیا تھا۔ ریٹن تو کلیئر ہوگیا تھا مگر فزیکل میں اس کمی کی وجہ سے فیل ہوگیا تھا۔ اور مجھے اپنی اس بیماری کا علم بھی اسی وقت ہوا تھا۔

کلر بلائنڈنس ایک ایسی بیماری ہے جو آنکھوں کے سیلز میں خرابی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ کلر بلائنڈ افراد کو چیزیں یا تو بالکل بے رنگ نظر آتی ہیں یا پھر وہ رنگوں میں تمیز نہیں کرپاتے۔ یہ عام طور پر مردوں میں ہوتی ہے۔ تقریباً ہزار افراد میں صرف ایک فرد ہی اس نقص کا شکار ہوتا ہے۔ اور بدقسمتی سے میں بھی ہزار میں وہی شخص ہوں۔"

اس نے یاسیت سے سر جھکالیا۔

عرضہ نے ایک گہری سانس لی۔

"توبہ ہے روحان! تم نے ڈرا ہی دیا تھا۔ میں سمجھی کہ پتا نہیں کتنی بڑی بات ہے۔ یہ تو ایک ثانوی سا مسئلہ ہے۔"

"تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"نہیں!" اس کا لہجہ ٹھوس تھا۔

"مگر عرضہ! میں تمہارے فیورٹ کلر کو صحیح سے دیکھ ہی نہیں پاتا۔ تم اس کے ہر شیڈ کی دیوانی ہو مگر میں اسے اس کے کسی بھی شیڈ میں دیکھ نہیں پاتا۔"

"روحان! میں اب رنگوں کی اتنی پگلی اور دیوانی نہیں رہی۔ زندگی اس سے بہت آگے کی چیز ہے۔ اصل خوب صورتی تو انسان کے اندر چھپے رنگوں کی ہوتی ہے۔ وہ رنگ خلوص، محبت اور وفا کے ہوتے ہیں ان رنگوں کے آگے دنیا کا ہر رنگ ہیچ ہے روحان!"

اس کی کالی گھور آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں جن میں ایک بے وفا کا عکس ڈوبنے ابھرنے لگا۔ اس نے جلدی سے آنکھیں میچ لیں مبادا روحان دل کا درد پا جائے کیونکہ اس نے بڑی محنت سے دل کی سرزمین کو اس کی محبت کا پودا اگانے کے لیے ہموار کیا تھا۔

روحان کو اس سے اس بدلی بدلی عرضہ پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

"سچ عرضہ۔" اس نے فرط جذبات سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"ہاں۔" وہ بھیگی پلکیں لیے مسکرا دی۔ وہ بھی مسکرا دیا اور ان دونوں کے سنگ جنوری 2026ء کی سنہری شام بھی ڈھلتے ڈھلتے مسکانے لگی۔

☆☆

عائشہ شبیر

کالا

”ویسے خالہ اچھی لگامیں کسی ہیں آپ نے اپنی اس بہو کی۔ شروع میں تو اس نے اپنے حسن سے اکبر کو دیوانہ بنالیا تھا۔“

فرخندہ بیگم نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔

”ویسے خالہ آپ سے تو سارے خاندان کی ساسوں کو ٹیوشن لینی چاہیے۔“

شبانہ نے ہنستے ہوئے فرخندہ بیگم کے بازو پر ہاتھ مارتے کہا۔

”اے شبانہ! میں بے چاری کیا ٹیوشن دوں گی، میں تو خود تمہاری اماں کی شاگرد ہوں۔“

فرخندہ بیگم بھی آخر اس کی خالہ تھیں ہنستے ہوئے بولیں۔

”ویسے تو بتا تیرا کوئی رشتہ وغیرہ آیا کہ نہیں؟“

”کہاں خالہ! جب اپنے ہی خاندان والے ”کمینے“ ہوں تو رشتے کہاں ہوتے ہے۔“

تین لڑکے تھے شمشاد خالہ کے، چار پھوپھی کے اور دو آپ کے بھی تو تھے۔“

اس کے لہجے میں گلہ تھا۔ ”پر سب کو باہر کی ناک چھاننا تھی۔“

”ہاں بھئی آج کل تو اچھی اچھی صورتوں والی گھروں میں بیٹھی ہیں خیر تم دل چھوٹا نہ کرو اللہ کرے تمھیں بھی کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔“ فرخندہ بیگم نے حساب برابر کیا۔

شبانہ نے سرخ پراندہ پیچھے پھینکا، پاؤں میں چپل اڑسی اور باورچی خانے میں چلی آئی۔ جہاں ثرین جلدی جلدی سبزی کاٹ رہی تھی۔

”ارے بھابھی! لائیں میں کام کروادوں۔ ویسے اس طرح کے کام آپ خالہ سے کروالیا کریں، سارا دن تخت پر بیٹھی پان چباتی رہتی ہیں۔“ اس نے چھری سے شملہ مرچ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹتے ہوئے کہا۔ ”خیر یہ بھی ٹھیک ہے سو باتیں سننے سے بہتر انسان خود ہی کام کرلے۔“

اس نے خود ہی اپنی بات کا جواب دے دیا۔

”اصل میں شادی کے بعد جو ایک سال ہوتا ہے نا ہماری اماں کہتی ہیں یہ بڑا ہی اہم وقت ہوتا ہے۔ بالکل جوئے جیسا۔ اگر تو بیوی اس وقت شوہر کو اپنا بنالے تو ساری زندگی راج کرتی ہے اور اگر سسرال والے بیوی کے خلاف کرلیں تو پھر عورت بے چاری ساری زندگی پستی ہی رہتی ہے۔ آپ خود کو، ہی دیکھ

digest library.com

digest.library.com

لیں صبح سے شام تک کام کرتی ہیں اور رات میں اکبر بھائی کیسی کیسی باتیں سناتے ہیں آپ کو توبہ توبہ۔"

اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ثمرین جلدی سے پیاز کاٹنے لگی تا کہ آنکھوں میں آئے پانی کی وجہ بن سکے پر زبان سے کچھ نہ بولی۔

"خیر اب آپ جتنا مرضی بن سنور لیں، خدمتیں کرلیں ان کو تو خالہ نے پکا سبق پڑھا دیا جو ساری زندگی نہ بھولے گا آپ کی کوئی خوبی نہیں نظر آنے والی ان کو۔ آپ بھی کچھ بولیں نا! میں ہی بولتی جا رہی ہوں۔"

اسے مسلسل چپ دیکھ کر شبانہ بولی۔

"میں کیا بولوں تم نے خود ہی تو کہہ دیا کہ اب کچھ نہیں ہونے والا بس جو میرا مقدر۔"

"ہاں میں آپ کا دکھ سمجھ سکتی ہوں آخر کو خالہ ہیں میری، بڑی اچھی طرح جانتی ہوں۔" فرخندہ بیگم جو بار بار گردن اٹھا کر کچن میں جھانکنے کی کوشش کر رہی تھیں صبر نہ ہوا تو خود ہی باورچی خانے میں چلی آئیں۔

"اے شبانہ! تو اب گھر جا تیری اماں کو کوئی کام نہ ہو۔"

"خالہ! اماں کے پاس تین تین نوکرانیاں ہیں میرا مطلب بہوویں ہیں تو میں کیا کروں گی ویسے بھی مجھے اکبر سے کام ہے، رات کو واپس جاؤں گی۔"

اس نے پاؤں پسارے۔

جواباً فرخندہ بیگم برے برے منہ بناتی دوبارہ اپنے تخت پر براجمان ہوگئیں۔

اور پھر اس نے ثمرین کے ساتھ روٹیاں بھی بنوا دیں۔ بچوں کو اسکول سے بھی لے آئی۔ شام میں بڑے سے صحن کو بھی پائپ لگا کر دھو دیا۔

ثمرین کو کچھ آرام ملا تو اس نے کپڑے لیے اور غسل خانے کی طرف چل دی۔ یوں بھی اکبر آنے والا تھا اس نے نہا کر گلابی جوڑا پہنا بال کنگھی کیے اور ساتھ ہی ہونٹوں پر ہلکی گلابی رنگ کی لپ اسٹک لگا کر جب وہ باہر آئی تو شبانہ سبز جوڑے کے ساتھ سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگا کر دوبارہ سے بالوں میں پراندہ لگا رہی تھی۔ وہ برآمدے میں آئی تو اماں نے اسے بلا لیا۔

"دیکھ رہی ہے کیسے سج رہی ہے اکبر کے آنے کا وقت جو ہوا ہے۔"

جب ہی وہ پراندہ جھلاتی سرخ چوڑیاں چھنکاتی وہیں پر آگئی۔

"کیا برائیاں کر رہی ہو میری خالہ!"

"توبہ توبہ! میں کیوں کرنے لگی تیری برائیاں۔"

"بچپن سے دیکھ رہی ہوں خالہ! کون سی نئی بات ہے۔"

"ارے میں تو ثمرین سے یہ کہہ رہی تھی اکبر آنے والا ہے تازہ روٹی ڈال لو۔"

"خیر خالہ جو بھی کہو میں کون سا یقین کرنے والی ہوں۔"

وہ تخت پر ہی بیٹھ گئی۔ شام ہوتے ہی اس نے صحن میں چارپائیاں ڈال کر پنکھا چلا دیا اور خود کسی فلمی ہیروئین کی طرح سج کر بیٹھ گئی۔ لمبے لمبے ناخنوں پر سرخ نیل پالش، سرخ لپ اسٹک بالوں کی لٹیں ہوا میں اڑ رہی تھیں۔ اکبر آ گیا تھا۔ خالہ بھی صحن میں ہی بیٹھ گئیں۔

ثمرین نے چارپائی پر دسترخوان لگایا اور سب کے لیے تازہ روٹی بنانے لگی کام کرتے پسینہ پونچھتے لپ اسٹک نجانے کہاں گئی۔ اب اس نے کھانے کے برتن اٹھائے اور چائے بنانے چل دی۔ بچے صحن میں کھیل رہے تھے۔ شبانہ کے پاس نجانے کون سی اسٹوریاں تھیں جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ اکبر بات بات پر قہقہہ لگا رہا تھا۔ فرخندہ بیگم دل ہی دل میں شکر ادا کر رہی تھیں کہ شبانہ کی شادی اکبر سے نہ ہو پائی تھی۔

digest library.com

چائے کی ٹرے سب کے درمیان رکھ کر وہ اکبر کے صبح کے کپڑے نکالنے چل دی۔ الماری کھولی تو سامنے پڑے چوڑیوں کے ڈبے کو بھی کھول کر دیکھنے لگی۔

"تمہاری کلائی میں کالی چوڑیاں بہت جچتی ہیں۔" کہیں کوئی بولا تھا۔ شادی کے بعد خریدی جانے والی ساری چوڑیاں ویسے کی ویسے ہی پڑی تھیں۔ وہ چوڑیوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ کتنا شوق تھا اسے چوڑیاں پہننے کا، نجانے سارے شوق کب ختم ہو گئے۔

اکبر نے کبھی اسے سراہا ہی نہیں تھا۔ اسے اس کی ہر چیز میں عیب ہی عیب نظر آتے، وہ پہلے خوب دل لگا کر تیار ہوتی پر جس کے لیے سجتی وہ منہ پھیر کر سو جاتا۔

ہاں ایک ہی دن میں شوق کہاں مرتے ہیں شوق بھی انسانوں کی طرح دھیرے دھیرے مرتے ہیں۔ چار بازاروں میں گھوم کر ایک جوڑا پسند کرنے والی ثمرین کو پسند کا لباس خریدے بھی مدت ہو گئی تھی۔

اکبر کمرے میں آیا تو وہ جلدی سے ڈبہ رکھ کر پلٹی۔ وہ موٹر سائیکل کی چابی اٹھا کر باہر کی جانب چل دیا۔ وہ بھی اس کے پیچھے کمرے سے نکل آئی۔

"اچھا بھابھی اب میں چلتی ہوں۔"

شبانہ اس سے مل کر خالہ کی جانب بڑھی۔

یہ "اپنی اماں کو دے دینا۔" خالہ نے دوپٹے کے پلو سے بندھے کچھ مڑے تڑے نوٹ نکال کر شبانہ کو دیئے۔ "اپنی اماں سے کہنا۔ جو تمہارے گھر کے پاس کٹ پیس کی سیل لگتی ہے نا وہاں سے اپنی بھابھی کے دو تین جوڑے خرید دے۔"

"اے خالہ! ذرا زیادہ پیسے دے دو رستے میں کھوئے والی قلفی بھی لے لوں گی۔"

"اکبر کھلا دے گا تجھے تیرا تو پیٹ ہی نہیں بھرتا۔"

"ہاہاہا!" اس نے قہقہہ لگایا اور اک ادا سے اکبر کے پیچھے بیٹھ کر گئی۔

خالہ بھی بڑی چالاک ہیں۔ اگلی دفعہ گھر آنے کا بہانہ دے کر بھیجا ہے اسے۔ اب کچھ دنوں بعد پھر یہ محترمہ ادھر پائی جائیں گی۔ پتہ نہیں کیوں پر جس دن شبانہ آ جاتی ثمرین کو وہ دن بڑا بھاری محسوس ہوتا جیسا بھی تھا اکبر اس کا شوہر تھا۔

☆☆☆

"السلام علیکم بھابھی!" ثمرین تار پر کپڑے پھیلا رہی تھی جب ہی سامنے والی سویرا آ گئی۔

"وعلیکم السلام! خیر ہے سویرا صبح صبح کوئی کام تھا؟" ثمرین نے غور سے سویرا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ لان کی فٹنگ والی قمیض پر شیفون کا باریک سا دوپٹہ اوڑھے سویرا صبح صبح اپنی نوک پلک سنوار کر آئی تھی۔

"ہاں جی، وہ اکبر بھائی سے یہ فارم فل کروانا تھا۔ آج اتوار ہے نا تو میں نے کہا آج ہی کروا لیتی ہوں۔ ویسے کہاں ہیں اکبر بھائی؟"

"وہ سامنے برآمدے میں ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔"

"اچھا میں چلتی ہوں۔" وہ برآمدے کی جانب چل دی۔ نجانے لوگوں کے گھروں میں کام نہیں ہوتے کیسے صبح صبح ہی بن سنور جاتے ہیں یہ لوگ۔ ثمرین کپڑے پھیلاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ وہ کور اتارنے کے بہانے برآمدے میں رکھے اماں کے تخت پر بیٹھ کر تکیے کے غلاف اتارنے لگی۔ اس کا شوہر اس وقت پوری دنیا کا سب سے بڑا خوش اخلاق شخص بنا ہوا تھا۔

سویرا گئی تو اس نے سوچا وہ بھی خوش اخلاقی کا تھوڑا فائدہ اٹھا لے۔ واشنگ مشین میں کپڑے ڈال کر برآمدے میں آ گئی۔

"اکبر!" اس نے پاس رکھے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"ہوں" اس نے ٹی وی سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔

"وہ میں سوچ رہی تھی کہ آج باجی کی طرف

چکر لگالوں۔ کپڑے دھل گئے ہیں میں کھانا بھی بنا لیتی ہوں اگر آپ مجھے چھوڑ آئیں تو۔"

"ابھی دو ماہ پہلے ہی تو ہو کر آئی ہو اپنی بہن کے گھر سے، غیبتیں ہی کرنی ہیں فون پر کرلو ایک چھٹی ہوتی ہے ہفتے میں، وہ بھی نہ گھر میں سکون سے گزارنے دینا۔"

وہ بھول گئی تھی کہ خوش اخلاق وہ دنیا کے لیے ہے، اس کے لیے تو وہ ہمیشہ جلی کٹی سنانے والا بد اخلاق اکبر تھا۔ وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ آئی۔

کچھ ہی دیر بعد خالہ چادر لیے باہر آئی تھیں ہاتھ میں دو تین شاپر اٹھائے۔

"یہ لو سو روپے گھر میں دال رکھی ہے۔ گلی کے کسی بچے سے ٹماٹر پیاز منگوا لینا۔ میں ذرا اکبر کے ساتھ شبانہ کے ہاں جا رہی ہوں۔

ٹائم لگ جائے گا، ہماری روٹی مت بنانا۔

آ بھی جاؤ اکبر! میرا برا حال ہو رہا ہے گرمی سے۔"

انہوں نے زور سے اکبر کو آواز دی۔

"آ گیا آ گیا۔" اکبر فرمانبردار بچے کی طرح بھاگا آیا تھا۔

موٹر سائیکل سٹارٹ ہونے کی آواز آئی تو اس نے ہاتھ میں پکڑے گیلے کپڑے زور سے بالٹی میں پٹخے اور خود برآمدے میں صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔

ماں باپ نے شادی کی تھی کہ لڑکا سرکاری نوکری کرتا ہے ہماری بیٹی کو مالی طور پر کوئی مشکل حالات پیش نہیں آئیں گے پر یہاں تو سب کچھ اکبر کی اماں کے ہاتھ میں تھا۔ اگر کبھی شروع کے دنوں میں وہ اسے چند سو دے بھی دیتا تو اس کا علم اماں کو ضرور ہوتا۔ اور پھر اماں ان چند سو کا پورا پورا حساب لیتیں۔

آج اتوار تھا بچے گلی میں کھیل رہے تھے۔ اس نے کسی بچے کو بلانے کے لیے گلی میں جھانکا تو بریانی کی تیز خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ اماں تو کھائے گی قورمہ بریانی میں یہاں دال پکا کر بیٹھی رہوں۔

اس کے ذہن میں فوراً خیال آیا۔ اماں تو آئیں گی رات میں، اس کے پاس کچھ پیسے پڑے تھے اس نے جلدی سے بریانی کے سامان کی لسٹ بنائی بچے کو پکڑ کر خود دال چننے لگی۔ بڑھیا آکر کھائے خود ہی دال، اس نے دال چن کر پرات کچن میں رکھی۔ جلدی جلدی بریانی بنائی دوسری طرف دال چڑھائی اور خود بچوں کے ساتھ بیٹھ کر بریانی کھانے لگی۔

شاید پورے دو ماہ پہلے آپا کے گھر بریانی کھائی تھی۔ بریانی کھا کر مزہ آ گیا تھا اس نے جلدی سے بقیہ بریانی ہاٹ پاٹ میں رکھی اور برتن دھو کر رکھ دیے۔

digest library.com

☆☆☆

وہ صحن میں جھاڑو لگا رہی تھی جب ہی باہر دروازے پر کوئی آیا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے شبانہ کپڑوں کے تھیلے اٹھائے کھڑی تھی۔ اس نے منہ پر زبردستی کی مسکراہٹ سجائی۔

"کیا ہو گیا بھابھی پریشان تو نہیں ہو گئیں مجھے دیکھ کر کہ لو پھر سے آ گئی؟ خیر آپ کے کپڑے ہی خرید کر لائی ہوں۔ خالہ کہاں ہیں؟"

"اماں ذرا پڑوس میں گئی ہیں تم یہ پانی پیو۔"

"ایک دم کنجوس مکھی چوس ہے خالہ۔" اس نے پانی پی کر گلاس ٹیبل پر رکھا۔

"خود سے پانچ سو ڈال کر آپ کے کپڑے لائی ہوں۔ پر بھابھی آپ دیکھیے گا جب آپ طاہرہ باجی کے ہاں پہن کر جائیں گی کوئی مانے گا نہیں کہ کٹ پیس سے لیے ہیں۔"

"طاہرہ باجی کے ہاں کوئی فنکشن ہے کیا؟"

"ویسے تو آپ کو نہیں پتا۔ اپنے نئے گھر کا افتتاح رکھا ہے اگلے مہینے انہوں نے۔ لو بھابھی آپ بھی حد کرتی ہو۔ ایک اکلوتی نند اس کی بھی کوئی خیر خبر نہیں۔"

"لیکن امجد بھائی تو بے چارے بے روزگار ہیں۔ سسرال والے بھی کرائے کے گھر رہتے ہیں۔ تو

digest library.com

انہوں نے نیا گھر کیسے بنوالیا؟"

"امجد بھائی بے روزگار ہیں پر آپ کا میاں تو سرکاری نوکری کرتا ہے نا۔ خالہ کو مت بتایئے گا۔ اکبر کی دو کمیٹیاں نکلی تھیں وہ خالہ نے طاہرہ آپی کو دلوائی ہیں۔ اور جو آپ کے سسر کا پلاٹ تھا وہ، بھی خالہ نے طاہرہ باجی کے نام کردیا تھا۔ خیر آپ یہ پرنٹ دیکھیں۔"

وہ تھیلے میں سے کپڑے نکال کر اسے دکھانے لگی۔ جس کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔ اسے نہیں پتا کب شبانہ گئی کیسے اس نے کام نمٹائے۔ رات ہوئی تو وہ اکبر کے پاس آئی۔

"اکبر! کیا طاہرہ باجی نے نیا گھر بنوایا ہے؟"

"ہاں!"

"کیسے؟ میرا مطلب امجد بھائی تو بے روزگار ہیں۔"

"تمہیں اس سے کیا لینا دینا۔ اللہ نے اس بے چاری کی سن لی ہے۔"

"ہاں اللہ بس میری ہی نہیں سنتا باقی سب کی سنتا ہے۔"

"کیا کمی ہے تمہیں۔ کھانے کو نہیں ملتا سر پر چھت نہیں یا پہننے کو لباس نہیں۔ بس کردو ناشکری عورت۔"

"سال میں ایک دو جوڑے سیل سے لے دیتی ہیں آپ کی اماں۔"

"تو تم اپنے باپ کے گھر کیا گل احمد کے جوڑے پہنتی تھیں؟ تمہاری بہنیں بھی سیل سے ہی خریدتی ہیں۔ نہیں پسند آتے تو اپنے باپ سے کہہ دیا کرو، وہ بنوا دے۔ دماغ خراب کرکے رکھا ہے۔"

"ہر عورت کے کچھ خواب ہوتے ہیں اکبر! میرا دل بھی چاہتا ہے آپ کے ساتھ بازار جاؤں اپنی پسند کے جوڑے خریدوں۔ اچھی خاصی تنخواہ ہے آپ کی۔"

"پر میرا دل نہیں چاہتا جاؤ یہاں سے۔" وہ خاموشی سے اٹھ کر آگئی۔

☆☆☆

وہ برتن دھو کر برآمدے میں آئی تو فون پر کال آرہی تھی یہ بچے بھی نا فون سائلنس پر لگا دیتے ہیں۔

"امی کا فون خیر ہو!"

"ہاں ثمرین کہاں مصروف تھیں؟ کب سے کال کررہی ہوں۔"

"وہ امی میں کچن میں تھی۔"

"اچھا میں نے تمہیں بتانا تھا کہ میں اور تمہاری خالہ آرہے ہیں تمہاری طرف۔ واصف بھی ساتھ ہے۔ ابھی ہم لوگ امبرین کی طرف ہیں۔"

"جی جی ضرور۔" وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی واصف کا نام سن کر دل زور سے دھڑکا تھا۔ نجانے اسے کیا ہوا سب کام چھوڑ کر اس نے الماری کھولی۔

"کالا رنگ تو بنا ہی تمہارے لیے ہے۔" آس پاس کوئی بولا تھا۔

اس نے سرخ کڑھائی والا کالا جوڑا نکال کر استری کیا عرصے سے بند پڑا چوڑیوں کا ڈبہ کھولا۔ ڈبہ لے کر وہ بیڈ پر بیٹھ گئی سائیڈ ٹیبل پر پڑی اکبر کی تصویر نے تیوری چڑھائی۔ "کالا رنگ مت پہنا کرو۔ منحوس ہوتا ہے۔" اس نے تصویر الٹا کر رکھ دی۔

مدت بعد دل کیا تھا چوڑیاں پہننے کو۔ وہ خوب جی لگا کر تیار ہوئی۔ کچھ ہی دیر میں خالہ اور امی بھی آگئیں۔ ان کے ساتھ واصف بھی تھا واصف دبئی سے آیا تھا۔ اتنی دیر میں اکبر بھی آگیا۔

وہ کچن میں خوشی خوشی کھانا بنارہی تھی۔ نجانے کیوں آج دل بہت خوش تھا۔ وہ بات بات پر ہنس رہی تھی۔ اکبر دور صوفے پر بیٹھا پرسوچ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر اکبر پر پڑی تو دل کو بڑی کمینی سی خوشی ہوئی۔ کیسے آگ لگ رہی ہے۔ خود آئے دن شبانہ کے ساتھ گپیں لگاتا ہے۔

"ثمرین" اماں نے ایک تھیلے میں سے کچھ

digest library.com

کپڑے نکالے، یہ تمہارے اور اکبر کے کپڑے ہیں۔ تمہاری خالہ لائی ہیں۔"

"میں کہاں یہ سارے واصف ہی خرید کر لایا ہے۔" خالہ بولیں۔

امی نے کالے رنگ کا ایک خوبصورت پرنٹ کا جوڑا اس کی طرف بڑھایا۔ "بہت خوب صورت ہے۔" اسے وہ واقعی بہت اچھا لگا تھا۔ "شادی کب کروا رہے ہو واصف میاں!" اکبر جب پریشان ہوتا تو بائیں ٹانگ مسلسل حرکت میں رہتی۔ "جب اللہ کو منظور ہوگا۔" واصف نے نپا تلا جواب دیا تھا۔

"ارادہ تو بہت پہلے تھا پر اللہ کی مرضی۔" اس نے ثمرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اکبر سے مزید برداشت نہ ہوا سو سگریٹ کے بہانے اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ وہ کپڑے رکھنے کمرے میں آئی تو وہ سگریٹ سلگائے کمرے میں چکر کاٹ رہا تھا۔ اس نے ہنسی چھپانے کے لیے منہ دوسری جانب کرلیا۔ خالہ شام کی چائے پی کر چلی گئیں۔ پر اکبر گم صم سا سگریٹ پر سگریٹ سلگا رہا تھا۔ برسوں کے جلے دل پر ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار پڑی تھی۔ اس نے جلتی پر تیل ڈالنے کا ارادہ کیا۔ اس نے امی کے لائے کپڑے نکالے اور باہر کی جانب چل دی۔

"کہاں جا رہی ہو؟ اور یہ کالا جوڑا مت سلوانا!" پیچھے سے اکبر کی آواز آئی تھی۔

"تو پھر کیا کروں۔ آنے جانے کے لیے کوئی ایک بھی تو اچھا جوڑا نہیں۔"

"میں دلا دوں گا تمہیں۔" اس نے حیرانی سے اکبر کی طرف دیکھا۔

"آپ؟" اس نے بے یقینی سے کہا۔

"تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے میں نے کبھی کچھ لے کر ہی نہ دیا ہو۔"

"نہیں وہ اماں ناراض ہو جائیں گی نا۔"

"تم نے ضرور اماں کو بتانا ہے۔ اپنی اماں کے ہاں چلی جانا وہیں سے لے لینا۔" اس پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹا تھا۔ اکبر نے جیب سے پانچ پانچ ہزار کے کچھ نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔ اب تو اس نے اپنے ہاتھ پر چٹکی لی تھی۔ نہیں یہ کوئی خواب نہیں۔ لگتا ہے میری دعائیں قبول ہوگئی ہیں۔

"اب کچھ نہیں ہونے والا بھابھی۔" شبانہ آنکھیں گھماتے ہوئے اس کے تصور میں آئی۔

بیٹا نعمت بڑھانے کا بس ایک ہی فارمولا ہے۔ اور وہ ہے شکر۔ اس کے ابا کی آواز آئی۔

اس نے جلدی سے کپڑے اور پیسے بیڈ پر رکھے۔ اور باہر کی طرف چل دی۔

"اب کہاں جا رہی ہو؟"

"میں آتی ہوں۔" اس نے جلدی سے وضو کیا۔ اور اپنے رب کا شکر ادا کیا۔ مدت بعد دل میں سکون اتر آیا تھا۔

لیے۔ جائے نماز اٹھانے سے پہلے وہ اللہ سے توبہ کرنا نہ بھولی تھی۔ اس خیانت پر۔ جو آج اس سے ہو گئی تھی۔ اکبر کی مسلسل بے رخی ہی تھی جو آج واصف کے آنے پر اس کا دل باغی ہوگیا تھا۔ اس نے تہیہ کیا آج سے ہر روز اپنے شوہر کے لیے سجے گی سنورے گی۔

سامنے ہی شبانہ آئی تھی۔ پراندہ گھماتی جو بھی کرلو بھابھی اب کچھ نہیں ہونے والا۔

"چل شیطان کی نانی۔"

"کیا کہا تو نے؟" پیچھے سے آتی اماں کو ذرا اونچا سنتا تھا۔

"اماں بلی۔ بلی تھی۔"

وہ جلدی سے جائے نماز اٹھا کر کمرے کی طرف بھاگی۔ جہاں اس کا اکبر اس کا انتظار کر رہا تھا۔

☆☆

عروج عالم

راحت اور راحتے

digest library.com

اس نے پُر امید لیکن بے چین نگاہوں سے
ی ڈاکٹر کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھتے
ے پہلو بدلا۔

وہ اپنے وقت سے پہلے ہی آ گئی تھی۔ اس کے
یں طرف بیٹھی عورت اپنے دو ڈھائی سالہ بچے کو
ے کچھ کھانے کو نکال کر دے رہی تھی اور بڑی
ت سے اسے بہلا رہی تھی، دوسری طرف ایک
دان جوڑا چہرے پر خوش گوار سی مسکراہٹ لیے
تقبل کے حسین سپنے بن رہا تھا کوئی کوئی جملہ اس
کانوں میں پڑ رہا تھا۔

ذرا سا دور ایک اور عورت مطمئن سی بیٹھی
۔ اس منظر سے نظریں ہٹا کر اس نے کھڑکی سے
دیکھا۔ خوش نما قطار در قطار سرو کے اونچے
ت پوری شان سے ایستادہ تھے۔ یہ بے ثمر
درخت اسے اپنے جیسے لگے۔ اس نے بے چین ہو
کر یہاں سے بھی نگاہیں ہٹائیں اور دوبارہ ڈاکٹر
کے کمرے کے دروازے پر کسی امید کے ساتھ نگا
دیں۔ تبھی نرس کی آواز اس کے کانوں میں پڑی، وہ
اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے اٹھی، ڈاکٹر کے سامنے جا
کر بیٹھی اور اپنی فائل ڈاکٹر کے سامنے رکھ کر بھی
نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھنے لگی۔

جیسے اس کے غم کو مداوا اور اس کی بے قراری کو
قرار کی نوید آج یہیں سے ملنے والی ہے۔ اجلے سفید
اوور آل میں ملبوس شفیق سی ڈاکٹر نے اس کی ساری
رپورٹس دیکھیں اور کہا "یہ کچھ طاقت کی دوا میں لکھ
رہی ہوں یہ استعمال کریں، خوش رہنے کی کوشش
کریں دماغ پر کسی چیز کو سوار نہ کریں اور صبر کے
ساتھ انتظار کریں۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحبہ۔"

"بی بی! آپ کی سب رپورٹس بالکل نارمل ہیں آپ کو کسی علاج کی ضرورت نہیں۔ اللہ سے دعا کریں بس۔"

بوجھل قدموں کے ساتھ وہ گھر پہنچی۔ صحن میں بیٹھے اسکول کا کام کرتے بچوں پر نظر ڈالی اور کمرے میں چلی گئی جہاں ابھی ابھی اس کا شوہر طارق کام سے آیا تھا۔ اور اس کے سامنے جاتے ہی جیسے اس کے صبر کا بندھن ٹوٹ گیا اور وہ بلک کر رو پڑی۔

"ڈاکٹر کہتی ہے تمہاری سب رپورٹس ٹھیک ہیں تم بس انتظار کرو۔"

طارق اس غم کو پچھلے کئی سالوں سے سہہ رہا تھا۔ وہ بھی دل ہی دل میں امید لگائے کسی خوش خبری کے انتظار میں اذیت کے کانٹے چن رہا تھا۔ ہر نا امیدی کے بعد وہ صبر کے بہلاوے کی سل سینے پر رکھ کر رہ جاتا۔ طارق اس کے ساتھ مل کر اپنے اور اس کے سب ٹیسٹ وغیرہ کروا چکا تھا اور جانتا تھا کہ ہر نیا ڈاکٹر یہی کہتا ہے کہ صبر کے ساتھ انتظار کرو اس لیے آج بھی وہ بس تسلی دے کر رہ گیا۔

☆☆☆

راحت کے ساس سسر کا پانچ سال پہلے روڈ ایکسیڈنٹ میں اس وقت انتقال ہو گیا تھا، جب ان کی شادی کو بہ مشکل دو ہی سال ہوئے تھے۔

طارق سے چھوٹے تین بہن بھائیوں اور کاروبار کی ساری ذمہ داری طارق پر آ گئی۔ خدا کی قدرت طارق اور چھوٹے بہن بھائیوں میں بارہ سال کا وقفہ تھا۔ طارق کی پیدائش کے بعد گیارہ سال تک ناامیدی رہی، اس کے بعد اللہ کی مہربانی ہوئی ایک بیٹا ہوا اور تین اور پانچ سال کے وقفے سے ایک بیٹا اور بیٹی اور ہوئے۔ طارق کی شادی والدین نے کم عمری میں کر دی۔

والدین کی وفات کے بعد، کاروبار تو طارق نے سنبھال لیا اور بہن بھائی گھر میں موجود پرانی ماما کے حوالے ہو گئے تھے۔۔ والدین کی وفات کے وقت طارق خود تو نوجوان تھا ہی بہن بھائی بھی چھوٹے ہی تھے۔ اس کے گھر کا ماحول بظاہر بہت پرسکون تھا بچے سلجھے ہوئے تھے اور حتی الوسع کوشش کرتے کہ بھابھی کو پریشان نہ کریں۔ اسے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ بس اپنی ذات میں الجھی الجھی رہتی، اپنے بچے نہ ہونے کی وجہ سے اسے کوئی خوشی خوشی نہ لگتی۔ ابھی اندر آتے ہوئے تینوں بچے اسے صحن میں نظر آئے تھے، پر وہ پاس سے گزر کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اور اب بلک بلک کر روتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ خدایا کب تک صبر کروں؟ میرے دامن دل سے لپٹی یہ خواہش کب پوری ہوگی؟ میری آنکھوں میں بسا یہ حسین منظر کہ ایک پیارا سا بچہ میری گود میں ہو کب حقیقت کا روپ دھارے گا؟ کب آخر کب؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔

وہ بھی عام ہی دنوں سا، ایک اداس دن تھا جب طارق کی خالہ بچوں سے ملنے آئیں۔

وہ اکثر ہی بچوں کی خیریت دریافت کرنے آیا کرتی تھیں۔ اس دن بھی وہ آئیں لڑکوں کو لاڈ پیار کیا، ردا کو کافی دیر ساتھ لگائے رکھا وہ انہیں کچھ کمزور اور چپ چپ سی لگی۔ وہ ردا کے بے رونق چہرے پر نظریں جمائے نہ جانے کیا سوچ رہی تھیں۔

اتنے میں راحت چائے اور لوازمات لے آئی۔

"لیں خالہ چائے پئیں۔" خالہ نے ہاتھ بڑھا کر چائے کا کپ پکڑا۔ راحت خالہ کے ہاتھ کے بنے تھانے سنبھال کر رکھ آئی تھی جو وہ آتے ہوئے لانا نہ بھولتیں۔

ردا ان کے لائے تحفے کھول کھول کر دیکھ رہی تھی۔ خالہ نے ہمیشہ ان سب کے ساتھ پیار کا سلوک رکھا تھا۔ چائے پیتے پیتے خالہ نے اس کا حال پوچھا، اس نے خالی نظروں سے انہیں اور پھر اپنی گود کو دیکھا نظریں جھکا لیں اور سرد آہ بھر کر چپ رہی۔ خالہ بن کہے سمجھ گئیں۔ ادھر ادھر کی باتوں کے دوران ہی دھیرے سے بولیں۔ "راحت! ہم جس خوشی کی تلاش میں ہوتے ہیں، وہ ایک حسین منظر کا روپ دھار کر ہماری نظروں میں بس جاتی ہے اور اس سے پرے ہٹ کر کوئی اور منظر چاہے کتنا ہی دل

قریب کیوں نہ ہو ہماری توجہ کا مرکز نہیں بن پاتا۔ کیونکہ ہمیں پھر اور کچھ دکھتا ہی نہیں۔ گھر کا آنگن پھولوں سے بھرا ہوتا ہے لیکن ہمیں بس ہماری مرضی کا پھول چاہیے ہوتا ہے۔ اس پھول کی تلاش میں ہماری بے توجہی سے گھر آنگن میں مہکتے پھول بے شک کملا جائیں ہمیں تو بس ہماری مرضی پوری کرنی ہوتی ہے اپنی خواہش کی تکمیل چاہیے ہوتی ہے۔" پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ ان کے لہجے میں کرب اور دکھ کو محسوس کر کے راحت کو جھرجھری آگئی اور شاید یہ وہی لمحہ تھا جب کوئی بے چین دل محض اپنی قوت ارادی سے سکون کی راہ اختیار کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔

وہ سمجھ گئی تھی کہ خالہ بچوں کے ساتھ اس کے سردمہر رویے کی وجہ سے دکھی ہیں۔ خالہ بہت جہاندیدہ اور بردبار تھیں وہ نرمی سے اس سے بات کرتی رہیں۔ اس نے دل ہی دل میں کچھ ارادہ کیا اور کہا۔ "خالہ آپ کو آئندہ مجھ سے شکایت نہ ہوگی۔"

☆☆☆

آہستہ آہستہ اس نے بچوں کے ساتھ وقت گزارنا شروع کیا اور ان کے کاموں کو اپنی ذمہ داری سمجھنا شروع کر دیا، اپنی آنکھوں میں بسے اپنے پسندیدہ منظر کی اوٹ سے دنیا کے حسین رنگ دیکھنے شروع کر دیے۔

پھر اسے ردا اور دونوں دیوروں کے چھوٹے موٹے کام کرنا اچھا لگنے لگا۔ اس کی تڑپتی ممتا کو جیسے چین آنے لگا۔ اسے اور کیا چاہیے تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ دونوں دیوروں کو پڑھا لکھا کر ردا کا اچھی جگہ دیکھ کر رشتہ طے کر دیا۔

وہ سب کی نظروں میں سرخرو ہو گئی تھی۔

راحت صحیح معنوں میں سب ہی کے لیے باعث راحت بن کر جی رہی تھی۔

اور ہاں ایک خاص بات یہ کہ جب راحت نے اپنا دل، ان بن ماں باپ کے بچوں کے ساتھ لگایا اور اپنی خواہش کو بھولنے میں نہیں پر دبانے میں کامیاب ہوگئی تو اس پاک ذات نے بھی مہربانی کرنے میں بہت دیر نہیں کی۔ کچھ عرصہ کے بعد اللہ نے آگے پیچھے اسے دو بچوں سے نوازا اس کی گود خالی نہ رہی اور وہ حسین منظر حقیقت بن ہی گیا۔

دُنیا کی نیچر کی طرف واپسی اور پاکستان کا ہربل مستقبل

حکیم محمد عثمان (چیف ایگزیکٹو مرحبا لیبارٹریز پاکستان)

اس وقت چالیس سے زیادہ ملکوں میں مرحبا لیبارٹریز کی پراڈکٹس جا رہی ہیں۔ دنیا اب تیزی سے مصنوعی اور کیمیائی علاج سے ہٹ کر قدرتی، ہربل اور متبادل ادویہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔

پاکستان میں کئی ایسی ہربل مصنوعات موجود ہیں جو درست معیار، تحقیق اور برانڈنگ کے ساتھ عالمی منڈی میں نمایاں مقام حاصل کر سکتی ہیں۔ مگر پاکستان میں ان پر سنجیدہ سرمایہ کاری اور ریاستی سرپرستی کا فقدان ہے۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ پاکستان کی کئی قیمتی خام جڑی بوٹیاں ریسرچ کے نام پر بیرون ملک لے جائی جا رہی ہیں۔ جہاں ان پر ویلیو ایڈیشن، برانڈنگ اور جدید تحقیق ہوتی ہے اور پھر وہی مصنوعات مہنگے داموں عالمی منڈی میں فروخت کی جاتی ہیں۔ ہم خام مال بیچ کر مطمئن ہو جاتے ہیں، جبکہ اصل منافع، علم اور شناخت دوسروں کے حصے میں چلی جاتی ہے۔

دنیا کے کئی ممالک میں جو جڑی بوٹیاں قیمتی سمجھی جاتی ہیں۔ ان کے متبادل پاکستان میں بھی موجود ہیں اور با آسانی کاشت بھی کی جا سکتی ہیں۔ مسئلہ وسائل کی کمی نہیں۔ مسئلہ وژن، پالیسی اور سنجیدہ ریاستی توجہ اور لیڈرشپ کا فقدان ہے۔

اگر پاکستان نے ہربل ریسرچ ادارے مضبوط نہ کیے۔ مقامی صنعت کو سہولت نہ دی۔ جڑی بوٹیوں کی بے ضابطہ برآمدات نہ روکیں تو ہم ہمیشہ خام مال فراہم کرنے والا ملک بنے رہیں گے۔ مرحبا جیسے اداروں کے عالمی مشاہدات ایک واضح پیغام دیتے ہیں کہ اب فیصلہ ہمیں کرنا ہے کہ ہم اس خزانے کو قومی دولت بناتے ہیں یا دوسروں کو فائدہ اٹھانے دیتے ہیں۔

محبت کے سفر میں کوئی رستہ نہیں دیتا
زمیں واقف نہیں بنتی، فلک سایا نہیں دیتا

خوشی اور دکھ کے موسم سب کے اپنے اپنے ہوتے ہیں
کسی کو اپنے حصے کا کوئی لمحہ نہیں دیتا

نہ جانے کون ہوتے ہیں جو بازو تھام لیتے ہیں
مصیبت میں سہارا کوئی بھی اپنا نہیں دیتا

اداسی جس کے دل میں ہو اس کی نیند اڑتی ہے
کسی کو اپنی آنکھوں سے کوئی سپنا نہیں دیتا

اٹھانا خود ہی پڑتا ہے تھکا ٹوٹا بدن فخری
کہ جب تک سانس چلتی ہے کوئی کندھا نہیں دیتا

زاہد فخری

وہ دلکشی ہوئی تو کہانی ہوئی، وہ چمک دار شعلہ، فسانہ ہوا
وہ جو اُلجھا اتحاد وحشی ہوا سے کبھی، اس دیے کو بجھے تو زمانہ ہوا

باغ میں پھول اس سمت جو بھی کھلا، اس کی زلفوں میں سجنے کو بے چین تھا
جو ستارہ بھی اس سمت روشن ہوا، اس کی آنکھوں کی جانب روانہ ہوا

کہکشاں سے پرے، آسماں سے پرے، رہگزر زماں و مکاں سے پرے
مجھ کو ہر حال میں ڈھونڈنا تھا اُسے، یہ زمیں کا سفر تو بہانہ ہوا

اب تو اس کے دنوں میں بہت دور تک آسماں چین سے سو رہا ہے
اب کہاں یاد ہو گی اُسے رات وہ جس کو گزرے ہوئے اک زمانہ ہوا

موسمِ وصل میں خوب ساماں ہوئے، ہم جو فصلِ بہاراں کے مہماں ہوئے
گھاس تو آلیس کی طرح پگھلتی گئی، سر پہ ابرِ رواں شامیانہ ہوا

اب تو مجھ جدائی کے اس موڑ تک، درد کی دھند ہے اور کچھ بھی نہیں
جانِ من اب وہ منظر سمٹنے کے نہیں، جو شعر چھوڑ کے اب وہ گھر پرانا ہوا

امجد اسلام امجد

شگفتہ نگاہ

digest library.com

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ دائیں ہاتھ سے کھائے، دائیں ہاتھ سے پیے، دائیں ہاتھ سے لے اور دائیں ہاتھ سے دے کیونکہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے، بائیں ہاتھ سے پیتا ہے، بائیں ہاتھ سے دیتا اور بائیں ہاتھ سے لیتا ہے۔''

(سنن ابن ماجہ)

مطالعہ

کتاب یا کوئی تحریر پڑھنے سے صرف علم ہی حاصل نہیں ہوتا، بلکہ یہ آپ کے دماغ کو مکمل طور پر ''نیا'' بنا دیتا ہے۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ جب آپ کوئی اچھی کتاب پڑھ رہے ہوتے ہیں تو صرف کہانی میں نہیں، بلکہ اپنے دماغ کی ساخت میں بھی تبدیلی لا رہے ہوتے ہیں۔

جی ہاں! تازہ تحقیق کے مطابق، مطالعہ ہمارے دماغ کو ''ری وائر'' (Rewire) کر دیتا ہے۔ یعنی وہ ہمیں اندر سے ایک نیا انسان بنا دیتا ہے۔

تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ جو لوگ پڑھنا جانتے ہیں وہ صرف زبان میں نہیں بلکہ یادداشت، مشاہدہ اور معلومات کو ترتیب دینے جیسے کاموں میں بھی بہتر ہوتے ہیں۔

یہ صرف ''کتابی بات'' نہیں بلکہ پڑھنے سے انسان کے دماغ میں وہ صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں جو اسے زندگی کے ہر شعبے میں آگے لے جاتی ہیں۔

جب آپ کتاب کھولتے ہیں تو دراصل آپ اپنے دماغ میں ایک نئی ''تار'' جوڑ رہے ہوتے ہیں۔ ایسی تار جو سوچنے، سمجھنے اور دنیا کو مختلف زاویے سے دیکھنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔

سچا چور

ایک خاتون پولیس افسر نے گھر والوں کی اطلاع پر موقع پر پہنچ کر چور کو پکڑ لیا۔ چور نہ صرف ایم اے اردو تھا اور شاعری و موسیقی کا ذوق رکھتا تھا بلکہ دل پھینک بھی تھا۔ مزید ظلم یہ ہوا کہ پولیس افسرانی خاصی خوب صورت تھی۔ گرفتاری کے بعد کارروائی شروع کرتے ہوئے وہ کہنے لگی

''میں تمہاری چمڑی ادھیڑ دوں گی۔ پتا ہے توں پینوں دے علاقے وچ چوری کیتی اے۔''

چور نے کہا ''نہیں۔ اس قدر حسین لڑکی اتنی ظالم نہیں ہوسکتی کہ کسی کی چمڑی ادھیڑ دے۔ جس نفاست سے آپ نے لباس زیب تن کیا ہے، یہ ذوق خدا کسی کسی کو ودیعت کرتا ہے۔ لپ اسٹک کا جو شیڈ آپ نے لگایا ہے، یہ شاید ہی کسی پولیس افسرنی کو نصیب ہوا ہوگا۔ وہ کیا ہے کہ مہدی حسن نے آپ ہی کے لیے گایا ہے کہ

آنکھیں غزل ہیں آپ کی اور ہونٹ ہیں گلاب
سارے جہاں میں آپ کا کوئی نہیں جواب

دریائے سخن کے سونامی کو مزید جوش پکڑتا دیکھ کر تھانیدارنی بولی:

''بی سکینہ، اے نہوں چھڈ دیو۔ ایڈا سچا بندہ چور نئیں ہوسکدا۔''

☆☆☆

ایک عورت نے بتایا میں نے اپنے شوہر کی فیس بک آئی ڈی دیکھی تو وہ شہزادہ نام رکھ کر ایک عورت سے گپ شپ کر رہا تھا۔

اس عورت کا فیس بک پر نام نیلم شہزادی تھا۔ میں نے جب اپنے شوہر کی پوسٹیں دیکھیں تو وہ محبت بھری شاعری اور پیار بھری باتوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اس لڑکی سے شادی کے لیے تیار تھا۔ مجھے بہت غصہ آیا اور

اپنے شوہر کو سبق سکھانے کا سوچا۔

تو میں نے فیس بک پر "ابوالقطاع" نام سے ایک فرضی آئی ڈی بنائی اور اس آئی ڈی پہ جلاؤ گھیراؤ قتل وغارت، خون خرابے والی تصویریں لگانا شروع کر دیں۔

کچھ عرصے بعد آئی ڈی سے اپنے شوہر کو میسج کیا کہ تم جس "نیلم شہزادی" نام کی لڑکی سے عشق لڑا رہے ہو، وہ میری بیوی ہے۔ اور میں داعش کے امیروں میں سے ایک ہوں اور تجھے جانتا ہوں کہ تو کون ہے۔ پھر اس کا نام اس کے باپ بھائیوں کا نام بتادیا اور کہاں رہتا ہے اور کہاں کام کرتا ہے۔ یہ سب لکھ کر کہا کہ اگر اب میں نے تجھے فیس بک پر دیکھا تو تجھے بکرے کی طرح ذبح کر دوں گا۔ "اے خارشی بکرے۔"

وہ عورت کہتی ہے، اگلے دن میں نے دیکھا میرے شوہر کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا برے حال میں تھے۔ انہوں نے موبائل سے فیس بک، انسٹا گرام، واٹس ایپ، آئی ایم او، وائبر سب کچھ ڈیلیٹ کر دیا اور مجھ سے بار بار پوچھ رہے تھے۔

"ظہر کی اذان کی کب ہوگی۔"

استاد کا آخری سبق

ایک معزز استاد نے حال ہی میں ریٹائرمنٹ لی تھی۔ وہ اور ان کی اہلیہ اسلام آباد کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے آبائی علاقے میں رشتہ داروں سے ملنے جانے کا فیصلہ کیا۔

روانگی سے پہلے استاد نے سوچا۔

"جب ہم گھر پر نہیں ہوں گے اگر کوئی چور آ گیا تو وہ الماریاں توڑے گا۔ سارا گھر الٹ دے گا۔ حالانکہ گھر میں پیسے ویسے ہیں ہی نہیں!"

لہٰذا گھر کو نقصان سے بچانے کے لیے انہوں نے میز پر ایک ہزار روپے اور ایک پرچی رکھ دی، جس پر لکھا تھا:

"پیارے نامعلوم چور کے نام!

سب سے پہلے آپ کو مبارک ہو کہ آپ نے میرے گھر میں گھسنے کی زحمت کی۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ میں ایک درمیانے طبقے کا شخص ہوں، جو صرف پینشن پر گزر بسر کرتا ہے۔ اس لیے یہاں کوئی قیمتی چیز نہیں ملے گی۔

مجھے افسوس ہے کہ آپ کی محنت اور قیمتی وقت ضائع ہو جائے گا۔

اس لیے آپ کی محنت کی قدر کرتے ہوئے یہ معمولی رقم قبول کیجیے۔

ساتھ ہی آپ کے پیشے (چوری) میں مزید کامیابی کے لیے چند مشورے بھی پیش ہیں۔

اور نیچے استاد نے "رہنمائی" میں یہ لکھا،

آٹھویں منزل......ایک بدعنوان وزیر رہتا ہے۔

ساتویں منزل......ایک بے ایمان پراپرٹی ڈیلر

چھٹی منزل......ایک کوآپریٹو بینک کا چیئرمین

پانچویں منزل......ایک بڑا صنعت کار

چوتھی منزل......ایک مشہور وکیل

تیسری منزل......ایک کرپٹ سیاست دان

"ان کے پاس دولت کے انبار ہیں۔ اگر آپ ان کے پاس جائیں گے تو ان کا کچھ نہیں بگڑے گا، اور وہ تو پولیس کو اطلاع بھی نہیں دیں گے۔"

جب استاد واپس گھر پہنچے تو دیکھا میز پر ایک بڑا بیگ رکھا ہے۔

بیگ میں دس لاکھ روپے اور ایک خط موجود تھا۔

"محترم استاد جی!"

آپ کی رہنمائی اور تعلیم کا بہت شکریہ۔ میں نے آپ کے مشورے پر عمل کیا اور میرا مشن کامیاب ہو گیا۔ یہ تھوڑی سی رقم آپ کی خدمت میں نذرانے کے طور پر پیش ہے۔

امید ہے کہ آئندہ بھی آپ کی برکت اور رہنمائی حاصل رہے گی۔

"آپ کا شاگرد......چور"

استاد نے یہ خط پڑھ کر قہقہہ لگایا اور بولے۔

"میں سمجھا تھا، میں ریٹائر ہو گیا ہوں۔ مگر لگتا ہے میری تدریس تو ابھی جاری ہے!"

☆☆

روحیلہ خان

میری بیاض سے

سلمٰی مسرت..........راولپنڈی

پہلے سے خدوخال نہ پہلے سے ہیں خیال
ہم کتنا ایک سال کے اندر کتنا بدل گئے

زرینہ خانم لغاری..........مظفر گڑھ

پھر نیا سال، نئی صبح، نئی امیدیں
اے خدا خیر کی خبروں کے اجالے رکھنا

ناہید اسماعیل..........کراچی

کبھی کو دیکھوں تو ماتھے پہ ماہ و سال ملیں
کہیں بکھرتی ہوئی دھوپ میں سوال ملیں
آؤ دسمبر کی دھوپ میں کچھ دیر بیٹھیں
یہ فرصتیں ہمیں شاید نہ اگلے سال ملیں

مینہ اعوان..........کراچی

وہ عکس بن کے میری چشم تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے، پانی کے گھر میں رہتا ہے

سحر خان..........کراچی

میرے وجود سے دھاگہ نکل گیا ہے دوست
میں بے شمار ہوا ہوں شمار ہوتے ہوئے

شگفتہ جمال..........سکھر

یہ کس کا تصور ہے، یہ کس کا فسانہ ہے
جو اشک ہیں آنکھوں میں تسبیح کا دانہ ہے
جو ان پہ گزرتی ہے کس کس نے اسے جانا ہے
اپنی ہی مصیبت ہے اپنا ہی فسانہ ہے

سیما الیاس..........لاہور

نہ جانے کیا بنا دیتا خیال ماسوا مجھ کو
بہت اچھا کیا تم میری دنیا میں چلے آئے

نسیم زہرا..........کراچی

کتنے موسم سرگرداں تھے مجھ سے ہاتھ ملانے میں
میں نے شاید دیر لگا دی خود سے باہر آنے میں

شعور فاطمہ..........فیصل آباد

یہ محبت ہے عقیدت ہے کہ چاہت ہے فراز
ہم تو راضی ہیں وہ جس حال میں جیسا رکھے

ثمین غزل..........ڈرگ روڈ

اک یہ خواہش کہ کوئی زخم نہ دیکھے دل کا
اک یہ حسرت کہ کوئی دیکھنے والا ہوتا

ثوبیہ قطب..........کراچی

چلنے کا حوصلہ نہیں، رکنا محال کر دیا
عشق کے اس سفر نے تو مجھ کو نڈھال کر دیا
ممکنہ فیصلوں میں ایک ہجر کا فیصلہ بھی تھا
ہم نے تو ایک بات کی اس نے کمال کر دیا

حبیبہ وقار..........کراچی

کبھی ٹوٹ کے نہ برسا میری آرزوؤں کا ساون
جب گھر کے بادل آئے تو اڑا دیے ہوا نے

فضا احمد..........حیدر آباد

پہلی پہلی محبتوں کا خمار
باتوں باتوں میں رات ڈھل جائے
زندگی خوش رہے تیرے وعدوں پر
جیسے بچے کا دل بہل جائے

صبا اتمش..........کوٹ ادو

میاں یہ عشق ہے اور آگ کی قبیل سے ہے
کسی کو خاک بنا دے، کسی کو زر کر دے
تیری تلاش کا یہ وصف بھی کمال کا تھا
کہ گھر میں رکھ کے بھی لوگوں کو در بدر کر دے

ماریہ نورین..........کراچی

مجھ کو کل شام سے وہ بہت یاد آنے لگا
دل نے مدت سے جو اک شخص بھلا رکھا ہے

☆☆

خاتون کی ڈائری

اُمتُ الصبوح

ناہید اسماعیل کی ڈائری سے

نئے سال کے حوالے سے یہ غزل نظر سے گزری۔ موجودہ حالات کے تناظر میں حسن عباسی کا کھرا انداز دل کو چھوتا محسوس ہوا۔

وہ جو حال تھا وہی حال ہے، کہوں کس طرح نیا سال ہے
وہی زندگی کہ وبال ہے، کہوں کس طرح نیا سال ہے

وہی بے یقینی ہے کو بہ کو، وہی نا امیدی ہے چار سو
جو بھی ہے سراپا سوال ہے، کہوں کس طرح نیا سال ہے

وہی دست و پا، وہی چشم و لب، جو گہن میں تھے وہ گہن میں ہیں
وہی حسن، حسن پہ زوال ہے، کہوں کس طرح نیا سال ہے

وہی انتشار کی زندگی ہے، وہی غبار سی زندگی ہے
وہی سانس لینا محال ہے، کہوں کس طرح نیا سال ہے

وہی پھول پھول پہ تتلیاں ہیں ڈری ہوئی کہ مری ہوئی
وہی بے حسی جو کمال ہے، کہوں کس طرح نیا سال ہے

وہی خواب ہیں کہ عذاب ہیں، وہی روز و شب کہ سراب ہیں
وہی گردشِ ماہ و سال ہے، کہوں کس طرح نیا سال ہے

روحیلہ خان کی ڈائری سے

محبت کی قدر نہ کی جائے تو وہ تھک جاتی ہے روٹھ جاتی ہے۔ کھو جاتی ہے۔ حسن نیازی کی یہ مختصر سی نظم ان ہی جذبوں کی ترجمانی کر رہی ہے۔

تم سے کہہ دیا کس نے، تم بن رہ نہیں سکتے
یہ دکھ ہم سہہ نہیں سکتے
چلو ہم مان لیتے ہیں
کہ تم بن ہم بہت روئے
کئی راتوں کو نہ سوئے
مگر افسوس ہے جاناں
کہ اب کے تم جو لوٹو گے
ہمیں تبدیل پاؤ گے
بہت مایوس ہو گے تم
جو پوچھنا چاہو کہ ایسا کیوں کیا ہم نے
سن لو غور سے جاناں
پرانی ایک روایت توڑ دی ہم نے
محبت چھوڑ دی ہم نے

سلمیٰ مسرت کی ڈائری سے

تابش دہلوی کی یہ غزل ایک شکوہ ہے۔ محبت بھری شکایت ہے، دوستوں سے جنہوں نے اعتماد کو توڑا۔ آپ سب کی نذر

دوست کیا خوب وفاؤں کا صلہ دیتے ہیں
ہر نئے موڑ پر ایک زخم نیا دیتے ہیں

تم سے تو خیر گھڑی بھر کی ملاقات رہی
لوگ صدیوں کی رفاقت کو بھلا دیتے ہیں

کیسے ممکن ہے کہ دھواں بھی نہ ہو اور دل بھی جلے
چوٹ پڑتی ہے تو پتھر بھی صدا دیتے ہیں

کون ہوتا ہے مصیبت میں کسی کا اے دوست
آگ لگتی ہے تو پتے بھی ہوا دیتے ہیں

جن پہ ہوتا ہے بہت دل کو بھروسا تابش!
وقت پڑنے پہ وہی لوگ دغا دیتے ہیں

digestlibrary.com

حمدہ عدنان کی ڈائری سے

مختلف کیفیات کی عکاسی کرتی رشید کامل کی یہ غزل مجھے بہت پسند ہے۔ آپ پڑھیے، آپ کو بھی اچھی لگے گی۔

کبھی آ و لب پہ مچل گئی، کبھی اشک آنکھ سے ڈھل گئے
یہ تمہارے غم کے چراغ ہیں، کبھی بجھ گئے، کبھی جل گئے

میں خیال و خواب کی محفلیں نہ بقدر شوق سجا سکا
تیری ایک نظر کے ساتھ ہی میرے سب ارادے بدل گئے

کبھی چھاؤں میں کبھی دھوپ میں
کہیں آفتاب نظر ہیں وہ کہیں مہتاب میں ڈھل گئے

جو فنا ہوئے غم عشق میں انہیں زندگی کا نہ غم ہوا
جو نہ اپنی آگ میں جل سکے وہ پرائی آگ میں جل گئے

تھا انہیں بھی میری طرح جنوں تو پھر ان میں مجھ میں یہ فرق کیوں
میں گرفتِ غم سے نہ بچ سکا وہ حدودِ غم سے نکل گئے

صوفیہ معین کی ڈائری سے

تنہائی کی کیفیت کو بیان کرتی گلزار کی یہ نظم آپ کے لیے

کس قدر سیدھا، سہل، صاف ہے رستہ دیکھو
نہ کسی شاخ کا سایہ ہے، نہ دیوار کی ٹیک
نہ کسی آنکھ کی آہٹ، نہ کسی چہرے کا شور
دور تک کوئی نہیں، کوئی نہیں، کوئی نہیں
چند قدموں کے نشاں ہاں، کبھی ملتے ہیں کہیں
ساتھ چلتے ہیں جو کچھ دور فقط چند قدم
اور پھر ٹوٹ کے گر جاتے ہیں یہ کہتے ہوئے
اپنی تنہائی لیے آپ چلو، تنہا اکیلے
ساتھ آئے جو یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں
کس قدر سیدھا، سہل، صاف ہے، رستہ دیکھو

اسماء بنت فیاض کی ڈائری سے

مودی سرکار نے پاکستان کو کمزور سمجھا تھا لیکن اس کا غرور و تکبر خاک میں مل گیا۔ مودی ساری دنیا میں ذلیل و رسوا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو فتح مبین دی لیکن اس کے باوجود ہم جنگ کے نہیں امن کے حامی ہیں۔ رحمان فارس کی یہ غزل اسی تناظر میں ہے۔

بہت سے کام رہتے ہیں تمہارے بھی، ہمارے بھی
کروڑوں لوگ بھوکے ہیں تمہارے بھی ہمارے بھی

کھلونوں والی عمروں میں انہیں ہم موت کیوں بانٹیں؟
بڑے معصوم بچے ہیں، تمہارے بھی ہمارے بھی

بڑوسی۔ یار۔ جانے دو، ہنسو اور مسکرانے دو
مسلسل اشک بہتے ہیں تمہارے بھی ہمارے بھی

بھلا اقبال و غالب کا کہاں بٹوارہ ممکن ہے؟
کہ یہ سانجھے اثاثے ہیں تمہارے بھی ہمارے بھی

اگر نفرت ضروری ہے تو سرحد پر اکٹھے کیوں؟
پرندے دانہ چگتے ہیں تمہارے بھی ہمارے بھی

چلو مل کر لڑیں ہم تم جہالت اور غربت سے
بہت سپنے ادھورے ہیں، تمہارے بھی ہمارے بھی

سنبھالیں ان کو مل جل کر سکھائیں فن محبت کا
بہت جوشیلے لڑکے ہیں تمہارے بھی، ہمارے بھی

ادھر لاہور ادھر دلی، کہاں جائیں گے ہم فارس
یہی دو چار قصبے ہیں تمہارے بھی ہمارے بھی

☆☆

بقیہ ہمارے نام

ہی نہیں کرنے دو۔ سلام کہا تھیں بیں شکر گزار ہوں صدف ناصر گوجرانوالہ کی کہ میرے نام کو اپنے خط میں شامل بھی کیا۔ صدف ناصر آپ خوش قسمت ہیں کہ اتنا لمبا اور تفصیلی جواب دیا ہے خواتین والوں نے آپ کو ورنہ میرے جتنے بھی خط شامل ہوئے ہیں سب ایڈٹ ہو کر ہی شائع کیے گئے ہیں۔

میں نے ایک کہانی لکھ کر ای میل میں بھیجی ہے لیکن اب تک آپ کی طرف سے کوئی بھی جواب نہیں ملا۔

ج: پیاری الفا! خواتین کی قارئین بے مروت نہیں ہیں بلکہ یہ خواتین کی پالیسی ہے۔ یہ سلسلہ خواتین کی تحریروں اور سلسلوں پر تعریف اور تنقید کے لیے ہے تاکہ ہماری رہنمائی ہو سکے اور ہم پرچے کے بارے میں قارئین کی رائے جان سکیں۔ صدف بہت طویل خط لکھتی ہیں ان کا آدھے سے زیادہ خط ایڈیٹ ہو جاتا ہے۔

عدینہ لغاری حمیرہ سے لکھتی ہیں

میں کچھ دنوں سے لکھنے اور پڑھنے سے دور ہوں۔ پچھلے دنوں ایک آنکھ کا لینس لگوایا ہے مگر میں "مالا" کے بارے میں تبصرہ کرنا چاہتی ہوں۔ نمرہ جی نے یہ کیا کر دیا۔ شروع میں بہت اچھا تھا۔ آخر میں خراب کر دیا نمرہ جی! میں سچ کہوں گی مجھے اینڈ بالکل پسند نہیں آیا۔

مالا کے مرنے پر اتنا دکھ نہیں جتنا زارا کے بچ جانے پر ہوا، مالا کو مارنے میں زارا کا بڑا ہاتھ تھا زارا کا انجام دکھاتیں۔ زارا کی حقیقت کا پتا ملک فرید کو ہونا چاہیے۔

ج: پیاری عدینہ! مالا کو ختم ہوئے دو ماہ بیت چکے ہیں لیکن اس کے بارے میں ابھی تک خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ اکثریت نے اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔ رائے دینا آپ کا حق ہے۔ ہم آپ کی رائے نمرہ تک پہنچا رہے ہیں۔

شمائلہ بشیر...... میر پور خاص

سب سے پہلے اداریہ پڑھا، آپ کی بات ہمارے لیے سب سے قیمتی اور سر آنکھوں پر ہے۔ لیکن اداریے نے ہمیں اداس کر دیا۔

پھر صائمہ نور کے انٹرویو کا دوسرا حصہ تو پہلے سے بھی زیادہ اچھا تھا۔ کرکٹ اور سیاست کے معاملے میں ہمارے بھی یہی خیالات ہیں۔

جس شوق و لگن سے فرزانہ جی کو پڑھنا شروع کیا، سارا جھاگ کی مانند بیٹھ گیا جب بہت دیر گزرنے کے باوجود بھی مشکل سے دو صفحے پڑھنے میں کامیاب ہوئے، بھی بہت مشقت و وقت ہوئی پڑھتے ہوئے، کیونکہ پورا سال انتظار تھا ان کے ناول کا۔ اختتام تک آتے آتے محسوسات قائم تھے۔ اچھا لگا یا برا لگا؟ کہیں مشکل لگا۔ پھر پڑھی نشا محسن کی طوطا کہانی۔ تحریر رواں اور دلچسپ تھی۔

راشدہ جی کا ناول پہلے تو لگا جیسے پرانا ناول لگ گیا کیونکہ نام پچھلے ناول جیسا ہی تھا۔ روایتی سی کہانی آخر میں کھلے راز نے منفرد بنا دی۔ ہمیں اس کہانی کا پیغام پسند آیا۔ اب آتے ہیں افسانوں کی طرف۔ اے ٹی ایم، مصنفہ کا شاید پہلا افسانہ ہے اس لیے حوصلہ افزائی کی خاطر اگلے افسانے کے لیے نیک تمنائیں۔ اکبری اصغری چھوٹے ہونے ضروری کام سیکھنے کی اہمیت اجاگر کرتا اچھا افسانہ تھا۔ پناہ گزیں، عنوان پڑھ کے لگا تھا غزہ کی کہانی ہو گی لیکن یہ کہانی الگ ہی جو بالکل متاثر نہ کر سکی۔ جب ساری دنیا جانتی ہے تو بیوی اتنے برس تک کیسے بے خبر رہ گئی کہ شوہر لے پالک ہے؟ شام کی چائے نظیر فاطمہ نے اتنے اختصار میں ہی بڑے کام کی بات کی۔ یہ افسانہ اچھا تھا۔

ج: پیاری شمائلہ! آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ آپ نے پرچے کی سب تحریروں پر بہت تفصیلی اور اچھا تبصرہ کیا ہے۔ آپ کی تعریف اور تنقید مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

اقصیٰ شہزاد...... تلہ گنگ

دو وجوہات کی وجہ سے لکھ رہی ہوں۔ ام ہادیہ آپ کا دکھ میں سمجھ سکتی ہوں۔ ہم پہ ایسا کڑا وقت گزرا ہے۔ اللہ آپ کے بھائی کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین اور آپ کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین

دوسری وجہ "مالا" نمرہ احمد آپ نے مالا کو کیوں مارا۔ قارئین ابھی "اجالا" کی موت سے نہیں سنبھلی تھیں

digestlibrary.com

کہ آپ نے "مالا" کو مار دیا۔ ویسے ایک بات ہے آپ رائٹرز ہوتے بہت بے رحم ہیں۔ کسی کو بھی مار دیتے ہیں۔

آسیہ رئیس آپ کے ہاں میں تو کہانیوں کا بڑا ذخیرہ ہے۔ ایسے ایسے شاہکار لکھتی ہیں۔ اور ہوتی بھی مزے کی ہیں، خاص کر ہیرو...... مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔

ج: پیاری اقصیٰ! آپ کی تعریف اور تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ رائٹرز بے رحم نہیں ہوتے بہت حساس اور نرم دل ہوتے ہیں۔ ظالم دنیا ہے رائٹرز تو بس جو دیکھتے ہیں وہی لکھتے ہیں۔ بہت شکریہ

فرخندہ سلیم......ملتان

دسمبر کے خواتین کا سرورق بہت ہی پیارا تھا خاص کر ماڈل کا جوڑا تو خوب جچ رہا تھا۔ صائمہ نور سے دوسری قسط کی ملاقات بھی عمدہ رہی۔

سنیعہ عمیر کی کہانی تو جذبوں اور دشمنیوں کی ایسی داستان ہے کہ بندہ اس میں کھو جاتا ہے۔

سب سے زیادہ ہولناک صورتحال تو وہاں بنتی ہے جہاں درثمین اس پرانے کنویں کے پاس پہنچتی ہے جہاں لوگوں کا جانا بھی منع تھا۔ جب ارباز کے بڑے بھائی کو کنواں کھولنے کے جرم میں مٹی میں زندہ دھنسا دیا گیا تو دل جیسے رک سا گیا۔ حنا جاوید کی کہانی "سنبھل جاؤ" پڑھتے ہوئے سب سے زیادہ نازیہ کا کردار دل کو لگا۔ وہ ذہین اور تعلیم یافتہ تھی، لیکن اپنی ضد اور انا کے باعث زندگی میں کئی اہم رشتے سمجھنے میں لکیر کی فقیر بن گئی۔

چھوٹی سی برداشت اور سمجھداری کتنی بڑی قدر رکھتی ہے۔ رشتوں میں تھوڑی ہمت، تھوڑا صبر اور دوسروں کے جذبات کو سمجھنا کتنا ضروری ہے۔

"طوطا کہانی" کافی دلچسپ اور منفرد کہانی تھی مینا اپنے درد کو کسی کے ساتھ بانٹنے کی ہمت کبھی نہیں کرتی۔ جب بالم چلا جاتا ہے تو اس کا غم اور جذبات کی شدت قاری تک پہنچتی ہے۔

کافی دنوں بعد فرزانہ کھرل کو پڑھا اور ان کے مخصوص انداز کو پڑھنا اچھا لگا اور ایسا لگا جیسے ایک عرصے بعد کوئی جذبات کی دنیا میں چھپا راز سامنے لے آیا ہو۔ کہانی طویل ضرور تھی، مگر ہر منظر دلچسپ، تھوڑا سا تیکھا اور ہر جذباتی لمحہ معنی خیز تھا۔ بس یہی دعا کی جا سکتی ہے کہ فرزانہ کھرل جلد دوبارہ لکھیں، تاکہ ہم سب کو پھر سے اس جادو، جذبات اور دلچسپ کرداروں کے ساتھ لطف اٹھانے کا موقع ملے۔

فرزانہ صغیر کا افسانہ واقعی دل کو چھو گیا۔ کہانی میں جذبات کی شدت اور چھوٹے چھوٹے مناظر اتنے قدرتی لگتے ہیں کہ قاری خود کو کرداروں کے ساتھ جکڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔

حمیرا شفیع نے اپنے افسانے میں ساون کی یاد اور محبت کے رنگ بڑے حسین انداز میں دکھائے ہیں۔

عقیلہ ہاشمی کا افسانہ قناعت اور اعتدال کی یہ کہانی بہت سادہ اور ساتھ ہی اتنی اثر انگیز ہے۔

حمیرا رضا نے اپنے افسانے میں توہم پرستی کو بڑے دلچسپ انداز میں دکھایا۔

ساجدہ رمضان نے دل کے معاملات اور بہنوں کے حقوق واضح انداز میں پیش کیے۔ حنا کے افسانے میں کرداروں کی سادگی اور افسانے کی روانی قاری کے دل میں سبق اور لطف دونوں پیدا کرتی ہے۔

ج: پیاری فرخندہ! آپ کی تحریر دن بہ دن نکھرتی جا رہی ہے۔ تبصرہ اور خط تو ہمیشہ ہی اچھا ہوتا ہے۔ آج کل تو نظمیں بھی بہت اچھی لکھ رہی ہیں۔

عمارہ صفدر......نامعلوم شہر

فرحانہ مہناز کے "اے ٹی ایم" نے تو مجھے اپنے ساتھ ہوا واقعہ یاد دلا دیا کہ خیر سے میں نے بھی اے ٹی ایم مشین کے اندر اپنا کارڈ گرا دیا تھا اور پھر ہفتے اتوار کی چھٹی آ گئی تھی اور سوموار کو جا کے مجھے کارڈ واپس ملا تھا۔

اس کے علاوہ نظیر فاطمہ کا افسانہ "شام کی چائے" ایسی بھی ساسیں ہیں کیا جو بہوؤں کو ایک کپ چائے نہ پینے دیں، ادھر میں اپنی امی ساس کا ذکر کروں گی کہ مجھے بھی چائے انتہا کی پسند ہے اور وہ مخصوص وقت کے علاوہ بھی جب چائے بنائیں تو مجھے ضرور دیتی ہیں، حمیرا شفیع کی اصغری اکبری بھی دلچسپ تھی "پناہ گزین" پتا نہیں لوگ کیوں اس بچے کو چھوڑ دیتے ہیں جس کے آنے سے ان کا خالی گھر اور گود بھر گئی تھی۔

"طوطا کہانی" میں یہاں نانی کا رویہ اور ٹیٹو کی موت رنجیدہ کر گئی وہیں بالم جیسے دوست اور اتنے پیارے

انجام نے خوش گوار تاثر چھوڑا۔

اس کے علاوہ راشدہ رفعت کے مکمل ناول "محبت معتبر ٹھیری" میں شہرینہ کی ماں اور خالہ کا کردار حقیقت کے قریب تھا۔

فرزانہ کھرل کا ناول مجھے اتنا پسند نہیں آیا (معذرت) "سنبھل جاؤ" کا پیغام اچھا تھا لڑکیوں واقعی سنبھل جاؤ کیونکہ جب زندگی الجھ گئی تو پھر سنبھلنا چاہو گی بھی تو نہ سنبھل پاؤ گی اور سب سے آخر میں "کر چلے جاں نثار ہم" بہت عمدگی سے اختتام کی جانب گامزن ہے اس ناول کو پڑھتے ہوئے کہیں کمی محسوس نہیں ہوتی۔ باقی خواتین کے سارے سلسلے ہی بہت اچھے تھے۔

ج: عمارہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ باسی سالن اس ماہ شامل اشاعت ہے۔

عائشہ عامر...... کراچی

اس ماہ چاند بہن نے دیسی گھی بنانے کی ترکیب پوچھی تھی تو یہ ترکیب مما سے پوچھ کر لکھ رہی ہوں بہنوں کی خدمت میں ترکیب حاضر ہے۔

دیسی گھی بنانے کا آسان طریقہ:

فریزر میں سے جمی ہوئی ملائی کو نکالیں اور اسے نارمل ٹمپریچر پر پگھلنے کے لیے رکھ دیں ملائی پگھل جائے تو اسے کسی موٹے پیندے کے برتن میں ڈال کر ہلکی آنچ پر رکھ دیں اور مسلسل چمچہ ہلاتے رہیں آہستہ آہستہ دودھ سوکھتا جائے گا اور گھی الگ ہوتا جائے گا جب وہ ملائی بالکل خشک ہو کر لائٹ براؤن کلر میں آجائے گی تو سارا گھی الگ ہو چکا ہوگا۔ چولہا بند کر کے اسے نیم گرم ہونے دیں پھر ملائی چھان کر گھی کو الگ کر دیں، زبردست دیسی گھی تیار ہے۔

اب آتے ہیں تبصرے کی طرف نمرہ احمد کا "مجھے کہنا ہے" پڑھا جو وہ کہنا چاہتی تھیں، وہ تو ہم پہلے ہی سمجھ چکے تھے "کر چلے جاں نثار ہم" اگلے ماہ آخری قسط ہے، آخری قسط کا شدت سے انتظار ہے، حمیرا شفیع کا اکبری اصغری ہلکا پھلکا اچھا افسانہ تھا۔ محبت معتبر ٹھیری اچھی تحریر تھی لیکن کچھ اتنی خاص نہیں تھی "طوطا کہانی" اچھی تحریر تھی پر کچھ ادھوری تھی بالم ویسے کون تھا؟ منال کے اس کے طوطے کے ساتھ سین اچھے لگے۔

ج: پیاری عائشہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ثروت جمال...... منڈی یزمان

دسمبر مجھے شروع سے ہی اچھا لگتا تھا اب کے برس والے دسمبر نے پاتال میں لا پٹخا۔ 7 دسمبر کی تاریک، گہری شام کی یخ بستہ ہوا کے تھپیڑوں کی نذر جمال ہاؤس کی سب سے بڑی بیٹی لپیٹ میں آگئی۔ 30 سالہ نام نہاد رشتہ کا بھیانک انجام ہو گیا۔ گڈی آپا نہایت صابر خاتون واقع ہوئی ہیں۔ خشک ویران آنکھیں، جامد ہونٹ سرد ہوا کے تھپیڑوں سے بے نیاز ہوش و خرد سے بیگانہ، چولہے سے باہر نکلی ٹھنڈی راکھ میں تنکے سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچتی رہیں۔ پورے گھر میں عجیب ہولناکی کا منظر تھا۔ بیٹی زوباریہ متعدد بار غش کھا کر گری۔ آپا شاہانہ کی گود میں سر دھرے ہچکیوں کی زد میں تھی۔ بار بار کہتی۔

"کاش میں صادق آباد نہ جاتی۔"

"ہونی کو کون ٹال سکتا ہے" آپا شاہانہ تھپکیوں سے دلاسے دیتی رہیں۔ آپا نے ان گزرتے سالوں میں بھی اپنے حق حقوق کے لیے آواز نہ اٹھائی۔ شاید ابھی کتنا عرصہ اسی دھوکے میں رہتیں اگر زوباریہ کا شناختی کارڈ ایکسپائر نہ ہوتا۔ دونوں ماں بیٹی نادرا آفس کارڈ ریلیس کروانے گئیں تو آگے سے نمائندہ نے بم پھوڑا۔

"مسرت تسیم کا کارڈ بلاک ہے۔ اس لیے آپ کے فنگر پرنٹس نہیں لگ رہے۔ آپ کا شناختی کارڈ بلاک ہے اس بابت آپ اپنے شوہر حفیظ احمد سے رابطہ کریں۔ کال پہ موصوف حفیظ احمد کوئی پلہ نہ پکڑا رہے تو زوباریہ نے بیٹے سے بات کی۔"

"باجی! آپ صادق آباد آجائیں میں ابو سے باز پرس کرتا ہوں انہوں نے ایسی گھٹیا حرکت کیوں کی۔" بسوں کے دھکوں سے بچنے کے لیے گاڑی رینٹ پر لے کر زوباریہ کو صادق آباد چھوڑنے روانہ ہو گئے۔

گڈی آپا کی سوتن نے ہونق سی شکل بنا کر ہمارا استقبال کیا۔ پندرہ ہزار رینٹ بھر کر دو گھنٹے بعد وہاں سے زوباریہ کو اس کے باپ کے گھر چھوڑ کر ہم واپس رات تک پہنچ گئے۔ یہ سارا ڈراما بہنوئی صاحب نے آپا کو جائیداد

digestlibrary.com

میں حصہ نہ دینے کے باعث کیا۔ خاندانی نمبر سے ڈیٹا بلاک کر کے ہر چیز سے برطرف کر دیا۔ بیٹوں نے سخت ردعمل کا مظاہرہ کیا اور بڑی بہن زوہاریہ کی حمایت کی۔ نادرا والوں نے خوب باز پرس کی اور شناختی کارڈز دوبارہ اوپن کروانے کی مد میں دو تجویزیں دیں۔ یا تو اپنی بیوی کو قبول کرو یا لاتعلقی۔ موصوف نے فوراً لاتعلقی کا عندیہ دیتے ہوئے طلاق کے پیپرز تیار کروالیے۔

میں نے اس بنجر زمین کا کیا کرنا جس نے مجھے صرف ایک بیٹی سے نوازا، پاؤں کی زنجیر، میں بیٹوں کا خواہش مند تھا جو مجھے صفیہ خانم نے دیے اور میرا سر فخر سے بلند ہے۔"

باپ کے ان زہر آلود الفاظ سے زوہاریہ ڈھے گئی۔ میری ماں نے طلاق سے بچنے کی خاطر تیس برس گزار دیے۔ آج زندگی اسی مقام پر لے آئی۔

پندرہ دن کے قیام کے بعد شناختی کارڈ کا مسئلہ جوں کا توں رہا اور حفیظ احمد نے طلاق کا لفافہ بیٹی کے ہاتھ میں تھما کر وہاں سے چلتا کیا۔ یہ سب آپ جیسی ہمدرد بہنوں سے دل کا حال بانٹنا ہے نہ کہ اس مسئلے کا حل۔ اگر حل چاہیے ہوتا تو عدنان بھیا سے رجوع کرنا تھا۔ بس اس وقت ہمیں ہمت اور دلاسے کی ضرورت ہے۔ دسمبر کا پرچہ کب آیا کچھ خبر نہیں کسی میں پڑھنے کی سکت نہیں ہے۔

ج: کوثی جی!! اتنا دکھ کیوں؟ یہ نام نہاد رشتہ آپ کی بہن کو کیا دے رہا تھا جو اس کے ٹوٹنے پر غم کیا جائے سچ کہیں تو یہ کام پہلے ہو جاتا تو اچھا تھا۔ آپ کی بہن کی بھی کسی اچھی جگہ شادی ہو جاتی۔ آپ کی بہن میں بھلا کس چیز کی کمی ہے۔ اپنی بھانجی کی تعلیم و تربیت پر توجہ دیں اور کوشش کریں کہ بہن کا رشتہ کسی مناسب جگہ ہو جائے۔ آپ کی صابر اور محنتی بہن کو اس وقت زبانی ہمدردی کے ساتھ ساتھ عملی ہمدردی اور مدد کی بھی ضرورت ہے۔

شمائلہ بشیر...... میر پور خاص

پچھلے بیس سال سے آپ کے ڈائجسٹ کی خاموش قاری ہوں۔ آپ کے ادارے بہترین کام کر رہے ہیں۔ مجھے آپ کے شماروں سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میرا تعلق ایک پسماندہ علاقے سے ہے۔ میں زیادہ پڑھی لکھی بھی نہیں ہوں مگر آپ کے ڈائجسٹ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

زندگی گزارنے کا طریقہ، اونچ نیچ سمجھنے کا شعور اور اپنے آس پاس لوگوں کے رویے سمجھنے اور پرکھنے میں مجھے آپ کی ڈائجسٹ نے طاق کر دیا ہے۔ میں آپ کی اور تمام پیاری مصنفین کی شکر گزار ہوں جو کہانیوں کے ذریعے ہمیں آگاہی اور شعور دیتی ہیں۔ نئی ہوں یا پرانی سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔

ڈائجسٹ کے سب ہی سلسلے شوق سے پڑھتی ہوں۔ صائمہ نور کا انٹرویو بھی بہت پسند آیا۔ شاہین باجی بہت عمدگی سے مفصل انٹرویو لیتی ہیں۔ ایک اور گزارش ہے کہ رائٹر کی پسند ناپسند بھی تفصیل سے پوچھا کریں جیسے پسندیدہ رنگ، کھانے، لباس، اور دوسری چیزیں۔

میں نے پچھلے ماہ آسیہ رئیس کی کہانی پڑھی وہ جو لفظوں کے درمیان ہے، کیا عمدہ کہانی تھی۔ ایسا رویہ تو میں نے اپنے اردگرد بہت دیکھا ہے یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ تو باقاعدہ ایک پروگرام ہوتا ہے لوگوں کو تنگ کرنے کا جس کے نام بھی ہوتے ہیں۔ آسیہ رئیس خان ویلڈن آپ کے قلم میں جادو ہے۔

ثمین صداقت نے بہت خوب صورت تروتازہ سا ناول لکھا۔ کیان کا نام ہی نہیں کردار بھی بہت اعلا تھا۔

سعیہ عمیر کا ناول بھی اچھا جا رہا ہے۔

میں خط لکھنے والی، بہنوں کے خط بہت شوق سے پڑھتی ہوں سب ہی وقت نکال کر محبت سے نامے بھیجتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے اپنوں کی محفل سجی ہو۔

افسانے بھی تمام ہی اچھے تھے۔ خاص طور پر حمیرا شفیع بہت اچھا لکھتی ہیں۔

ج: پیاری شمائلہ! ہمیں آپ کا خط اور باتیں دونوں ہی بہت اچھی لگی ہیں، آپ ہمیں باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔ اگلا ناول حسنیٰ حسین کا ہوگا۔ سعیہ عمیر کا ناول بھی ہو سکتا ہے قارئین نے ان سے مزید ناول لکھنے کی فرمائش کی ہے۔

شمائلہ آپ جیسی قارئین کسی بھی پرچے کی خوش بختی ہوتی ہیں اتنے طویل عرصہ کا ساتھ مستقل مزاجی سے نبھانا

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ
بسا ہا دل	آمنہ ریاض
دردموسم	راحت جبیں
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان
شہر دل کے دروازے	شازیہ چودھری
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چودھری
دل ایک شہر جنوں	آسیہ مرزا
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار
بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار
پھلاں دے رنگ کالے	فائزہ افتخار
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار
مَیں سے عورت	غزالہ عزیز
دل اُسے ڈھونڈ لایا	آسیہ رزاقی
بکھرنا جائیں خواب	آسیہ رزاقی
زخم کو ضد تھی مسیحائی سے	فوزیہ یاسمین
ملاوس کا چاند	بشریٰ سعید
رنگ خوشبو ہوا اور دل	افشاں آفریدی
درد کے فاصلے	رفیعہ جمیل
آج صحن پر چاند نہیں	رفیعہ جمیل
درد کی منزل	رفیعہ جمیل
میرے دل میرے مسافر	تنیم سحر قریشی
تیری راہ میں رُل گئی	میمونہ خورشید علی
شام آرزو	ایم سلطانہ فخر

آسان بات تو نہیں ہے۔

نصرت جبیں ملک ..... خوشاب

خواتین ڈائجسٹ تھوڑا لیٹ ملا مگر کافی زیادہ جاندار تحریریں لیے ہوئے تھا، صائمہ نور سے ملاقات اچھی رہی مگر اس بات پر حیرت ہوئی کہ انہیں روزمرہ کے ایک سے معمولات والی زندگی پسند ہے اور روٹین سے ہٹ کر کام انہیں پسند نہیں مگر صائمہ تنوع کی گنجائش تو ہمیشہ رہتی ہے۔

میری روٹین لائف بہت ٹف ہے مثلاً اسکول، بچے ،گھر کی ذمہ داری اور بچوں کی اسٹڈی مگر پھر بھی میں سب کی خوشی اور غم میں پورے طور پر شامل ہونے کی کوشش کرتی ہوں۔ کام کاج میں تعاون کرتی ہوں روٹھوں کو مناتی ہوں ساتھ دعائیں لیتی ہوں اور یقین کیجئے یہ عوامل میری توانائی بڑھانے کا سبب بنتے ہیں۔

اب آتی ہوں تحریروں کی طرف تو مکمل ناول ”فرض کرو ہم اہل وفا ہوں“ میں ثمین صداقت پہاڑوں کے درمیان بل کھاتی سڑک کی طرح صلہ اور کیان کی محبت کو کئی موڑ دینے کے بعد ملانے میں کامیاب رہیں۔ وقت کا ذائقہ بے شک چکھنا پڑتا ہے مگر جتنی مرتبہ اس افسانے میں شوربے والے سالن کے الفاظ آئے ہیں تو اگر یہی نام ہوتا تو بھی کوئی مضائقہ نہ تھا۔

”آدھی عورت“ اقصیٰ عائش کا افسانہ اگر بزرگوں کو پڑھایا جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔

”آنگن کی چڑیا“ میں مختصر الفاظ میں گندھی کہانی میں ایک بہت بڑا میسج تھا ان بچیوں کے لیے جن کے قدم کبھی منفی راہوں کی سمت ڈگمگا جاتے ہیں۔ باقی شمارہ بھی مزے دار تھا۔

ج: پیاری نصرت! اللہ تعالیٰ نے جس طرح شکل اور عقل کے لحاظ سے ہر انسان کو مختلف بنایا ہے۔ اسی طرح مزاج، ذوق، پسند، ناپسند بھی مختلف بنائی ہے۔ اسی سے دنیا کی رنگا رنگی قائم ہے۔ یہ خوبی کی بات ہے کہ آپ دنیا داری کے تقاضوں کو سمجھتی ہیں اور انہیں خوش دلی سے نباہتی ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

☆☆

موسم کے پکوان

واصفہ سہیل

لاہوری توا چکن

ضروری اشیاء:

چکن	ایک کلو
لال مرچیں	ایک کھانے کا چمچہ
پسا ہوا گرم مسالہ	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
میتھی دانہ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
دہی	ایک کپ
مسٹرڈ پیسٹ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
ہری مرچیں	چار سے پانچ عدد
لیموں	دو عدد
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

پیالے میں دہی، مسٹرڈ پیسٹ اور پسی ہوئی کالی مرچ ڈال کر مکس کرلیں۔

توے پر تیل گرم کرکے چکن ڈال کر ہلکا سا فرائی کریں اور دہی کا آمیزہ ڈال کر دو تین منٹ پکائیں۔

اب کٹی ہوئی لال مرچیں، پسا ہوا گرم مسالہ، نمک، ہلدی، میتھی دانہ، ہری مرچیں، ہرا دھنیا اور لیموں کے سلائس ڈال دیں۔

درمیانی آنچ پر ڈھک کر پندرہ سے بیس منٹ پکائیں اچھی طرح بھون کر پانچ منٹ مزید دم پر رکھیں۔

سرونگ ڈش میں نکال کر پراٹھوں کے ساتھ پیش کریں۔

خوبانی کا میٹھا

ضروری اشیاء:

خوبانی	ایک کلو
شکر	ایک پاؤ
کریم/ملائی	ایک کپ
آئسنگ شوگر	ایک کپ
ونیلا ایسنس	دو سے تین قطرے

ترکیب:

ملائی کو خوب پھینٹ کر فریج میں رکھ لیں۔

خوبانی کو پانی میں ڈال کر دو سے تین گھنٹوں تک بھیگنے کے لیے رکھ دیں۔ پانی اتنا ڈالیں کہ خوبانیاں اچھی طرح سے اس میں بھیگ سکیں۔ دیگچی میں خوبانی پانی سمیت ڈال کر درمیانی آنچ پر خوبانی کے نرم ہوجانے تک پکائیں۔ اس کے بعد پانی نتھار کر خوبانیوں کو الگ رکھ لیں۔ خوبانیوں میں سے بیج نکال کر گودے کو اچھی طرح مسل لیں۔

کسی برتن میں خوبانی کے گودے کو ڈال کر درمیانی آنچ پر پکائیں اور اس میں ابال آجانے کے بعد اس میں شکر ڈال کر مسلسل چمچہ چلاتی جائیں۔

خوب گاڑھا ہوجانے تک اس میں چمچہ چلاتی جائیں اور جب یہ گاڑھا ہوجائے تو برتن کو چولہے سے ہٹالیں۔

ٹھنڈی کی ہوئی کریم میں آئسنگ شوگر ملا کر دوبارہ پھینٹیں اور اسے پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر فریج میں رکھ دیں۔ خوبانی کے بیجوں کو توڑ کر ان سے بادام نکال لیں اور اسے ایک طرف رکھ دیں۔

سرونگ باؤل میں تیار کی ہوئی خوبانی آمیزہ ڈالیں اور اس کے اوپر پھینٹی ہوئی کریم ڈال کر چوپ کیے ہوئے بادام سے گارنش کریں۔ مزے دار خوبانی کا میٹھا تیار ہے، خوب ٹھنڈا کرکے سرو کریں۔ (آئسنگ شوگر نہ ہو تو چینی پیس لیں۔)

☆☆

digestlibrary.com

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

عائشہ...... شیخوپورہ

میری عمر بیس سال ہے۔ اتنی کم عمری میں مجھے اتنے دکھ ملیں گے میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ میں جب سولہ سال کی تھی تو مجھے ایک "ع" نامی لڑکے سے محبت ہوگئی۔ وہ بھی مجھے بہت پیار کرتا ہے۔ وہ مجھ سے آٹھ ماہ چھوٹا ہے۔ ہم فون پر باتیں کرتے تھے اور کبھی کبھی مل بھی لیا کرتے تھے۔ اتنی کم عمری کی محبت کی وجہ سے وہ بیمار رہنے لگا۔ تو میں نے اسے رشتہ لانے کو کہا۔ اس کے گھر والے تین دفعہ میرے گھر رشتہ لے کر آئے۔ مگر میرے ابو نے انکار کر دیا اور کہا کہ میری بیٹی کا رشتہ بچپن سے ہی میرے بھتیجے کے ساتھ ہو چکا ہے۔ میں نے آپ کے گھر اپنی بیٹی نہیں دینی۔ پھر میں نے ابو سے کہا کہ میں نے اگر شادی کرنی ہے تو صرف ع سے ہی کروں گی۔ مگر میرے گھر والے مجھے میرے کزن کے ساتھ بیاہ دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ کزن نے خود کہا ہے کہ اگر تم دونوں محبت کرتے ہو تو میں پیچھے ہٹنے کو تیار ہوں۔ مگر میرے گھر والے راضی نہیں ہوتے۔ پھر ع بھی بیمار رہتا ہے۔ اس نے قسم کھائی ہے کہ وہ صرف مجھ سے ہی شادی کرے گا ورنہ یوں ہی ختم ہو جائے گا۔ میں بہت پریشان ہوں۔ اللہ کا واسطہ مجھے آسان حل بتا دیں۔ ورنہ ع ختم ہو جائے گا۔ میں اور ع پورے چھ سالوں سے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ پھر چھ سالوں کی محبت کو میں کیسے بھلا دوں۔ میرے ابو اس لیے نہیں راضی ہو رہے کہ ایک تو وہ غیر ہے اور دوسرا یہ ہے کہ اس کے دو بھائی نشہ کرتے ہیں اور آوارہ ہیں۔ ابو کو لگتا ہے کہ اگر اس کے بھائی ایسے ہیں تو پھر یہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ مگر ع اپنے بھائیوں سے بہت الگ ہے۔ مگر یہ بات میرے باپ کو کون سمجھائے۔

ج۔ عزیز بہن! آپ ذرا ایک لمحے کے لیے سوچیں آپ کیا کرنے جا رہی ہیں۔ سولہ سال کی عمر میں محبت ہوگئی اور اب بیس سال کی عمر میں آپ اس لڑکے سے شادی کر رہی ہیں۔

آپ کے ابو سمجھ دار ہیں۔ انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ جس گھر میں دو لڑکے نشئی اور آوارہ ہوں۔ اس گھر کا ماحول کیسا ہوگا۔ آپ جس سے محبت کرتی ہیں ہو سکتا ہے وہ اپنے بھائیوں سے مختلف ہو لیکن یہ رسک کوئی بھی باپ نہیں لے سکتا۔ لڑکا آپ سے آٹھ ماہ چھوٹا ہے۔ ابھی اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہے۔ دو بھائی کوئی کام نہیں کرتے نشئی اور آوارہ ہیں۔ کیا ع کے گھر والے دو بڑے بھائیوں کو چھوڑ کر تیسرے بیٹے کی شادی کر سکتے ہیں؟

محبت میں کوئی بیمار نہیں پڑتا۔ آپ نے اس لڑکے کی بیماری کی وجہ بتائی ہے۔ وہ صرف اس کے کردار کی کمزوری ہے۔ جس پر وہ قابو نہیں پا سکتا۔ آپ نے لکھا ہے کہ آپ کو کم عمری میں اتنے دکھ ملے ہیں جو آپ نے سوچے بھی نہ تھے لیکن آپ کو ع سے شادی کے بعد جو دکھ ملیں گے۔ ان کا اندازہ بھی نہیں ہے۔ یہ سیدھا سیدھا کنوئیں میں چھلانگ لگانا ہے۔

آپ کے والد بالکل ٹھیک فیصلہ کر رہے ہیں آپ اپنی زندگی کا فیصلہ ان پر چھوڑ دیں۔

مسز الف۔ ر

میں ایک دین دار خاتون ہوں۔ نماز روزے کی پابند، اپنے بچوں کو بھی تلقین کرتی رہتی ہوں۔ کچھ

عرصہ قبل بیٹی کی شادی کی، اس کی سسرال شہر میں تھی ان لوگوں کو ہمارے گاؤں آتے وقت دقت ہوتی ہے۔ظاہر ہے آفس جانے والے لوگ اور وقت کی کمی کیونکہ ہمارے یہاں بس اڈے ہیں اور بسیں وقت پر نہیں چلتیں سفر میں اچھا خاصا وقت برباد ہوتا تھا تو ہم نے سوچا کہ کیوں نہ شہر میں ہی ان کے نزدیک گھر لے لیا جائے۔

تھوڑی سی بھاگ دوڑ کے بعد ایک کرائے کا مناسب گھر مل گیا اور ہم نے خیر خیریت سے بیٹی کی شادی کردی۔ ہمارے بیٹوں اور شوہر کو بھی یہاں آسانی نظر آئی اور بیٹی کی وجہ سے میرا بھی دل لگا رہتا تھا لیکن گاؤں میں بھی سب کچھ وہیں رہ گیا تھا۔ بچے خواہش مند تھے اور میں جانتی تھی کہ میاں جی کو کرائے کے گھر میں الجھن محسوس ہوتی ہے، پھر پتا چلا کہ یہ لوگ اسی علاقے میں اپنے گھر کی پلاننگ کررہے ہیں اور سچ پوچھیے تو مجھے بڑا اچھا لگا کہ اپنا گھر اپنی زمین میں ہی راحت ہوتی ہے۔

سب کچھ ٹھیک ہی رہتا کہ مجھے کچھ سامان لینے گاؤں جانا پڑا اور میں وہاں جاکر دنگ رہ گئی کہ میری نند صاحبہ جو راولپنڈی میں رہائش پذیر تھیں، میرے گھر میں موجود تھیں۔ حالانکہ ان کی اپنی سسرال بھی ہمارے گھر کے قریب ہی تھی لیکن انہوں نے میرے شوہر کی سادگی اور خاموش رہنے کی عادت کا خوب فائدہ اٹھایا۔

ان کا کہنا تھا کہ جب اپنا گھر موجود ہے تو میں سسرال کیوں جاؤں، دراصل وہ بھی گاؤں کا چکر لگاتی رہتی تھیں تو مجبوراً انہیں سسرال جانا پڑ جاتا تھا۔ میرے شہر جانے پر انہوں نے میاں جی سے براہ راست رابطہ کیا اور اجازت لے کر ڈیرا بھی جمالیا۔

میری جو حالت ہوئی میں ہی جانتی ہوں۔

میں نے میاں جی سے پوچھا تو بس ہوں ہاں کرکے رہ گئے۔ ان کے مطابق اس نے کون سا گھر پر قبضہ کرلیا ہے۔ بات قبضے کی نہیں میری جوانی کی، میرے بچوں کی یادوں سے ہے۔ میں یہ کیسے برداشت کروں کہ میری نند میرے گھر پر جو میرا آشیانہ تھا۔ اپنی مرضی سے آ کر رہے۔ چھٹیاں گزارے اور اپنے سسرال والوں پر رعب کہ میں تو تمہارے گھر رہنا بھی پسند نہیں کرتی۔

بس دل میں خیال رہتا ہے، بہت دعائیں کرتی ہوں پر دل میں بے قراری ہی ہے۔

ج۔ عزیز بہن! گھر کہیں نہیں جاتا۔ نہ ہی آپ کی جوانی اور بچوں کی یادوں کو کوئی خطرہ لاحق ہے۔ آپ شہر میں رہتی ہیں۔ آپ کا گھر خالی تھا اگر آپ کی نند نے کچھ دنوں کے لیے وہاں قیام کرلیا تو کیا حرج ہے۔ وہ ان کے بھائی کا گھر ہے۔ شادی کے بعد بہنوں کا بھائیوں پر حق ختم نہیں ہوجاتا۔

بقول آپ کے آپ ایک دین دار خاتون ہیں۔ نماز روزے کی پابند ہیں۔ تو اپنے شوہر کی بہن کے ساتھ اتنی سی رواداری بھی نہیں برت سکتیں۔ آپ کو علم ہوگا کہ صلہ رحمی کی ہمارے مذہب میں کتنی تاکید ہے اور قطع رحمی کتنا بڑا گناہ ہے۔ وہ آپ کا گھر، آپ کی یادیں کہیں سر پر اٹھا کر نہیں لے جارہیں۔

آپ کا دل اتنا تنگ ہے کہ آپ کا گھر جو خالی پڑا ہے وہاں آپ کی نند نے کچھ دن وہاں قیام کرلیا تو آپ سے برداشت نہیں ہو پارہا۔ آپ کی حالت خراب ہوگئی۔

آپ کے شوہر نے آپ کو بتائے بغیر فیصلہ کرلیا۔ یہ بات تکلیف دہ ضرور ہے لیکن وہ آپ کی تنگ دلی سے واقف تھے۔ اس لیے انہوں نے آپ کو نہیں بتایا۔ بہتر یہ ہے کہ آپ اپنے دل میں وسعت پیدا کریں۔ اس طرح آپ اپنے شوہر کا اعتماد بھی حاصل کرسکیں گی۔

☆☆

خوبصورت بنیے

آزمودہ

فروا کمال...... حیدر آباد

س: میری جلد نارمل ہے، میری شادی فروری میں ہو رہی ہے، مجھے اپنے ہاتھوں پیروں پر ویکسنگ کرانی ہے سنا ہے کہ اس سے الرجی وغیرہ ہو جاتی ہے، خارش ہو جاتی ہے۔ مجھے کوئی گھریلو ٹوٹکا بتائیں کہ میرے ساتھ مسائل نہ ہوں۔

ج۔ سردیوں میں پہلی بار ویکسنگ کرانے کے لیے ضروری ہے کہ ایک دو روز پہلے باقاعدہ موئسچرائزر لگائیں تاکہ جلد خشک نہ ہو لیکن تیل یا کوئی لوشن نہ لگائیں، ویکسنگ سے پہلے گرم پانی سے ہاتھ پاؤں دھوئیں تاکہ بال نرم ہوں اور نیم گرم ویکس استعمال کریں، ایک ہی جھٹکے میں ویکس اتاریں آہستہ کھینچنے سے درد زیادہ ہوتا ہے۔ ویکسنگ کے بعد ایلوویرا جیل یا کوئی ٹھنڈک پہنچانے والا لوشن لگائیں۔

سلمہ ستار...... کراچی

میری عمر بتیس سال ہے، گھر میں پانی کے مسائل کے باعث برتن خود ہی دھونے پڑتے ہیں۔ میرے ہاتھ پہلے کے مقابلے میں روکھے سے ہو رہے ہیں۔ میں کیا کروں؟

ج۔ باورچی خانے کے کام کرنے خاص کر برتن دھونے سے ہاتھوں پر فرق پڑتا ہے۔ صابن اور لیکوئڈ کتنے ہی بڑے برانڈ کے ہوں اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر برتن دھوتے ربر کے دستانے پہن لیں تو محفوظ رہیں گے ورنہ کام ختم کرنے کے بعد یکساں مقدار میں شہد اور چینی لے کر ہاتھوں کا مساج کریں اس سے مردہ خلیات جھڑتے ہیں اور ہاتھ صحت مند نظر آئیں گے، اس کے بعد ہاتھ دھو کر ہینڈ لوشن لگالیں۔ اس کے علاوہ ہفتہ میں ایک بار زیتون کے تیل کو گرم کریں اور رات سونے سے قبل مساج کریں۔ چند روز میں ہی بہترین نتائج سامنے آئیں گے۔

مہوش...... ناظم آباد

میری عمر تیس سال ہے سردیوں میں میرے بالوں میں خشکی ہو جاتی ہے جس سے مجھے بہت الجھن ہوتی ہے دوسرے میرے بال بہت بے رونق ہیں۔ کوئی آسان سا ٹوٹکا بتائیں میں کیا کروں؟

ج۔ سردیوں میں خشک موسم کے باعث کچھ لوگوں کے سکری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے آپ سرسوں یا جو تیل آپ عموماً استعمال کرتی ہیں اسے نیم گرم کریں اور استعمال سے قبل لیموں کا عرق بھی تھوڑا سا ملائیں آپ براہ راست لیموں کا عرق بھی بالوں کی جڑوں میں لگانے کے بعد نیم گرم تیل سے سر میں مساج کرسکتی ہیں۔ بالوں کو ہفتہ میں دو بار سے زیادہ نہ دھوئیں۔

بالوں کی رونق بحال کرنے کے لیے ایک آسان سا ٹوٹکا ہے۔

اس کے لیے آپ دو کپ پانی ابالیں اور اس میں ڈیڑھ چمچہ کالی چائے ڈالیں اور پانچ سے چھ منٹ تک ہلکی آنچ پر پکنے دیں، ٹھنڈا ہونے پر چھان لیں چند قطرے ناریل کا تیل بھی شامل کرلیں۔ بال شیمپو کرنے کے بعد آخر میں بالوں پر ڈالیں یا روئی کی مدد سے جڑوں پر لگائیں کچھ دیر جذب ہونے دیں۔ پھر سادے پانی سے دھولیں۔

ہفتے میں دو سے ایک بار کافی ہے۔ سنہرے یا ڈائی بالوں کے لیے کالی چائے کم استعمال کریں۔

☆☆

digestlibrary.com